تاریخی مشاہدات و واقعات

قائداعظمؒ کے سیکرٹری

کے ایچ خورشید

کی یادداشتوں سے ماخوذ

مرتب : ثریا خورشید

How did luck smile on K.H. Khurshid?

How luck elevated a free lancer young graduate to become Quaid-i-Azam's Private Secretary is described by the lucky man himself thus:

"I will never forget the day he asked me to become his "Private Secretary". It was 26th June 1944. I was shown in. Mr. Jinnah, received me with his usual smiling face and crisp "Good Morning". I took a chair close to him, and, after saying a few words about how well he looked, began, "Sir, we have some very sad news this morning". ...."I don't believe it." "My dear fellow"....Mr. Jinnah sent for his secretary, LOBO and dictated a message on the death of Nawab Bahadur Yar Jung to him. While Lobo was out of the room, Mr. Jinnah asked me if I would join him as his Private Secretary. Should I say I couldn't believe my ears?" Mr. Jinnah advised me not to decide in a hurry, to think over the matter again and to be very frank with him. He said there were many well qualified persons who had approached him, many students, many young men with degrees from various universities, but he did not think degrees and capabilities necessarily went together. He himself had taken no degree....Mr. Jinnah had used that occasion to tell me that my consistency and perseverance were"laudable", referring to my efforts to secure a statement from him.

تاریخی مشاہدات و واقعات

قائداعظمؒ کے سیکرٹری

کے ایچ خورشید

کی یادداشتوں سے ماخوذ

مرتّب

ثریا خورشید

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

کتاب	:	تاریخی مشاہدات و واقعات قائداعظمؒ کے سیکرٹری، کے ایچ خورشید کی یادداشتوں سے ماخوذ
مؤلف	:	کے ایچ خورشید
مرتبہ	:	ثریا خورشید
ناشر	:	نظریۂ پاکستان ٹرسٹ
مطبع	:	نظریۂ پاکستان پرنٹرز، لاہور
مہتمم اشاعت	:	رفاقت ریاض
سرِورق	:	محمد شہزاد یٰسین
اشاعت دوم	:	جون 2009ء
تعداد اشاعت	:	1000
قیمت	:	400 روپے

Published by

Nazaria-i-Pakistan Trust

Aiwan-e-Karkunan-e-Tehreek-e-Pakistan, Madar-i-Millat Park,
Shahrah-i-Quaid-i-Azam, Lahore. Ph. 99201213-99201214 Fax. 99202930
E-mail: trust@nazariapak.info Web:www.nazariapak.info

Printed at: Nazaria-i-Pakistan Printers,
10-Multan Road, Lahore. Ph: 37466975

ابتدائی کلمات

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کی غرض و غایت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے مقاصد اور اس کیلئے دی جانے والی قربانیوں کو اُجاگر کیا جائے' نظریۂ پاکستان کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اہلِ وطن بالخصوص نئی نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس اور عظیم تاریخی و تہذیبی ورثے سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ نے وطن عزیز کی نئی نسل کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنایا ہے کیونکہ ہماری نسلِ نو ہی ہمارے ملک و قوم کا مستقبل ہے اور ان کے فکر و عمل کو علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے افکار و کردار کے سانچے میں ڈھال کر ہی ہم اپنے مستقبل کو زیادہ روشن اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ ایک ہمہ جہت پروگرام پر عمل پیرا ہے جس میں مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ ان مطبوعات کے ذریعے ہم نئی نسل کو نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور مشاہیر تحریک پاکستان کے افکار و تصورات کے بارے میں نہایت سادہ زبان میں آگہی فراہم کر رہے ہیں اور ان میں اپنے ملک و قوم کے حوالے سے احساسِ تفاخر پیدا کر رہے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں اپنی قومی ذمہ داریوں سے زیادہ احسن انداز میں عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظمؒ کی بے لوث اور عہد ساز قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بیش بہا قربانیاں پیش کر کے اگرچہ پاکستان تو

حاصل کر لیا مگر ہم اسے قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کے مطابق اسلامی نظریۂ حیات کا قابلِ تقلید نمونہ نہیں بنا سکے۔ بانیٔ پاکستان کے وصال کے بعد قوم کے نام نہاد قائدین نے ان کے نظریات سے انحراف کو اپنا وطیرہ بنا کر اس ملک کو فوجی وسول آمریتوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ پاکستان اور قائداعظمؒ کی جدوجہد کے باعث اگرچہ ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط اور غلبے سے نجات حاصل ہو گئی مگر آج ہم ایک دوسری طرح کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے گئے ہیں جس سے نجات کے حصول کیلئے ہمیں ازسر قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی جانب رجوع کرنا ہو گا۔ صرف اسی طرح ہم وطنِ عزیز کو ایک جدید اسلامی، فلاحی اور جمہوری مملکت بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

قائداعظمؒ کی زیرِ قیادت تحریک پاکستان میں طلباء و طالبات نے ہر محاذ پر مسلم لیگ کے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا اور ان کی شب و روز جدوجہد کے طفیل برصغیر کا ہر گوشہ ''پاکستان کا مطلب کیا.... لا الٰہ الا اللہ'' کے روح پرور نعروں سے منور ہو گیا تھا۔ بابائے قوم نے بارہا ان کی خدمات کو سراہا تھا اور ان پر اظہارِ فخر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''یہی ہیں وہ مردانِ عمل جو آئندہ ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھائیں گے۔'' مجھے قوی اُمید ہے کہ زیرِ نظر تصنیف کا مطالعہ ہماری نئی نسل میں اس عقابی روح کو بیدار کر دے گا جو تحریکِ پاکستان کا طرّۂ امتیاز تھی اور وہ نظریۂ پاکستان کی مبلّغ بن کر پاکستان کو علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے رہائی دلا کر وطنِ عزیز کی کشتی ساحلِ مُراد تک پہنچائے گی۔

مجید نظامی

(مجید نظامی)

چیئرمین

انتساب!

اسلامیان ہند کے عظیم رہنما

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام!

جن کی ولولہ انگیز قیادت میں مملکتِ خداداد پاکستان کا قیام
ستائیسویں رمضان المبارک (شب قدر) کو عمل میں آیا۔
کے-ایچ-خورشید وہ خوش قسمت نوجوان تھے جنہیں تحریک
پاکستان کے عروج کے زمانے میں بانیٔ پاکستان، بابائے قوم
حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت اور سرپرستی میں ان
کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے خدمت کرنے کی
سعادت حاصل ہوئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بیگم ثریا خورشید

فہرست

تقدیم

بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ اسلامیانِ برصغیر کے ایک ایسے عظیم نجات دہندہ ہیں جنہوں نے انتہائی مشکل حالات سے نبرد آزما ہو کر انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے آزاد کروانے کا بے مثال کارنامہ سر انجام دیا۔ مبارک ہیں وہ شخصیات جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قائداعظمؒ کے زیرِ سایہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے قیام کے لیے جدوجہد کا شرف بخشا۔ ایک ایسی مملکت جو آج پوری امتِ مسلمہ کے لیے باعثِ فخر وتقویت ہے۔ پاکستانی قوم ان شخصیات کی ہمیشہ ممنون احسان رہے گی۔ ان شخصیات کی یادداشتیں اور تاثرات ہماری تاریخ کے اہم ابواب ہیں جنہیں ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کے لیے ایک انمول اثاثے کے طور پر محفوظ کر لینا چاہیے۔ بانیٔ پاکستان کے سیکرٹری کے ایچ خورشید مرحوم کی یادداشتوں پر مشتمل زیرِ نظر کتاب چشم دید واقعات وحقائق پر مبنی ایک نادر دستاویز ہے جس کے مطالعہ سے تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کے حالات وواقعات بالخصوص کشمیر کے حوالے سے بہت سے ایسے پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے جو آج تک عوام الناس کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔

اس حوالے سے بیگم ثریا خورشید صاحبہ کی کاوش قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے بڑی محنت اور لگن سے کے ایچ خورشید مرحوم کی یادداشتوں کو محفوظ رکھا اور اس طرح قائداعظمؒ کے عملے کے ایک اہم رکن کے تاثرات کو اس کتاب کی شکل میں ہم تک پہنچانے کی سعی کی۔

مجید نظامی

چیئرمین نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

تعارف

قائداعظم محمد علی جناحؒ ایک ہمہ جہت اور ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے۔آپ کی ہر دل عزیز اور مقناطیسی شخصیت نے تقریباً ہر شخص کو متاثر کیا یہاں تک کہ وہ ان کا ہو کر رہ گیا۔وہ لوگ جنہیں قائداعظمؒ کی قربت میں کام کرنے کا موقع ملا یقیناً خوش قسمت ہیں۔ ایسی خوش نصیب شخصیات میں خورشید حسن خورشید (کے ایچ خورشید) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔خورشید حسن خورشید کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہیں قائداعظمؒ کی زندگی کے آخری سالوں (1944ء تا 1947ء) میں ان کی خدمت کرنے کی سعادت میسر آئی۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے قائداعظمؒ کی خدمت کے دوران اپنی ''یادداشتیں'' قلمبند کیں جنہیں خورشید صاحب کی بیگم محترمہ ثریا خورشید نے مرتب کیا چنانچہ ان ''یادداشتوں'' کو پہلی بار نظریۂ پاکستان ٹرسٹ بڑے اہتمام کے ساتھ اسلامیانِ پاکستان کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف قائداعظمؒ کی مایہ ناز شخصیت اور کردار کو سمجھنے میں مدد دے گی بلکہ پاکستان کے قیام کی غرض و غایت پر بھرپور روشنی ڈالنے میں ''دلیل راہ'' کا کام دے گی۔

جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال

نفسِ کتاب

قائد اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کا ذکر چھڑتے ہی ہر حساس پاکستانی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور ذہن پوری توجہ سے ان کے بارے میں باتیں سننے میں منہمک ہو جاتا ہے اور اگر گفتگو کرنے والا قائد اعظمؒ کا قریبی ساتھی رہا ہو تو بات چیت کا رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت ہوئی جب زیرِ نظر کتاب کا مسودہ سامنے آیا اور پتہ چلا کہ اس میں قائد اعظمؒ کے نوجوان سیکرٹری کے ایچ خورشید محوِ گفتگو ہیں اور یہ گفتگو ان کی انشا پرداز رفیقۂ حیات ثریا خورشید کی وساطت سے مختلف انٹرویوز، مضامین اور یادداشتوں کی شکل میں مرتب ہوئی ہے۔ اس مسودے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کئی بڑے اور چھوٹے واقعات کے پس پردہ محرکات اور شخصیات سے آگاہی حاصل ہوئی اور بعض بظاہر بڑے لوگ چھوٹی حرکات کرتے نظر آئے، خاص کر ہندوؤں کے بزرگ رہنما گاندھی جی جنہوں نے 1944ء میں مشہور گاندھی، جناح ملاقات کے موقع پر تیل سے مالش کردہ جسم کے ساتھ قائد اعظمؒ ایسے خوش پوش سے بغل گیر ہو کر ان کی نفیس پوشاک کو خراب کر دیا تھا۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ جس تحریک پاکستان نے ایشیا کا نقشہ بدل دیا اور کروڑوں انسانوں کو انگریز حکمرانوں اور ہندو ساھوکاروں کے جابرانہ چنگل سے نجات دلائی، اس کے گوناگوں پہلوؤں، سرگرمیوں، کارناموں اور جزئیات و واقعات کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کا شمار آزادی و حریت کی عظیم ترین لیکن پراسرار تحریکوں میں کیا جا سکتا ہے۔ عظیم ترین اس لیے کہ اس کی وجہ سے آبادی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آئی۔ پراسرار اس لیے کہ تحریکِ پاکستان نے سات سال کی قلیل مدت میں وہ کام کر دکھایا جو تاریخ عالم میں کسی اور تحریک سے نہ ہو

سکا۔تحریکیں دہائیوں تک چلتی ہیں لیکن یہاں یہ صورت تھی کہ 1940ء سے پہلے خواب تو دیکھا گیا تھا البتہ واضح طور پر نہ نصب العین متعین ہوا تھا اور نہ کسی سیاسی تنظیم نے اسے اپنایا تھا۔محدود وسائل' نہ ورکرز' نہ ذرائع ابلاغ' نہ ایمان' نہ اتحاد' نہ تنظیم' نہ ایجنسیاں' نہ غیر ملکی مدد' پھر کیا ہوا؟ صرف سات سال کے عرصے میں برصغیر کے دوتہائی کلمۂ طیبہ پڑھنے والے آزاد ہو گئے۔قدرتی اور معدنی دولت سے بھرپور وسیع وعریض خطے کے مالک بن گئے۔ اقوامِ عالم کی محفلوں میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن گئے۔تمام بے سروسامانیوں کے باوجود ایک نئی قوم ایک نئے نام کے ساتھ معرضِ وجود میں آ گئی۔ایک نیا ملک بن گیا۔اگر یہ معجزہ نہیں تو اور کیا تھا اور معجزے ہوتے ہی پر اسرار ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ پاکستان کی محیر العقول تخلیق ایک محیر العقول فردِ واحد کا کارنامہ ہے جسے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام سے شب و روز یاد کیا جاتا ہے لیکن جس کے بارے میں ابھی تک کوئی مکمل بائیوگرافی مرتب نہیں ہو سکی۔

زندہ و بیدار قومیں اپنے مشاہیر کے بارے میں سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالتی ہیں اور حصولِ آزادی سے متعلق تحریروں' سندوں' یادداشتوں اور مشاہدات کا تو کوئی شمار نہیں ہوتا۔ فرانس' امریکہ' اشتراکی روس اور چین کے انقلابات پر ہر پہلو سے ناقدانہ اور تشریحانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور خود بھارت کے اندر گاندھی' نہرو اور دیگر مشہور ہندو شخصیات اور ان کی مشہور جماعت انڈین نیشنل کانگرس کے بارے میں لامتناہی تحریریں سامنے آ چکی ہیں اور آ رہی ہیں لیکن جس شخص اور قوم نے امریکی مؤرخ سٹینلے والپرٹ کے بقول دنیا کا نقشہ بدل دیا' تاریخ کے دھارے موڑ دیئے اور ایک عظیم قومی ریاست تخلیق کر دی' اس کے بارے میں گنتی کی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔یہی بات دنیا کی عظیم انقلابی تحریک پاکستان اور خطۂ کشمیر کے لوگوں کی جدوجہد آزادی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

اس پس منظر میں بیگم ثریا خورشید کی کاوش انتہائی قابلِ قدر ہے۔بڑے لوگوں کے سیکرٹری حضرات بہت سے واقعات کے چشم دید گواہ ہوتے ہیں اور اپنے مدوحین کی اصل

عادات و افکار اور جذبات سے پوری طرح آ گاہ۔ قائداعظمؒ کے بارے میں یہ بات متعدد بار کہی گئی ہے کہ وہ صاف اور شفاف شخصیت کے مالک تھے اور قول وفعل کے تضاد اور ظاہر و باطن کے امتیاز سے پاک تھے۔ زیرِنظر یادداشتیں نہ صرف ان باتوں کی تصدیق کرتی ہیں بلکہ قائداعظمؒ کی بے مثال زیرکی دانائی یک سوئی اور دلیرانہ قیادت پر روشنی ڈالتی ہیں۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نہ صرف قائداعظمؒ کے سیکرٹری تھے بلکہ ان کا تعلق کشمیر سے تھا۔ انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس دوران آزاد کشمیر کے صدر کی حیثیت سے بھی ناقابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔

اس لحاظ سے یہ کتاب سہ آتشہ ہے کیونکہ اس میں خاص طور پر تین موضوعات کے بارے میں یادداشتیں اور تبصرے شامل ہیں یعنی قائداعظمؒ تحریک پاکستان اور اہل کشمیر کی جدوجہد آزادی۔ اس تصنیف کو بجا طور پر مشاہداتی یا اورل (Oral) تاریخ نگاری کا حصہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ محض مشاہدات سے کسی دور کی مکمل تاریخ نہیں لکھی جاسکتی لیکن ان کے بغیر بہت سے اہم واقعات کا صحیح ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ کے ایچ خورشید 1941ء سے 1947ء تک سیکرٹری کی حیثیت سے قائداعظمؒ کے قریب رہے۔ ان کا اعتماد حاصل کیا اور ایک گھر کے فرد کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے۔ ہم ان کی بیگم محترمہ ثریا خورشید کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ایسی اہم شخصیت کے ملفوظات اور مضامین حفاظت سے رکھے۔ اس سے پہلے وہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے بارے میں اپنی معلومات افزا ڈائری شائع کر کے دادِ تحسین وصول کرچکی ہیں جسے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ نے "یادوں کی کہکشاں" کے نام سے شائع کیا ہے۔ امید ہے ان کی تازہ ترین کاوش تحریک پاکستان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے چشم کشا ہوگی۔

ڈاکٹر رفیق احمد

پیش لفظ

میں اور میرے دونوں بچے یاسمین اور خرم جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو اکثر خورشید صاحب کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک بار میں نے ان دونوں سے پوچھا ''آپ کے ابا جان نے آزاد کشمیر کی صدارت سے استعفیٰ کیوں دیا تھا حالانکہ اس وقت ان کی صدارت کی مدت میں ساڑھے تین سال باقی تھے۔'' دونوں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اس لیے کہ ان کا حکومتِ وقت سے اختلاف ہو گیا تھا۔'' لیکن یہ تو کافی نہیں ہے۔ بات تو ختم ہو گئی لیکن اس رات میں دیر تک سوچتی رہی کہ اگر میرے بچوں کو ہی بعض باتیں معلوم نہیں ہیں تو دوسرے تو بالکل ہی نہیں جانتے کہ وہ کیا وجوہات تھیں، کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے خورشید صاحب کی حکومت سے کچھ ایسی ٹھنی کہ انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ یہ تو ایک پہلو ہے ان کی زندگی کا۔ بے شمار دوسری باتیں ہیں، ایسے حقائق ہیں، ایسی مصلحتیں ہیں، ایسی حقیقتیں ہیں جو معلوم ہونی چاہئیں۔

ان کے دوست، احباب اور کرم فرما انہیں ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہ قائداعظمؒ کے ساتھ اپنی طویل وابستگی اور تحریکِ پاکستان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بابائے قوم کے بارے میں اپنی یادداشتوں کی بنیاد پر کتاب لکھیں اور اپنی سیاسی زندگی، قید و بند کی صعوبتوں نیز کشمیر کے الجھے ہوئے مسئلے پر بھی قلم اٹھائیں۔ قائداعظمؒ کی ذات سے وہ اس طرح متاثر تھے کہ ان کی ہمہ گیر شخصیت پر کچھ تحریر کرنے کے لیے اپنی تمام توجہ محنت اور وقت نکالنا چاہتے تھے۔ زندگی اتنی مصروف تھی، تگ و دو اتنی زیادہ تھی، یکسوئی کے لمحات شاید کم تھے' اس لیے اس تحریر میں تاخیر ہو گئی حالانکہ قائداعظمؒ پر کتاب لکھنے کے لیے انہوں نے لندن میں جب وہ بار ایٹ لاء کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اپنی ڈائری میں نوٹس لکھے جسے

کتابی شکل دینے میں ان کی زندگی کے طویل برس گزر گئے اور انہیں موقع نہ ملا۔ ان ہی اوراق کو ان کی المناک وفات کے بعد میرے بھائی خالد حسن نے یکجا کر کے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع کروایا۔ خورشید صاحب نے Memories of Jinnah کے نام سے یہ نوٹس لکھے تھے۔ اسی لیے اس کتاب کا نام بھی یہی رکھا گیا۔ زندگی انہیں مہلت دیتی تو وہ اس تحریر کو مزید لکھ کر شائع کرواتے لیکن ان کا لکھا ہوا چونکہ وہی تھا' اس لیے اسی طرح اسے چھپوایا۔ ویسے وہ مختصر سی کتاب بڑی مقبول ہوئی اور قائداعظمؒ کی شخصیت کے بڑے خوبصورت پہلو اس میں نظر آئے۔

بدقسمتی تو یہ ہے کہ جس طرح خورشید صاحب قائداعظمؒ کے متعلق ایک جامع کتاب نہ لکھ سکے، اسی طرح اپنے متعلق بھی تحریر نہ کر سکے حالانکہ 1988ء کے موسم گرما میں عدالتیں بند ہونے پر اس سال ان کا ارادہ تین کتابوں پر اکٹھے کام کرنے کا تھا جن میں سرفہرست کتاب قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کی جدوجہد تھی۔ کاش! وہ ایسا کر سکتے۔ اس طرح ان کے متعلق صرف وہ طویل انٹرویو اور بیانات ہیں جو وہ اکثر اخبارات اور رسائل کو دیا کرتے تھے' میرے پاس محفوظ پڑے ہوئے تھے۔ جب بچوں سے اس رات یہ باتیں ہوئیں تو میں یہی سوچتی رہی کہ خورشید کی باتیں ان کی اپنی زبانی موجود ہیں۔ ان کے حوالے سے میں خود ان کی زندگی کے متعلق تحریر کروں۔ یہ شاید ایک قرض ہے جو مجھے ادا کرنا چاہیے۔ اسی جذبے اور اسی سوچ سے میں نے خورشید صاحب کی زندگی کی کہانی لکھنے کے لیے قلم اٹھایا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ مجھے ڈر یہی تھا کہ شاید میں ٹھیک طرح اس کام کو نہ کر سکوں لیکن جب میں نے ارادہ کر لیا تو میں نے اس مسودے پر محنت کی' کام کیا اور ان کی اپنی کہی ہوئی باتوں کے حوالے سے ان کی زندگی کے حقائق اس طرح الفاظ میں ڈھالے کہ ایک تسلسل قائم رہے۔ چند ذاتی حوالے اس لیے دیئے کہ یہ تحریر دلچسپ ہو جائے۔ ویسے بھی اس طرح کی تحریروں میں واضح طور پر ذاتی باتیں لکھنے سے اس شخصیت کا سحر قائم رہتا

ہے جس کے متعلق لکھا جائے۔

ہوسکتا ہے مجھ سے کچھ کوتاہی بھی ہوگئی ہو۔ کچھ غلطی بھی ہوگئی ہو لیکن جو کچھ کہا ہے وہ سچ اور صداقت پر مبنی ہے۔ دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ خورشید کے اپنے الفاظ میں یہ قائداعظمؒ، سیاست اور پاکستان کی کہانی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ خورشید کی زندگی کے اوجھل پہلو ان کے مداحوں اور دوستوں تک ضرور پہنچیں۔ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئی' اس کا فیصلہ تو اس کتاب کو پڑھنے والے ہی کریں گے لیکن ان تحریروں کو کتابی شکل دے کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میرے ذہن سے ایک بوجھ ہلکا ہوا اور مجھے روحانی مسرت حاصل ہوئی۔ کاش! یہ کام' یہ تحریر خورشید خود لکھتے۔

میں محترمی جناب مجید نظامی صاحب چیئرمین نظریہ پاکستان ٹرسٹ لاہور اور مکرمی جناب پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان کی ذاتی دلچسپی اور سرپرستی میں یہ پروجیکٹ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھائی پروفیسر محمد حنیف شاہد کی بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے زیرنظر کتاب کو بڑی خوبصورتی اور بڑی محنت سے وہ شکل دی جو آپ کے سامنے ہے۔

میں پروفیسر احمد سعید کی بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں بڑے کارآمد مشوروں سے نوازا' میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے!

ثریا خورشید

قسمت کے۔ایچ۔خورشید پر کیسے مہربان ہوئی؟

ذیل میں اس خوش قسمت نوجوان کی اپنے الفاظ میں سرگزشت ہے جس میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ ایک غیر پیشہ ور صحافی سے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدے تک کیسے پہنچے۔وہ کہتے ہیں:

''قائداعظمؒ سے میری پہلی ملاقات 19 نومبر 1942ء کو جالندھر میں ہوئی جہاں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اپنی سالانہ کانفرنس منعقد کررہی تھی اور جس کی صدارت کے لئے قائداعظمؒ نے وعدہ فرمارکھا تھا۔

جب میں کہتاہوں کہ میں پہلی دفعہ قائداعظمؒ سے ملاتو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ملاقات پہلے سے طے تھی۔شاید یہ کہنا زیادہ انسب ہوگا کہ میں نے اُن سے مصافحہ کرتے وقت محض اُن کو دیکھا تھا۔اس وقت اُنہوں نے صرف ایک جملہ کہا''اچھاتو یہ تمہارا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے مسلم لیگ کا وہ پرچم میرے حوالے کیا جو ہماری قائم کردہ کشمیر مسلم سٹوڈنٹس یونین کوعطا کیا گیا تھا۔دراصل موقع کی مناسبت سے یونین نے مجھے اور مسٹر غلام رسول کو جالندھر میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں ممبر بنانے کی ذمہ داری سونپی تھی۔

''اس موقع پر میں نے قائداعظمؒ کوتقریر کرتے سنا اوران سے عوام کی بے پناہ جاں نثاری کافوری طور پر احساس اُبھرا۔میں سمجھتاہوں کہ میں خودبھی ان سے عقیدت کا اتنا شیدائی ہوا کہ میں نے جالندھر میں قیام کے تیسرے روز قائداعظمؒ سے خودہی ملنے کافیصلہ کرلیا۔

''لاہور میں ایک اور موقع پر مجھے قائداعظمؒ سے ملنے کا شرف حاصل ہوایا بہتر طور یوں کہیے کہ اُن کونظر بھر کر دیکھنے کاموقع ملا۔اس دن سے میں قائداعظمؒ کا پکامداح بن گیا اوراخبارات میں شائع ہونے والی ان کی ہر خبر،ہر مضمون اور ہر خط کا عقیدت واحترام سے مطالعہ کرنے لگا۔

''سیالکوٹ میں مئی 1944ء کو پہلے ہفتہ میں پنجاب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر قائد اعظمؒ کی جھلک دیکھنے کا ایک موقع نصیب ہوا۔ میں دوسری مرتبہ مسلم کانفرنس کے ایک وفد کے ہمراہ اُن سے ملا۔ قائد اعظمؒ سے میری تیسری ملاقات کا سبب وہ پیغام تھا جو میں نے مسلم کانفرنس کی طرف سے ان تک پہنچانا تھا۔ جب قائد اعظمؒ ایک خط کے ذریعے مجھے اپنا پیغام دے چکے تو اُنہوں نے مجھ سے دریافت کیا آیا کہ کیا میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ جانتا ہوں۔ جب میں نے نفی میں جواب دیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ اگر میں یہ ہنر سیکھ لوں تو یہ میری اضافی قابلیت ہوگی اور عملی میدان میں میری قدرومنزلت بڑھ جائے گی۔ اس کے بعد اُنہوں نے مجھ سے چند ذاتی سوالات پوچھے جن کا تعلق میری تعلیم اور میرے گھرانے سے تھا۔ اس کے بعد میں نے ان سے رخصت چاہی۔

آپ ہر دفعہ میرے ساتھ نہایت عمدہ طریقے سے پیش آتے تھے۔ بعد ازاں جب ان کے ہاں میری آمدورفت زیادہ ہوگئی تو وہ خود دروازے پر تشریف لاکر مجھے اندر لے جاتے۔ اگر وہ مصروف ہوتے تو مجھے کچھ دیر کے لئے توقف کرنے کو کہہ دیتے لیکن یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ وہ مجھے یہ کہتے کہ اب آپ جائیں اور پھر کسی وقت آئیں۔

''28 مئی 1944ء کو امر سنگھ کلب میں سری نگر کے معروف تاجر اور جیولر جناب غلام احمد نے ایک گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا تھا جس میں قائد اعظمؒ مہمان خصوصی تھے۔ جب سورج غروب ہونے کو تھا تو قائد اعظمؒ مختلف میزوں پر بیٹھے مہمانوں سے ہاتھ ملانے کے لئے اپنی نشست سے اٹھے۔ ہوا یوں کہ جس میز پر وہ سب سے پہلے تشریف لائے اتفاق سے اس میز پر میں بھی موجود تھا۔ سب حضرات سے مصافحہ کرنے اور خیریت معلوم کرنے کے بعد اُنہوں نے مجھے کہا کہ باہر راستے تک میں ان کے ساتھ چلوں۔ چونکہ وہاں پر موجود بہت سے لوگوں سے میں پہلے سے واقف تھا لہٰذا میرے لئے ان کا قائد اعظمؒ سے تعارف کرانا آسان ہوگیا۔ ان کی شخصیت اتنی بارعب تھی کہ جس کسی بھی میز کے قریب وہ پہنچتے ہر کوئی از خود کھڑا ہو جاتا اور ان کے سامنے کچھ بھی بول نہ پاتا۔

مسٹر کے ایچ خورشید قائداعظمؒ سے متعدد مرتبہ ملے۔ یہ آخری موقع تھا کہ قائداعظمؒ نے انہیں اپنا پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کرنے کی پیشکش کی۔شاید قائداعظمؒ ان کی صحافتی اہلیت کا امتحان لینا چاہتے تھے۔لہٰذا اُنہوں نے انہیں ملنے کوکہا۔قائداعظمؒ سے اپنی آخری ملاقات کی یادیں دہراتے ہوئےمسٹر کے ایچ خورشید بتاتے ہیں:۔

’’میں وہ دن کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا جب اُنہوں نے مجھے اپنا ’’پرائیویٹ سیکرٹری‘‘ بننے کوکہا۔ یہ 26 جون 1944ء کا دن تھا۔ مجھے اندر بلوایا گیا۔قائداعظمؒ نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ میرا استقبال کرتے ہوئے پُرتپاک انداز میں ’’گڈمارننگ‘‘ کہا۔میں ان کے قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اوران کی خیریت کے بارے میں نے چند جملے اداکرنے کے بعدعرض کیا کہ جناب عالی! آج کے دن ہمارے لئے ایک بہت غم ناک خبر ہے‘‘۔اُنہوں نے انتہائی توجہ سےمیری طرف دیکھا:’’گذشتہ شب نواب بہادریار جنگ وفات پاگئے۔‘‘ مجھے یقین نہیں آرہا۔’’میرا ہر دلعزیز ساتھی۔قائداعظمؒ نے اپنے سیکرٹری مسٹر لوبوکوبلوایا اورانہیں نواب بہادریار جنگ کی وفات پر اپنا تہنیتی پیغام لکھوایا۔ جب مسٹر لوبو باہر گئے تو قائداعظمؒ نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرسکتاہوں؟ کیا میں یہ کہوں کہ مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آرہا؟ قائداعظمؒ نے اس کے ساتھ ہی مجھ سے یہ فرمایا کہ میں جلدبازی میں فیصلہ نہ کروں بلکہ اس مسئلے کی بابت دوبارہ غور کروں اور صاف گوئی سے انہیں مطلع کردوں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان سے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے رابطہ کیا ہےجن میں سے بہت سے طلبا اورنوجوانوں کے پاس مختلف یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں بھی تھیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ کسی کے پاس ڈگری اوراہلیت دونوں ساتھ ساتھ ہوسکتی ہیں۔اُنہوں نےفرمایا کہ ان کے اپنے پاس کوئی ڈگری نہیں۔قائداعظمؒ نے اس موقع پر مجھے یہ باورکرایا کہ میں نے ان سے ’’بیان‘‘ حاصل کرنے کے لیے کس قدرقابلِ ستائش استقامت اورثابت قدمی کامظاہرہ کیاتھا۔‘‘

☆☆☆

کے۔ایچ خورشید: تعارف

سرینگر میں اس سال برف باری میں تاخیر ہوگئی تھی۔3 جنوری کی ایک یخ بستہ صبح کو جب خورشید صاحب پیدا ہوئے۔تو سردیوں کی پہلی برف باری ہوئی۔ان کی پیدائش پر ساری وادی سفید شفاف برف سے ڈھک گئی تھی۔بالکل ان کی زندگی کی طرح صاف و شفاف۔قدرت کی طرف سے بھی ایک پیغام تھا۔

وہ ایک ہونہار طالبعلم تھے لیکن نوعمری سے ہی سیاست سے دلچسپی تھی۔اس زمانے میں برصغیر میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور مسلمانانِ ہند کے لیے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قائداعظمؒ محمد علی جناحؒ پاکستان حاصل کرنے کے لیے کانگریس اور انگریزوں سے نبرد آزما تھے۔کشمیر میں خورشید اور ان کے چند ساتھیوں نے **مسلم سٹوڈنٹس یونین** بنائی اور **تحریکِ آزادی** اور **تحریکِ پاکستان** کے لیے ٹھوس کام کیا۔**اورینٹ پریس آف انڈیا** کی نمائندگی بھی سرینگر میں خورشید ہی کرتے تھے۔ 1944ء میں قائداعظمؒ آرام کرنے کی غرض سے **محترمہ فاطمہ جناحؒ** کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے۔خورشید کو تحریکِ پاکستان اور سیاست سے ایک نوعمر طالب علم ہوتے ہوئے بھی بہت دلچسپی تھی۔برصغیر کے عظیم لیڈر سے محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک نوجوان اخبارنویس کی حیثیت سے قائداعظمؒ کے پاس جانے کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔کشمیر سے واپسی پر قائداعظمؒ نے انہیں بحیثیت اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے ساتھ لے جانے کی پیشکش کی جو خورشید کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا اور اس نوعمری میں 1944ء سے 1947ء کا طویل سیاسی سفر جس میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا ان کی زندگی کا بہترین دور تھا۔جب وہ قائداعظمؒ کے ساتھ پاکستان حاصل کرنے کی فیصلہ کن جنگ میں ان کے ساتھ تھے اور ان کا بھرپور اعتماد انہیں حاصل تھا۔

شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر ہوئی۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ خورشید کہا کرتے تھے کہ" 20 ستمبر 1947ء کو قائداعظمؒ سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ میں سری نگر جانے کے لیے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے حسبِ معمول کشمیری امور میں گہری دلچسپی لی اور کشمیری لیڈروں کے نام پیغام بھی بھیجے۔ اس طرح قدرت نے مجھے وہ عہد پورا کرنے کی توفیق دی جو 26 جولائی 1944ء کو میں نے اپنے دوستوں سے باندھا تھا کہ اب کشمیر اس وقت آؤں گا جب پاکستان بن جائے گا۔" لیکن خورشید کو حکومت کشمیر نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نومبر میں گرفتار کرلیا۔ 13 ماہ کی سخت قید کے بعد دسمبر 1948ء میں جیل سے رہائی ملی اور جنوری 1949ء میں پاکستان آئے۔ اس عرصہ میں قائداعظمؒ کا انتقال ہو چکا تھا اور حکومتِ پاکستان نے خورشید کی ملازمت فوری طور پر ختم کر دی تھی۔ پاکستان واپس آنے پر جب وہ لیاقت علی خاں اور دوسرے اہم لوگوں سے ملے تو انہیں دوبارہ اس ملازمت پر بحال کرنے کی پیشکش ہوئی لیکن خورشید نے اس کے بعد سرکاری عہدہ یا نوکری زندگی بھر نہیں کی۔ لاہور سے انہوں نے مشہور صحافی عزیز بیگ کے ساتھ مل کر ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار 'گارڈین' نکالا۔ جو حکومت کی انتقامی کارروائی کے باعث کچھ عرصے کے بعد بند کرنا پڑا۔ کراچی میں محترمہ فاطمہ جناحؒ سے ملنے گئے تو انہوں نے قائداعظمؒ کی خواہش کے مطابق انہیں بارایٹ لاء کرنے کے لیے انگلستان بھیجا اور سارے اخراجات بھی خود برداشت کیے۔

خورشید صاحب کی ساری زندگی پاکستان سے محبت کی ایک کہانی ہے۔ اس عہد کی کہانی ہے جس کے تحت انہوں نے نوعمری میں قائداعظمؒ کے ساتھ ایک مخلص شیدائی کے طور پر کام کیا۔ اس دور کو تو وہ ہمیشہ 'عبادت' کا درجہ دیتے تھے۔ اس لگن کی کہانی ہے جس سے وہ کشمیر کا الحاق پاکستان سے دیکھنے کے متمنی تھے۔ اس عقیدت کی کہانی ہے جس سے وہ پاکستان کو قائداعظمؒ کے تصورات کا پاکستان دیکھنے کے متمنی تھے۔ اس شوق کی کہانی ہے

جس سے وہ پاکستان میں قائداعظمؒ کی جمہوریت دیکھنے کے خواہاں تھے اور پھر اپنے ملک کے خوبصورت سبزہ زاروں' بہتے چشموں' سربفلک برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں' لہلہاتے پھولوں' سرسبز عمیق وادیوں' شفاف آبشاروں اور گھنے جنگلوں سے محبت کی کہانی ہے۔ کشمیر ان کے ذہن میں بسا رہتا تھا۔ وہ اس کے حسن میں ہمیشہ سرشار رہے تھے۔ اور ان خوبصورت وادیوں کو یاد کرکے بہت خوش ہوتے تھے۔

اس لیے موت کے جانکاہ حادثہ کے بعد لوگوں کے اصرار پر گھر والوں نے ان کے جسدِ خاکی کو تدفین کے لیے مظفر آباد بھیجنے پر اعتراض نہ کیا۔ اس لیے کہ **آزادی کی صبح**' کو اپنے ملک کے لیے تو وہ نہ دیکھ سکے لیکن اس کی لمس تو ان کے ساتھ موجود رہے۔ لاہور میں خالد مسجد کیولری گراؤنڈ میں ان کی نمازِ جنازہ ہوئی۔ جس میں اس دور کے چیف منسٹر میاں نواز شریف کے علاوہ اعلیٰ فوجی اور سول ملازمین کے ساتھ آزاد کشمیر کے متعدد اہم لوگوں اور ان کے بے شمار احباب' عزیز اور مداح شریک ہوئے۔ حکومت کے ایما پر جہاز میں ان کی میت اسلام آباد پہنچائی گئی۔ جہاں سے براستہ ایبٹ آباد گاڑیوں کے جلوس میں انہیں مظفر آباد لایا گیا۔ موسمِ خزاں تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے کوہالہ کے راستے نہ جا سکے۔ اسلام آباد ائیرپورٹ پر آزاد کشمیر سے بے شمار لوگ اپنے لیڈر کے آخری دیدار کے لیے جمع تھے۔ آزاد کشمیر کی حدود ایبٹ آباد کے راستے گھڑی حبیب اللہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں ریاست کے اعلیٰ افسر جمع تھے۔ سرکاری سلامی دی گئی اور لوگوں کی بھاری تعداد میں انہیں مظفر آباد پہنچایا گیا۔ یہاں پولیس اور نوجوانوں کا آپس میں ٹکراؤ بھی ہو گیا۔ نوجوان بضد تھے کہ وہ انہیں مظفر آباد تک اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لے جائیں گے اور حکومت کے کارکنوں اور ان کی موجودگی کی انہیں ضرورت نہیں ہے۔ **یہ تو جذبات تھے نوجوانوں کے جو غم سے** نڈھال تھے۔ بہرحال مظفر آباد میں ایسا جنازہ کبھی نہ دیکھا گیا۔ سرکاری اطلاعات کے مطابق 3 سے 4 لاکھ لوگ جنازے میں شریک تھے۔ درختوں اور چھتوں پر لوگ جن میں

عورتیں اور بچے بھی تھے۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔
خورشید ہر ماہ کم از کم 10 روز مظفر آباد اور آزاد کشمیر میں گزارتے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں اور
لیڈر آف دی اپوزیشن کے علاوہ بھی وہ اپنے لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کرتے تھے۔
انہیں بڑی خوشی ہوتی تھی اپنے ملک میں جا کر اور اپنے لوگوں سے مل کر جن پر انہوں نے
بھرپور توجہ دی اور حتیٰ الامکان ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔

یہ خورشید کی زندگی کی کہانی ہے جس میں اشک بھی ہیں اور اطمینان بھی ہے۔
انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ کبھی ہمت نہ ہاری۔ زندگی
کے ہر لمحے کی قدر کی۔ ذاتی صدمات کے باوجود کبھی کسی پر اپنا دکھ ظاہر نہیں کیا۔ خلوص اور
دیانتداری کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس میں میر التعاون بھی میسر تھا جس کا انہیں احساس تھا۔
میں جب اپنی زندگی کے اس پرخلوص ساتھ کے متعلق سوچتی ہوں تو دکھ اور کرب کے باوجود
ایک عجیب سا اطمینان بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ذاتی صدموں اور پریشانیوں کے باوجود
بہت پرمسرت زندگی گزاری جس میں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ بچے جب بڑے ہوئے تو
انہوں نے بھی ان قدروں سے سمجھوتہ کیا۔ ہماری زندگی بڑی پُرمسرت تھی جس میں قوس
قزح کے رنگ تھے۔ کہکشاں کی روشنی تھی، سکون تھا۔ اطمینان تھا اور جھیل کی گہرائی جیسا
ٹھہراؤ تھا۔

میری بیٹی یاسمین کبھی کبھی یہ ضرور کہتی ہے جب ہم اکٹھے بیٹھ کر خورشید صاحب کی
باتیں کرتے ہیں۔ ''امی! ہمیں تو ابا جان کا ان کے جانے کے بعد ہی پتہ چلا کہ وہ کتنے
بڑے آدمی تھے، ہم نے ان کا پیار محبت اور بے پایاں شفقت ہی دیکھی۔''

شادی

خورشید صاحب نومبر 1954ء میں بار ایٹ لاء کی تعلیم مکمل کر کے تین سال
انگلستان قیام کے بعد واپس پاکستان آئے۔ بزرگوں کی باہمی رضامندی سے ہمارا رشتہ اس

عرصہ میں طے ہوگیا تھا چونکہ گھر کی بات تھی اس لیے رسماً منگنی کی رسم ادا نہیں ہوئی تھی۔ صرف میرے والد صاحب نے 'ہاں' کر دی تھی۔ اس میں ہم دونوں کی رضامندی کو بھی مدِ نظر رکھا گیا تھا۔ خورشید صاحب دسمبر 1954ء میں گھر والوں سے ملنے کراچی سے آئے۔ سیالکوٹ میں بھی ہمارے ہاں انہوں نے چند دن گزارے۔ میرے والد اب شادی جلد کر دینا چاہتے تھے۔ خورشید صاحب کا خیال تھا کہ ان کی پریکٹس ذرا چل جائے وہ گھر لینے اور گھر چلانے کے قابل ہو جائیں تو فوراً ہی شادی کرلیں گے۔ کراچی میں ان کا قیام محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ہاں تھا۔ انہوں نے ہی قائداعظمؒ کے ایماء پر انہیں پڑھنے کے لیے انگلستان بھیجا تھا۔ وہ فرماتی تھیں کہ قائداعظمؒ کو بھی اس کا قلق تھا کہ خورشید پاکستان بننے پر جب اکتوبر 1947ء میں کشمیری لیڈروں کے لیے کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں قائداعظمؒ کا پیغام لے کر کشمیر گئے تو انہیں یہاں کی حکومت نے جیل میں ڈال دیا تھا۔ گھر والوں سے ملنے بھی انہیں جانا تھا اور ساتھ ہی یہ اہم کام بھی ان کے ذمہ قائداعظمؒ نے کیا تھا۔ افسوس ایسا نہ ہوسکا۔ اس عرصہ میں قائداعظمؒ صاحبِ فراش بھی ہوگئے اور ستمبر 1948ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ خورشید اس وقت ریاست کشمیر کی بدترین مجرموں والی جیل۔ رام جیل میں قیدو بند کی صعوبتیں برداشت کررہے تھے۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ چونکہ جیل میں وہ انتہائی تکلیف دہ حالات میں رہے تھے باہر کی دنیا کی کوئی خبر نہیں ملتی تھی' نہ اخبار دیتے تھے' نہ ریڈیو۔ اس لیے خبروں کے لیے وہ بے حد تشنہ رہتے تھے۔ ایک رات انہیں خواب آیا کہ جیل کا محافظ جب قیدیوں کے لیے کھانا لایا تو جس اخبار میں روٹیاں لپٹی ہوئیں تھیں اسے انہوں نے جب پڑھا تو سکتے میں آگئے۔ ایک خبر تھی کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ آج کوئٹہ سے کراچی آتے ہوئے ایک ہوائی حادثے کا شکار ہوگئے۔'' خورشید بتاتے تھے صبح اٹھتے ہی انہوں نے تاریخ نوٹ کرلی۔ 11 ستمبر کا دن تھا اور کتنا عجیب اتفاق ہے کہ قائداعظمؒ کا انتقال بھی اسی دن ہوا اور اس دن ہی وہ کوئٹہ سے کراچی شدید علالت میں آئے۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ کو جب معلوم ہوا کہ خورشید صرف اس لیے شادی التوا میں ڈال رہے ہیں تا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکیں تو وہ خفا ہوگئیں کہ اس وجہ سے وہ شادی کیوں ملتوی کر رہے ہیں۔ ان سے اصرار کیا کہ گھر والوں کے ساتھ دسمبر 1955ء کی تاریخ طے کرلیں اور کرسمس کی چھٹیوں میں شادی کرلیں۔ خورشید نے ایسا ہی کیا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے میرے لیے بری کا ایک سوٹ بھجوایا۔ فیروزے کا سونے میں بنا ہوا ایک خوبصورت سیٹ بھی بھیجا۔ جو بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ قائداعظمؒ نے خود دہلی سے ایسے تین سیٹ خریدے تھے۔ جن میں سے دو انہوں نے اپنی بھانجیوں کی شادی پر دیئے اور ایک انہوں نے مجھے دیا۔ یہ میری عین خوش قسمتی تھی کہ قائداعظمؒ کا خریدا ہوا سیٹ مجھے ملا۔ خورشید کے لیے بارات پر پہننے کے لیے اچکن، جناح کیپ اور شلوار کُرتہ انہوں نے بنوایا۔ یہ بھی کہا کہ وہ شادی میں شریک ہوں گی اور بارات کے ساتھ آئیں گی۔ میرے ابا جان نے ان کے ٹھہرنے کا بڑا اچھا بندوبست کیا اور سب ان کی آمد کے منتظر تھے۔ لیکن پھر وہ بوجہ سردی نہ آسکیں۔ پنجاب میں ان دنوں سردی بہت پڑتی تھی۔ کئی کئی دن بارش ہوتی تھی۔ ہماری شادی کے دنوں میں بھی بارش اور گہرا ابر چھایا ہوا تھا۔

ہماری شادی 31 دسمبر 1955ء کو سیالکوٹ میں نہایت عمدہ طریقے سے ہوئی۔ بہت اچھے اور نامور لوگ شریک ہوئے۔ یکم جنوری 1956ء کو رخصتی ہوئی۔ ہم لوگ پنڈی آئے جہاں خورشید صاحب کے بڑے بھائی کرنل عبدالرشید کے ہاں سب جمع تھے۔ 3 جنوری کو رشید بھائی نے پنڈی کلب میں شاندار ڈنر دیا جس میں سب لوگ شریک ہوئے۔ اسی رات 12 بجے ہم دونوں تیز گام سے کراچی کے لیے روانہ ہوگئے اور 5 جنوری کی صبح کو کراچی پہنچے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ ہماری منتظر تھیں۔ جنہوں نے بہت محبت اور چاہت سے ہمیں نوازا۔ فلیگ سٹاف ہاؤس کا ایک حصہ انہوں نے ہماری رہائش گاہ میں بدل دیا۔ خورشید کا قیام انگلستان سے واپسی پر ان کے پاس ہی تھا۔ میری آمد پر انہوں نے ان

کمروں کو از سر نو ترتیب دیا۔ بڑی آرام دہ اور کشادہ جگہ تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ محترمہ نے محبت اور خلوص سے ہمیں اپنے ساتھ رکھا اور بہت آرام، سکون اور خوشی سے ہم دونوں نے 'فلیگ سٹاف' ہاؤس میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ جس میں ان گنت مسرتیں تھیں، محبت تھی، یکجائی تھی اور محترمہ کی شخصیت کی خوبصورت لمس تھی جس میں ممتا کا پیار رچا بسا تھا۔ ایک میز پر جب ہم تینوں کھانا کھاتے تھے تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ بابائے قوم کی عظیم بہن کے اتنے قریب ہیں اور وہ ہمیں بچوں کی طرح چاہتی ہیں۔

کے۔ ایچ خورشید -- ایک جائزہ

سرینگر میں طالبعلم کی حیثیت سے ہی انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کشمیر کے مرغزاروں میں تحریکِ پاکستان کی جدوجہد اس جوش وخروش سے تو نہیں تھی۔ لیکن یہ سب جانتے تھے کہ برصغیر میں قائداعظمؒ کی قیادت میں مسلم لیگ مطالبہ پاکستان کے لیے سرگرم ہے۔ اس زمانے میں علی گڑھ سے پڑھے لکھے مسلمان کشمیری نوجوانوں نے کشمیر میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی لیکن چند ماہ بعد سب سرکاری ملازمتوں میں چلے گئے تو اس کے بعد مسلم سٹوڈنٹس یونین ہی تھی جو سرینگر میں پاکستان آکر قائداعظمؒ کی حمایت میں ہندو نواز ذہنیت کے پروپیگنڈے کا مقابلہ کرتی تھی۔

خورشید اس نوعمری میں Orient Press of India کے نمائندے تھے اس لیے جب 1944ء کی گرمیوں میں قائداعظمؒ آرام کرنے کی غرض سے کشمیر تشریف لائے تھے تو خورشید روز ان کے پاس سلام کرنے اور خبریں دینے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ اتفاق سے قائداعظمؒ جس ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ ان کے گھر کے بالکل قریب تھا۔ قائداعظمؒ نے ایک دن ان کا جوش وخروش اور لگن دیکھ کر انہیں کہا کہ جب تک میں کشمیر میں ہوں وہ ان کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیا کریں۔ ان کے لیے اس سے

سنہری موقع کونسا تھا بخوشی قبول کیا اور بتایا کرتے تھے کہ قائداعظمؒ نے یہاں جو سب سے پہلا بیان دیا وہ نواب بہادر جنگ کی وفات کے بارے میں تھا۔ جسے انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی خبروں میں سنا اور قائداعظمؒ کو جا کر خبر سنائی۔

کشمیر سے واپسی پر قائداعظمؒ خورشید کو اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے لے گئے اس وقت وہ صرف 19 برس کے تھے اور B.A کا امتحان دیا ہوا تھا جس کا رزلٹ ابھی نہیں نکلا تھا۔ اس نوعمری میں ان کے لیے یہ بڑا انوکھا اور خوبصورت تجربہ تھا۔ خوش قسمتی سے وہ پاکستان کی جدوجہد (47-1944ء) سے قائداعظمؒ کے قریب رہے' ان کا اعتماد حاصل کیا اور ایک گھر کے فرد کی حیثیت سے انہیں ان کے گھر میں ایک منفرد مقام ملا۔

پاکستان بن جانے پر وہ اکتوبر 1947ء میں اپنے گھر والوں سے ملنے اور قائداعظمؒ کا خاص زبانی پیغام شیخ عبداللہ اور دوسرے کشمیری لیڈروں کے لیے لے کر قائداعظمؒ کی اجازت سے کشمیر آئے لیکن دس روز کے بعد ہی انہیں حکومتِ کشمیر نے گرفتار کر لیا۔ کسی لیڈر سے ملنے کی نوبت نہ آئی اور 13 ماہ کی سخت حراست کے بعد انہیں ریڈ کراس کے ذریعے جنوری 1949ء میں رہا کیا گیا۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ خورشید جنرل گھنسارا سنگھ جو گلگت کے معرکہ میں پاکستان کا قیدی بنا تھا کے بدلے رہا ہوئے اور یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ قائداعظمؒ نے عمر بھر میں پنڈت نہرو کو صرف ایک خط لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ وہ ان کے سیکرٹری کو رہا کر دیں۔ اس لیے کہ ان کے کام کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ نہرو نے جواب دیا کہ یہ ریاست کشمیر کا اندرونی معاملہ ہے حکومتِ ہند کا نہیں۔

اس عرصہ میں قائداعظمؒ کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی وفات کے فوراً بعد لیاقت علی خان نے ان کی نوکری ختم کر دی گویا وہ اپنی مرضی سے جیل میں گئے تھے۔ خورشید رہا ہونے کے بعد کراچی گئے لیاقت علی خاں سے پوچھا تو وہ خاموش رہے اور انہیں پھر ملازمت کی پیشکش کی لیکن خورشید اس بات سے اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ اس کے بعد کوئی نوکری نہیں

کی ۔وہ تلخ آدمی نہیں تھے۔کبھی کسی بات کا شکوہ نہیں کرتے تھے۔

لاہور میں انہوں نے مشہور صحافی عزیز بیگ کے ساتھ مل کر ایک روزنامہ اخبار "Guardian" شروع کیا۔ جو کچھ عرصہ کے بعد حکومت کی تلخ روش اور فنڈز کی کمی کی وجہ سے بند ہو گیا۔محترمہ فاطمہ جناحؒ نے انہیں بار ایٹ لاء کرنے کے لیے کہا۔وہ بتایا کرتی تھیں کہ قائداعظمؒ کو اپنی مصروفیات اور بیماری کے باوجود اس بات کا بہت رنج تھا کہ خورشید بلاوجہ جیل میں ہیں۔محترمہ چاہتی تھیں کہ ان کے لیے کچھ کیا جائے۔

1951ء میں خورشید بار ایٹ لاء کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے۔سارے اخراجات محترمہ نے برداشت کیے۔نومبر 1954ء میں لاء کی ڈگری لے کر واپس آئے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ سے ملنے گئے تو انہوں نے اصرار کیا کہ وہ ان کے پاس آ کر ٹھہریں۔ خورشید بتایا کرتے تھے کہ انگلستان میں قیام کے دوران محترمہ باقاعدگی سے خط لکھتی تھیں۔ کبھی کبھی کھانے کی چیزیں بھی بھجواتی تھیں۔خورشید بھی اپنی پڑھائی اور مصروفیات سے انہیں آگاہ کرتے۔دونوں کا ماں بیٹے کا مقدس رشتہ تھا۔خورشید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے برصغیر کے سب سے بڑے لیڈر کے ساتھ ملک کی آزادی کے لیے کام کیا۔انہوں نے خورشید کو گھر کے فرد کی حیثیت دی جوان کی زندگی کا بہترین سرمایہ تھا۔

انگلستان میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ بحیثیت سیکرٹری ان یادداشتوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ قائداعظمؒ پر ان یادوں کے حوالے سے تحریکِ پاکستان کے پرو قار دور کے متعلق کتاب لکھیں گے۔افسوس ہے کہ وہ تحریریں کبھی ان کی زندگی میں کتاب کی شکل میں نہ آسکیں۔زندگی کی مصروفیات' مشکلات' تگ ودو اور ذاتی صدمے کی وجہ سے شاید یہ ممکن نہ ہو سکا۔حالانکہ ان کے حوالوں سے ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے۔جنہیں خورشید ذاتی طور پر جانتے تھے اور جن کے تاثرات وہ قائداعظمؒ کی سوانح حیات میں لکھنا چاہتے تھے۔ایسے لوگوں میں اس دور کے چوٹی کے

امریکن اور برطانوی جرنلسٹ بھی شامل ہیں ۔مثلاً

Prestan Grover of the Associated Press, Percy-wood of the Chicago Tribune, Margeset, Bourke White "Life Photographer"

اس کے علاوہ امریکہ، انگلینڈ اور ہندوستان میں بے شار سیاسی لوگوں کو جانتے تھے ۔مشرقِ وسطیٰ میں نحاس پاشا اور مفتی اعظم فلسطین سے بھی ذاتی واقفیت تھی لیکن افسوس وہ ایسا نہ کر سکے۔

ان کی بے وقت موت کے بعد میرے بھائی خالد حسن نے ان ادھ لکھے نوٹس اور تحریروں کو ان کی تحریر میں ہی ("Memories of Jinnah") کے نام سے Oxford Law Press سے چھپوایا۔ یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی اور دنوں میں بک گئی ۔کاش! خورشید اس تحریر کو مزید تفصیل سے لکھ سکتے۔

کراچی میں انہوں نے لاء کی پریکٹس شروع کی۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں آزاد کشمیر کی صدارت کی پیشکش ایوب خان نے کی۔ خورشید نے محترمہ فاطمہ جناحؒ سے مشورہ کیا۔ وہ ایوب خان کو پسند نہیں کرتی تھیں نہ اس کی کسی آفر پر زیادہ مطمئن تھیں لیکن انہوں نے کہا کہ تمہارا ملک ہے' تمہارے لوگ ہیں ۔شائد تم ان کے ساتھ کچھ کر سکو اور کشمیر کے مسئلے کے لیے بھی بہتری ہو۔''

اس میں شک نہیں کہ وہ پہلے صدر آزاد کشمیر تھے جنہوں نے حکومت کو وقار دیا ایک حیثیت دی اور اپنے سے پہلے حکمرانوں کی طرح کبھی پاکستان حکومت کے کسی اعلیٰ افسر یا وزیر کو لینے کوہالہ نہیں گئے ۔انہوں نے صدرِ آزاد کشمیر کا وقار بحال رکھتے ہوئے اس امر کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر عمل بھی کیا۔ افسر شائد پہلے جیسے صدروں کے عادی تھے ۔کوئی وقت پر دفتر نہیں جاتا تھا۔لیکن جب خورشید ہر صبح 8 بجے دفتر پہنچتے تو سب نے باقاعدگی سے آنا شروع کر دیا۔ جن دنوں مظفر آباد سے باہر رہتے ۔آزاد علاقے یا پاکستان

کے دورے پر جاتے ۔ ان دنوں کے علاوہ وہ ہر روز باقاعدہ دفتر جاتے ۔ یہ ایک ریت تھی جو اس سے پہلے کسی صدر نے نہیں اپنائی تھی ۔

ان سے پہلے آزاد کشمیر میں تعمیر و ترقی کے منصوبوں پر زیادہ عمل نہیں ہوتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک مقبوضہ کشمیر ریاست میں شامل نہیں ہو جاتا' ان باتوں کی اتنی اہمیت نہیں ۔لیکن خورشید نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت آزاد کشمیر کی ترقی کا ایک منصوبہ بنایا۔ بجٹ بنایا۔ اور 5 سالہ ترقیاتی منصوبہ بنا کر حکومتِ پاکستان سے اس کے لیے رقم حاصل کی ۔ ان کی زیادہ توجہ تعلیم' صحت اور ذرائع آمدورفت کی بہتری پر مرکوز رہی ۔ ایسے کئی منصوبے اہم تھے ۔ آزاد کشمیر کے دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں ذرائع آمدورفت بہت غیر تسلی بخش تھے ۔ ڈوگرہ دور میں بھی یہ علاقہ پسماندہ تھا اور کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی ۔

خورشید نے مخالفت کے باوجود نیلم ویلی روڈ کا ایک منصوبہ بنایا جو 1972ء میں مکمل ہوا ۔ہجیرہ اور عباس پور روڈ بنوائی ۔ حالانکہ اقوامِ متحدہ کے ممبروں نے بھی اس کی مخالفت کی لیکن خورشید اپنی بات پر ڈٹے رہے اس لیے کہ اس میں عوام کی سہولت اور آسانی تھی ۔

مظفر آباد میں نیلم سٹیڈیم کی تعمیر' مارکیٹ کی تعمیر اور کونسل ہال کی تعمیر ان کے دور میں ہوئی ۔ بے شمار ہائی سکول اور پرائمری سکول بنے۔ ہر چھوٹی جگہ میں ڈسپنسری بنی۔ **اٹھمقام** جیسے دور افتادہ مقام پر بھی ایک ہائی سکول بنا اور ایک جدید ہسپتال کی تعمیر ہوئی ۔ لیپا وادی کی سڑک بھی ان کے دور میں بنی ۔ آزاد کشمیر کے ہر شہر اور گاؤں میں تعلیمی اور طبی سہولتیں مہیا کی گئیں ۔

ثقافت کے میدان میں خورشید کی خدمات قابلِ تعریف رہی ہیں ۔ آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد اسی دور میں قائم ہوا۔ قائد اعظمؒ سوسائٹی' اقبال ڈے اور مشاعرے اسی دور کی یادگاریں ہیں' جن کا اب ذکر بھی نہیں ملتا۔ کھیل کے میدان میں ان کی کوششیں ناقابلِ

فراموش ہیں: آزاد کشمیر اور آل پاکستان **چیلنج** کپ ٹورنامنٹ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں پاکستان کے کالجوں کے طلبا باقاعدہ آکر حصہ لیتے۔ **مظفر آباد کی فضاؤں میں رونقیں بس جاتیں**۔ جن کا اب کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ شاعروں میں پاکستان کے چوٹی کے شاعر مظفر آباد آتے اور لوگوں کو تفریح کے ساتھ میل جول کا بھی موقع ملتا۔

لیکن ان سب باتوں سے زیادہ خورشید نے حکومت اور لوگوں کو جمہوریت سے روشناس کروایا۔ چونکہ وہ جمہوریت کے دلدادہ تھے۔ قائداعظمؒ کی صحبت میں سیاست کا سبق پڑھا تھا اس لیے جمہوری اندازِ فکر ہی ان کی سوچ تھی۔ ایوب خاں کے زمانے میں ہی دوسری بار بنیادی جمہوریت کے تحت آزاد کشمیر میں الیکشن ہوئے۔ اور وہ دوبارہ صدر بنے۔ 1962ء میں انہوں نے اپنی سیاسی پارٹی لبریشن لیگ قائم کی۔ مقصد آزاد کشمیر کو پوری ریاست کی حیثیت سے تسلیم کروانا شامل تھا۔ جسے بدقسمتی سے ان کی کوشش کے باوجود کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حالانکہ کئی ملک آزاد کشمیر کی حکومت کو یکجا کرنے کے لیے تیار تھے لیکن پاکستانی حکومت اس کے لیے تیار نہ تھی۔

آزاد کشمیر کونسل انہوں نے تشکیل دی۔ جس میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے نمائندے یکساں موجود ہوتے ہیں اور اسلام آباد میں اس کی نشستیں ہوتی ہیں۔ پاکستان اور آزاد کشمیر دونوں کی شمولیت سے ملک کا نظم و نسق چلانے میں آسانی ہوتی ہے۔ آزاد کشمیر اسمبلی کے باقاعدہ الیکشن بھی ان کی محنت اور لگن کی وجہ سے ہوئے۔ جہاں خود انہوں نے ہمیشہ Leader of the Opposition کا کردار ادا کیا اس لیے کہ وہ کبھی نہ بکے اور کبھی غلط سمجھوتہ نہیں کیا۔

آزاد کشمیر کے طول و عرض میں ابھی تک خورشید کا چھ سالہ دور یاد کرتے ہیں جہاں صرف دو کمروں کے ایوانِ صدر میں ہم نے 6 سال گزارے۔ گارڈ اور فالتو نوکر واپس کر دیئے۔ سامان گیسٹ ہاؤس میں پہنچا دیا اور مختصر لیکن پروقار حالات میں زندگی گزاری۔

صدارت کے دوران ایوب خان سے ان کے **اختلافات** پیدا ہوئے جن میں منگلہ ڈیم کے متاثرین' سندھ طاس معاہدہ اور انتظامی **معاملات** میں حکومتِ پاکستان کی مداخلت تھی۔ اس لیے صدارت کے تقریباً چار سال باقی ہونے کے برعکس بھی خورشید نے استعفیٰ دے دیا۔

خورشید نے واپس کراچی جا کر پھر پریکٹس شروع کی۔ کچھ عرصے کے بعد لاہور آ گئے۔ اس لیے کہ آزاد کشمیر اور اپنے لوگوں سے لاتعلق نہیں تھے۔ پاکستان کے حالات سے بھی کبھی لاتعلق نہیں رہے۔ ہر دور میں اپنا کردار ادا کیا۔ مشرقی پاکستان کی سیاسی صورت حال پر اتنے پریشان تھے کہ خود ڈھاکہ گئے۔ مجیب الرحمٰن سے ملے۔ یہاں حکومتِ پاکستان کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ لیکن کوئی یہ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ آدھا ملک ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا۔ MRD کی تحریک میں بھی پیچھے نہ رہے۔ ہر دو میں ہر سٹیج پر پاکستان کی بہتری اور محبت عزیز رہی۔ وہ جانتے تھے کہ کشمیر اور پاکستان ایک دوسرے کے لیے اہم ہیں۔ پاکستان کی سلامتی اور کشمیر کا الحاق لازم اور ملزوم ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ کے صدارتی الیکشن میں بھرپور حصہ لیا۔ 1984ء اور 1986ء میں انہوں نے انگلینڈ اور امریکہ کا دورہ کیا۔ کشمیر کے مسئلے پر لندن میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں بھی شریک ہوئے مختلف تنظیموں اور اداروں کے سربراہوں سے ملے۔ کشمیر کے نازک مسئلے کے بارے میں سب کو بتایا۔ 1986ء میں ہی ہرارے میں غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں اپنی ہی کوشش سے شریک ہوئے۔ یہاں شریک دنیا بھر کے نمائندوں کو کشمیر کے سلگتے ہوئے اور سنگین مسئلے پر خود لکھ کر ایک یادداشت پیش کی۔ بھارت کا نمائندہ بھی انہیں دیکھ کر بوکھلا گیا۔ خود جنرل ضیاء الحق بھی دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ یہ کیسے وہاں آ گئے۔ اہلِ پاکستان سے محبت اور کشمیر سے وابستگی ان کا ایمان تھا۔ اس کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ کبھی صلہ نہ مانگا۔ کبھی کرسی کی خواہش نہ کی۔ کبھی اقتدار کی ہوس نہ کی۔ ایک **ملکن** کے طور پر زندگی کے

آخری لمحوں تک اپنا سفر جاری رکھا۔ شائد اس لیے اپنے مشن نہ پا سکے کہ ان کے پاس کوئی سرکاری یا سیاسی عہدہ نہیں تھا۔ اپنے طور پر اپنے وسائل میں سب کچھ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی مثال خورشید کی کٹھن لیکن عملی زندگی میں ملتی ہے۔ جس پر ہمیں فخر ہے۔

جس سال خورشید 3 جنوری کی ایک یخ بستہ صبح کو سرینگر میں پیدا ہوئے سردیوں کی پہلی برف باری ہوئی تھی۔ ان کی پیدائش پر ساری وادی سفید شفاف برف سے ڈھک گئی تھی۔ بالکل ان کی زندگی کی طرح صاف وشفاف' قدرت کی طرف سے یہ ایک پیغام تھا۔

خورشید کی ساری زندگی پاکستان سے محبت کی کہانی ہے۔ ان قدروں کی کہانی ہے جس سے وہ کشمیر کا الحاق پاکستان سے چاہتے تھے' اس عہد کی کہانی ہے' جس سے وہ پاکستان کو قائداعظم کا پاکستان دیکھنے کے متمنی تھے' جو روائتی قدروں اور عزم سے بھرپور ہو اور اپنے ملک کے خوبصورت سبزہ زاروں' بہتے چشموں' سر بفلک پہاڑوں' گنگناتی آبشاروں اور پرسکون وادیوں کو دیکھنے کی خواہش کی خوبصورت کہانی ہے۔

میرے بڑے بھائی بریگیڈیئر بشیر احمد' کرنل سعید احمد اور مشہور صحافی خالد حسن سے خورشید کی بہت دوستی تھی' بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ میرا چھوٹا بھائی مسعود حسن ایڈورٹائزنگ (Advertising) کے شعبے سے بڑی کامیابی سے منسلک ہے۔ خورشید بہت ہی قریب تھے اور بڑی محبت فرماتے تھے۔ آزاد کشمیر کی صدارت کے دوران مسعود حسن حسن ابدال میں اپنے سکول سے چھٹیاں گزارنے ہمیشہ مظفرآباد آتا تھا۔ وہ ملٹری کالج حسن ابدال کے پہلے بیچ میں داخل ہوا اور کئی سال وہاں گزارے۔

خالد حسن نے جب اپنی سرکاری نوکری صحافت کے لیے چھوڑی تو میرے ابا جان پریشان ہوئے۔ لیکن خورشید نے انہیں کہا کہ خالد میں بڑی صلاحیت ہے۔ انشاءاللہ وہ صحافت میں بہت چمکے گا آپ پریشان نہ ہوں اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

☆☆☆

باب اول
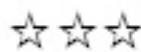
خورشید میری نظر میں

خورشید نے ساری زندگی ہی مصروف گزاری۔ ہزاروں کام تھے کرنے کو جنہیں وہ نہایت ٹھنڈے دل اور متانت سے نبھاتے تھے، کبھی ماتھے پر شکن نہ لاتے۔ کبھی کام کی زیادتی سے چڑچڑے پن کا مظاہرہ نہ کیا۔ کبھی گھر والوں کو بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ گھر میں جتنا وقت گزارتے' نہایت پرسکون گزارتے۔ گویا انہیں فرصت سب سے زیادہ ہے۔ ذرا ذرا سی بات میں دلچسپی لیتے۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے مسائل کا بھی دھیان رکھتے۔ خریداری کا بہت شوق تھا۔ گھر کے افراد کی سہولت کا بھی انہیں بہت خیال تھا۔ ہر ایک کی پسند کی چیزیں لاتے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی دلچسپی سے خریدتے۔ گوشت، سبزی فروٹ خریدنے میں بھی نہایت شوق کا مظاہرہ کرتے اور شاید ہم سب سے اچھا خریدتے۔ اچھا کھانا کھانے کا نہ صرف انہیں بہت شوق تھا بلکہ دوسروں کو کھلانے سے بھی اتنا ہی خوش ہوتے تھے۔ بچپن میں زیادہ وقت بہن بھائیوں کی صحبت میں گزرا تھا۔ والدہ بہت عمدہ کھانا پکاتی تھیں۔ چونکہ گھر میں زیادہ لڑکے تھے' اس لیے انہیں بھی یہ شوق چرانا تھا کہ والدہ کو پکاتا دیکھیں۔ بارہا جب اپنے بچپن کا ذکر کرتے تو گلگت کے ان ایام کو کبھی نہ بھولتے جب سب بہن بھائی اکٹھے تھے۔ کہا کرتے تھے ہم تو بچپن سے ہی یہ سب دیکھتے آئے ہیں۔ باجی جان (اپنی والدہ کو کہتے تھے) آئس کریم، نانی، کیک، پیسٹری، ٹکڑی حلوہ، سوڈا واٹر، گلاب جامن، بریانی، روسٹ لیگ اور مرغی وغیرہ نوکروں کی مدد سے خود بناتی تھیں اور نہایت عمدہ بناتی تھیں۔ کھانے میں خورشید کا ذوق اتنا زیادہ نفیس تھا کہ ہمیشہ بتا دیتے تھے کہ اس کھانے میں نمک بعد میں پڑا ہے اور یہ سالن لکڑی کے چمچ سے نہیں بلکہ سٹیل کے چمچ سے ہلایا گیا ہے۔ ان کا سختی سے حکم تھا کہ کھانا لکڑی کے چمچ سے ہی

پکایا جائے اور دیگچی کی بجائے مٹی کی ہانڈی استعمال ہو اور دیگچی ہو تو وہ تانبے کی قلعی شدہ ہو۔

اس شوق کے باوجود نہایت سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ بعض اوقات بالکل سادہ کھانا بھی نہایت شوق سے کھاتے تھے۔ گوشت اور مرغن کھانوں سے پرہیز کرتے۔ آپ کئی سالوں سے رات کا کھانا اکثر باقاعدگی سے نہیں کھاتے تھے۔ صرف خشک ٹوسٹ اور دودھ کی پیالی پر اکتفا کرتے لیکن اگر یہاں ہوں یا خود کہیں جائیں تو کھا لیتے تھے۔ ڈاکٹروں سے بھی الرجک تھے۔ خدا کے فضل سے صحت ہمیشہ قابلِ رشک رہی لیکن کبھی دوا کی ضرورت پڑتی تو کوشش کرتے کہ دوا استعمال نہ کریں۔ ہمدرد والوں کی دوا کو ترجیح دیتے یا حکیم کی دوا کا استعمال کرتے۔ کبھی گلہ خراب ہوتا یا کھانسی زکام کی شکایت ہوتی تو ہمیشہ قہوہ پیتے۔ (کرنل ڈاکٹر رشید خورشید کے بڑے بھائی) تو مذاق میں کبھی کبھی انہیں "حکیم صاحب" کہا کرتے تھے۔

خورشید کو ان کے بے تکلف دوست "کے ایچ (K.H)" اور ان کے مداح اور قوم انہیں خورشیدِ ملت کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ایک مکمل انسان تھے۔ جب انہیں فرصت ہوتی، وہ پورا وقت گھر میں ہم سب کے ساتھ گزارتے۔ ہر بات میں دلچسپی لیتے۔ انہیں ہر ایک کی رائے کا احترام تھا۔ وہ کبھی اپنی رائے کسی پر مسلط نہیں کیا کرتے تھے۔ بچوں سے انہیں بہت محبت تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہیں اپنے لیے بوجھ نہیں بنایا۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ اپنی نیت ٹھیک ہو، جذبہ ہو، زندگی کا کوئی مقصد ہو تو ناکامیاں بھی انسان کو افسردہ نہیں کرتیں۔

ان کے مداح، ان کے عوام نے ان کے لیے اتنا کچھ کیا ہے' اتنا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے' اتنے محبت کے پھول نچھاور کیے ہیں کہ گھر والوں کی رائے قوم کے ایسے قابلِ فخر فرزندوں کے لیے اہم نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ تو عوام اور ملک کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی رائے اور احساسات غالباً زیادہ اہم ہوتے ہیں لیکن وہ ایک بہترین شوہر اور ایک بہترین باپ، ایک بہترین بیٹے اور ایک بہترین بھائی تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے

کسی سلسلے میں زبردستی کوئی بات منوائی ہو۔ وہ بنیادی طور پر جمہوریت کے پرستار تھے۔ جمہوریت کو ہر چیز پر فوقیت دیتے تھے اور ان کی یہ خاص صفت ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی عیاں تھی۔ جمہوریت کے ذکر سے یاد آیا کہ شادی کے بعد جب ہم نے گھر کا فرنیچر بنوایا تو خورشید صاحب نے ایک عجیب وضع کی میز کا آرڈر دیا۔ کھانے کی اس میز کا ڈیزائن بہت مختلف ہے۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ یہ ڈیموکریٹک ٹیبل ہے۔ اس کا ہیڈ کوئی نہیں۔ واقعی اس میز سے قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ Head of the Table کون ہے؟ گویا یہ میز جمہوریت کی علامت ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے اور مجھے فخر ہے کہ ان کی ساری زندگی ''تکمیلِ پاکستان'' کی جدوجہد سے عبارت تھی۔ یکم اکتوبر 47ء کو تقریباً ساڑھے تین سال قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر وقت گزار کر جس مشن کے لیے وہ سری نگر آئے اسی مشن کے حصول کے لیے انہوں نے 11 مارچ 88ء کو اپنے وطن کی ایک تھرڈ کلاس فلائنگ کوچ میں سفر کرتے ہوئے سڑک پر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

وہ عوام کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ عوام ہی ہماری طاقت ہیں۔ عوام ہی ہمارے سارے مسائل کا حل ہیں۔ ہر تحریک کی تکمیل عوام سے ہی ممکن ہے۔ کہا کرتے تھے کہ قائداعظمؒ نے بھی عوام کے تعاون اور جذبے سے حصولِ پاکستان کی تحریک چلائی تھی ان کٹھن حالات میں جب انگریزوں کے علاوہ ہندو کانگرس اور نیشنلسٹ رجحانات رکھنے والے مسلمان بھی ان کی بھرپور مخالفت کرتے تھے۔

جس لگن اور محنت سے انہوں نے 18 سال کی عمر میں کام شروع کیا، اسی محنت اور جذبے سے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک کام کرتے رہے۔ ہمیشہ رزق حلال کمایا۔ آزاد کشمیر کی سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ زیادہ تر لاہور سے باہر رہتے تھے اور جب وہ چند گھنٹوں کے لیے بھی لاہور اپنے مقدمات کی پیروی کرنے آتے تو ایسی عجلت میں کہ ان کے آنے پر جب میں کچھ کہتی تو مسکرا کر جواب دیتے ''پہلے بھی یہ کیس ملتوی کروایا گیا تھا،

اب نہیں ہوسکتا۔ ویسے گھر کا خرچ بھی تو چلانا ہوتا ہے، تم تو جانتی ہو"۔ یہ بات میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی کہ انہیں غمِ روزگار سے کبھی فرصت حاصل نہیں ہوئی۔ باعثِ فخر یہی تھا لیکن جب سیاست کا اتنا بوجھ ان پر ہوتا تو مجھے بار ہا خیال آتا کاش! انہیں روزی کمانے کی اتنی فکر تو نہ ہو۔ وکالت اور سیاست دونوں محنت طلب کام ہیں۔ اور خورشید نے یہ دونوں ذمہ داریاں نہایت عمدہ طریقے سے نبھائیں اور کبھی ان ذمہ داریوں کو بوجھ نہیں سمجھا لیکن یہ تو ان کی فطرت تھی کہ وہ رزقِ حلال کو ہی اپنے لیے بہتر سمجھتے تھے۔

انہوں نے انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران بھی بی بی سی (BBC) میں ایک عرصہ تک کام کیا۔ Deony Kaye جو اپنے وقت کا ایک مشہور ہالی ووڈ سٹار تھا' کے ساتھ مل کر کئی پروگرام پیش کیے۔ ساری زندگی محنت کی اور خوشی سے کی۔ انہیں اپنا کام کر کے بڑی راحت ملتی تھی۔ اپنے بہن بھائیوں سے انہیں بہت پیار تھا۔ جب وقت ملتا' ان کے پاس جاتے، انہیں اپنے پاس بلاتے۔ یہ سب نہایت بے تکلفی سے آپس میں باتیں کرتے لیکن خورشید صاحب سے بہت قرب اور محبت کے باوجود ذاتی سوال کرنے سے گریز کرتے۔ کچھ ان کا لحاظ تھا، پھر سب جانتے تھے کہ وہ اپنے متعلق کبھی زیادہ باتیں نہیں بتاتے اور سیاست اور قائداعظمؒ کے ساتھ اپنے ایام کا تو انہوں نے کبھی گھر میں ذکر بھی نہیں کیا۔ اگر کبھی بات ہوتی تو سرسری ذکر کیا کرتے۔ گویا وہ اتنے اہم نہ ہوں۔ ایک بار ان کی بہن نیلوفر نے ان سے پوچھا کہ چار سال قائد کے ساتھ رہ کر آپ کی ان کے ساتھ کوئی الگ تصویر نہیں۔ آپ کو تو کئی مواقع ملے ہوں گے۔ پھر آپ نے اکٹھے تصویر کیوں نہیں اتروائی؟ کہنے لگے۔ "قائداعظمؒ کو سستی شہرت پسند نہیں تھی۔ اپنے ساتھ خاص طور پر تصویر اتروانا بھی انہیں پسند نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کبھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی"۔ رحمٰن ظفر (خورشید کے چھوٹے بھائی، سابق صدر شعبۂ باٹنی، گورنمنٹ کالج' لاہور) سب سے زیادہ ان سے بے تکلف تھے۔ جنوری 88ء میں جب

آزاد کشمیر میں سیاسی بدامنی اور حکومت کے خلاف تحریک کے سلسلے میں وہ بہت مصروف تھے تو ایک روز انہوں نے کہا ''مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے کہ آپ اکیلے ہی ملک کے لیے لڑ رہے ہیں''۔ انہوں نے مسکرا کر بات ٹال دی اور کہنے لگے۔ ''کیا کروں۔ اب ایک ذمہ جو اٹھایا ہوا ہے''۔ انکساری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ اکیلے نہیں بلکہ کہتے تھے کہ ان کے بے شمار ہم وطن ان کے ساتھ ہیں اور ان کے ایک اشارے پر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اس تحریک کے دوران میں نے بھی ایک ایسا ہی سوال ان سے کیا تھا ''میں جانتی ہوں، آپ غلط باتوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ سودا بازی بھی نہیں کر سکتے۔ پھر آپ کی برادری نہیں، جاگیر نہیں، آخر یہ جنگ کیسے لڑیں گے۔ میں بہت فکرمند رہتی ہوں۔ آپ اتنے اتنے روز گھر سے باہر رہتے ہیں، گھر کا آرام نہیں ملتا۔ اپنی مرضی کے مطابق کھانا نہیں ملتا۔ اتنی تکلیف آخر کیوں کرتے ہیں؟'' کہنے لگے کام تو کرنا ہی ہے۔ ایک مقصد ہے زندگی میں، ایک نصب العین ہے، ضروری نہیں میری مرضی یا خواہش کے مطابق سب کچھ ہو جائے لیکن میں پیچھے بھی تو نہیں ہٹ سکتا۔''

ایک روز رحمٰن ظفر نے ان سے ملک کے سیاسی حالات کے متعلق پوچھا۔ ملک کے حالات سے مایوس رہتے تھے۔ کہنے لگے ''دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر نے اپنے جرنیلوں کی بات نہیں مانی تو نازیوں کو شکست ہوئی۔ پاکستان میں جرنیلوں نے سیاست دانوں کو یکسر فراموش کر دیا ہے اس لیے حالات ایسے ہو گئے ہیں''۔

رحمٰن ظفر اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ایک سال سردیوں میں ساری فیملی سری نگر سے جموں جا رہی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ ابا جی، باجی جان اور چھوٹے موٹر میں جائیں گے اور خورشید صاحب، نوکر اور بڑے بچے بس میں ایک روز پہلے جموں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ جس روز انہیں جموں روانہ ہونا تھا، تیار ہو کر چھوٹے بچوں سے حسب

عادت کھیلنے لگے۔ سب کا دل چاہ رہا تھا کہ ابا جی اور باجی جان کے ساتھ کوئی موٹر میں نہ جائے بلکہ بس کے ذریعے خورشید صاحب کے ساتھ سب جائیں۔ شاید انہیں چھوٹے بہن بھائیوں کے اس اشتیاق کا پتہ چل گیا تھا۔ جب تک وہ گھر سے لے کر اڈے پر نہ گئے، سب بچوں سے کھیلتے رہے۔ انہیں ہنساتے رہے، ان کا دل لگاتے رہے۔ سوچنے والی بات ہے کہ ایک اٹھارہ سال کا لڑکا کئی گھنٹے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اتنی خوشی سے کیسے کھیل سکتا ہے۔ گویا وہ بھی ان کی طرح ہی لطف اندوز ہو رہا ہو۔

رحمٰن ظفر یہ بتاتے ہیں کہ میرے اس بھائی میں کوئی خاص بات تھی' کوئی خاص کشش تھی۔ بڑے آدمی تو وہ بعد میں بنے' مشہور تو بعد میں ہوئے۔ بچپن میں بھی وہ سب سے مختلف تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں کی خواہش ہوتی تھی کہ ہم ہی ان کا کام کریں۔ اس بات پر آپس میں ہماری تکرار ہوتی تھی کیونکہ ہر کوئی ان کا کام کرنا چاہتا تھا اور ان کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی خورشید صاحب نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر اور اورینٹ پریس کے نمائندے کے طور پر کام کرنا شروع کیا تو شام کو بعض اوقات دیر سے گھر آتے تھے۔ باجی جان ان کے انتظار میں باہر بالکونی میں بیٹھی رہتی تھیں۔ پیار سے انہیں ''سہو'' کہا کرتی تھیں اور لاڈ کرتے ہوئے بار ہا یہ بھی کہتی تھیں ''میرا یہ بیٹا بڑا آدمی بنے گا۔ منسٹر بنے گا۔''

رحمٰن ظفر نے یہ بھی بتایا کہ سکول کے دنوں میں ہی خورشید صاحب اور ان کے بڑے بھائی امین شمیم جن کا سری نگر میں 18 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا' مل کر ایک اخبار نکالتے تھے۔ دونوں بھائی رات دیر تک ہاتھ سے اخبار لکھتے۔ دو صفحات ہر روز محلے کے ہر گھر کے باہر صبح چھوڑ آتے۔ انہوں نے اس کی قیمت ایک پیسہ رکھی تھی۔ اس میں محلے کی خبریں ہوتیں اور کئی دلچسپ باتیں بھی۔ ایک بار ان کی بڑی بہن ڈاکٹر رشیدہ جو خود بھی

ان دنوں زیادہ بڑی نہیں تھیں، کی ایک گڑیا کو انہوں نے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا اور صبح اپنے اخبار میں خبر دی کہ گڑیا کا آپریشن ہوا اور آپریشن کے دوران ہی چل بسی۔ رشیدہ آپا کو بھائیوں پر بہت غصہ آیا۔ انہیں ڈانٹا اور گڑیا کی توڑ پھوڑ پر خوب روئیں۔ کپڑے کی وہ خوبصورت گڑیا انہیں بڑی پسند تھی۔

گویا خورشید صاحب میں صحافت اور لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے ہی تھا جسے بعد میں انہوں نے بطور پیشہ بھی اختیار کیا اور لاہور سے ایک کامیاب ہفتہ وار رسالہ ''گارڈین'' نکالا اور لندن میں اپنی طالب علمی کے دوران یہاں کے مشہور اخبار ''گارڈین'' میں باقاعدگی سے مضمون بھی لکھتے رہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی جموں کے ''جاوید'' اخبار سے منسلک ہوئے جسے مسلم کانفرنس کے مشہور لیڈر اللہ رکھا ساغر نے جاری کیا تھا۔

صبح بہت جلدی بیدار ہوتے تھے۔ جب میری آنکھ کھلتی تو ریڈیو کی خبروں سے ہی کھلتی تھی۔ ہمارے گھر میں بے شمار اخبار آتے تھے۔ اخباروں کی چرچراہٹ کے ساتھ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز، یا خود کرتے یا باہر سے آتا۔ اس طرح ہماری صبح کا آغاز ہوتا تھا۔ بیڈٹی کے ساتھ ان کے یہ سارے کام صبح ہی شروع ہو جاتے تھے۔ چائے کے زیادہ شوقین نہیں تھے لیکن ہر بار سب کے ساتھ مل کر پیالی بناتے ضرور تھے جو زیادہ تر ویسے ہی پڑی رہتی تھی۔

خورشید بہت مصروف رہتے تھے۔ اپنی قانونی مصروفیات کے ساتھ سیاسی مصروفیات تو تھیں ہی' اس کے علاوہ ملک میں بے شمار تنظیموں کے ممبر اور عہدہ دار بھی تھے اور کبھی کبھی موقعہ ملنے پر ملک میں فلاحی کام میں مصروف کسی بھی ایسی تنظیم میں شرکت سے پیچھے نہ رہتے جو ان کے بس میں تھا۔ طلبہ کے اجتماع میں ضرور جاتے۔ جب کوئی خاص تقریب ہوتی تو وہ انہیں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کرتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کی تقریبات میں ہمیشہ شریک ہوتے۔ بعض اوقات بالکل وقت نہ ہوتا لیکن ان کے لیے وقت ضرور نکالتے۔ ہمیشہ کہتے ''جان! یہ لوگ ملک کا سرمایہ ہیں۔ ان کی

حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ ان میں بہت صلاحیت ہے''۔لاہور میں رہنے کی وجہ سے آزاد کشمیر کی سیاست کے لیے اکثر وہاں جانا پڑتا لیکن کبھی سفر کی تھکاوٹ یا قلتِ وقت کا شکوہ نہیں کیا۔ کچھ عرصہ سے وہ پنڈی منتقل ہونے کا سوچ رہے تھے۔ان کا خیال تھا کہ آزاد کشمیر کے قریب ہو جائیں گے' اس لیے آسانی رہے گی۔ پہلے اس لیے ایسا نہ سوچا کہ بچے لاہور میں پڑھتے تھے۔انہوں نے گھر والوں کے لیے،خرم کے لیے، دوسروں کے لیے کبھی اپنے آرام یا سہولت کی پروانہیں کی۔ بہت بے غرض اور بے لوث انسان تھے۔اپنی ذات کا انہوں نے کبھی نہ سوچا۔ زندگی بھر دوسروں کی بہتری ہی ان کے پیش نظر رہی۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک بھر پور زندگی گزاری۔ اس لیے کہ ان کا ایک مقصد تھا' ایک نصب العین تھا' ایک مشن تھا جس کے حصول کے لیے وہ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔تایا جی مرحوم سے جب کبھی میں نے خورشید کے متعلق پوچھاتو وہ ہمیشہ مسکرا کر بڑے دھیمے انداز میں بتاتے تھے کہ ''میرے اس بیٹے نے کبھی مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کی۔بچپن سے ہی اس میں خاص خوبیاں تھیں۔کبھی کسی بات پر پریشان نہیں کیا۔ پیسے نہیں مانگے۔ بنیادی ضروریات کا بھی مجھے تو یاد نہیں۔بس اپنی ماں سے اس کی زیادہ دوستی تھی۔اس سے کچھ کہتا ہوگا۔ مجھے تو کبھی یاد نہیں آتا کہ اس نے کچھ مانگا ہو یا کچھ کہا ہو۔ پڑھائی کے ساتھ دوسری سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں ۔ میں جانتا تھا لیکن اس نے کبھی کسی بات کے متعلق مجھے فکر مند نہیں ہونے دیا''۔لاہور میں تایا جی کی زندگی تک خورشید روزانہ شام دفتر جانے سے پہلے ان کے پاس جاتے تھے۔اگر اس وقت نہ جا سکتے تو دفتر سے واپسی پر جاتے۔لاہور سے باہر جانا ہوتا تو وہاں جانے میں ناغہ ہو جاتا حالانکہ ان سے کہہ کر جاتے لیکن پھر بھی روز ان کا انتظار رہتا اور اگر کبھی خورشید کو زیادہ دن لگ جاتے تو تایا جی مضطرب ہو جاتے۔ وہ بھی نہایت باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔انہیں زندگی کے آخری ایام تک پڑھنے کا شوق رہا۔باتیں نہایت عمدہ کرتے تھے اور یادداشت اتنی اچھی تھی کہ بچپن کی باتیں سب یاد

تھیں ۔بڑے دلچسپ قصے سناتے تھے ۔ان کے ساتھ بیٹھنے میں لطف آتا تھا۔کبھی کبھی چند روز کے لیے ہمارے ہاں آتے تھے۔گھر میں رونق ہو جاتی تھی لیکن کچھ دنوں کے بعد ہی انہیں واپس جانے کی جلدی ہوتی تھی ۔بہت باوقار اور عزت مند بزرگ تھے ۔ساری زندگی تعلیم کے محکمہ سے منسلک رہے ۔سری نگر میں انسپکٹر آف سکولز کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور قیامِ پاکستان کے بعد جہلم ملٹری کالج میں بھی لیکچر دیتے رہے ۔تایا جی مرحوم علم و ادب، شعروشاعری اور تنقید میں علم و دانش کا پیکر تھے۔مولانا رومی، حافظ، سعدی، اقبالؒ اور غالب سب پر ایک سند کا درجہ رکھتے تھے ۔خورشید کی ذات پر آپ کے والد صاحب کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا بہت گہرا اثر تھا۔خود بھی ان سب خوبیوں سے آراستہ تھے ۔

خورشید 3 جنوری 1924ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے ۔کہا کرتے تھے کہ اس سال کشمیر میں سخت سردی پڑی تھی لیکن وقت پر برف نہیں پڑی تھی اور جب وہ پیدا ہوئے ، سارا شہر، ساری وادی برف کی سفیدی سے ڈھکی ہوئی تھی ۔ان کی ساری زندگی ان کی پیدائش پر پڑنے والی برف کی طرح تروتازہ، شاداب اور پاک صاف تھی ۔ ابتدائی تعلیم سری نگر اور اسلام آباد سے حاصل کی ۔پھر ایس پی کالج سے ایف اے بعد ازاں امر سنگھ کالج سے بی اے کیا۔ اپنی طالب علمی کے دن انہیں اکثر یاد آیا کرتے تھے ۔ایس پی ہائی سکول اور ایس پی کالج کا بہت ذکر کیا کرتے تھے۔ چند ماہ پیشتر 'سری نگر ٹائمز' کا ایڈیٹر پاکستان آیا اور ان کا انٹرویو لیا۔طویل انٹرویو کے بعد اس نے پوچھا ''کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کشمیر جائیں'' ۔ کہنے لگے ''نہیں، ان حالات میں دل نہیں چاہتا جب وہاں کے سیاسی حالات ایسے ہیں ۔حالانکہ یوں تو بہت دل چاہتا ہے کہ وہاں جاؤں، اپنے دوستوں سے ملوں، ان راستوں کو دیکھوں ۔ایس پی ہائی سکول اور ایس پی کالج کے کونے کونے میں گھوموں جہاں تعلیم کے اتنے سال گزارے لیکن ایسے نہیں ۔''

سیاسی حالات کے پیشِ نظر وادی کے رہنے والوں اور اپنے سارے ہم وطنوں

کے لیے وہ بہت حساس تھے۔ انہیں اس دن کا انتظار تھا جب کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت ملے گا اور وہ اپنے ملک اور تقدیر کا فیصلہ خود کریں گے۔ ساری زندگی ان کا مشن یہی رہا۔ افسوس وہ یہ دیکھ نہ سکے۔ ایک بات تو وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''میں چاہتا ہوں کہ کشمیریوں کا اپنا ایک وقار ہو، عزت ہو، ایک مقام ہو اور انہیں اپنے ملک کے متعلق فیصلہ کرنے کا خود حق ہونا چاہیے''۔

خورشید شروع سے ہی بہت ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی کشمیر مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے بانی سیکرٹری جنرل بن گئے۔ اس فیڈ ریشن کے صدر احمد اللہ رعنا تھے۔ دیگر ارکان میں میر عبد العزیز، غلام دین دانی، اور خواجہ حبیب اللہ ککرو تھے۔ خورشید ریاست میں اورینٹ پریس آف انڈیا کے نمائندے بھی تھے۔ ملک کے اکثر جرائد اور اخبار نویس ان کے انٹرویو لیتے رہتے تھے۔ حکومتِ پاکستان نے تو اس کی کبھی ضرورت نہ سمجھی کہ بابائے قوم حضرتِ قائداعظمؒ اورتحریکِ پاکستان کے متعلق جو خزانے ان کے سینے میں مدفون ہیں، جو چشم دید واقعات وہ جانتے ہیں' ان کے متعلق سرکاری طور پر ان سے انٹرویو لیے جائیں تاکہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رہیں۔ آنے والے دنوں کے لیے ریکارڈ رہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ خورشید حقیقت اور سچائی سے کبھی نہیں ہٹے۔ وہ جو کہتے' اس کا ایک ایک لفظ صحیح ہوتا' سچ ہوتا' تاریخ ہوتا' ایک دور ہوتا۔ لیکن حکومت کے سربراہ اور دوسرے اعلیٰ افسرانِ مجاز کبھی دور کی نہیں سوچتے' اپنی ذات سے باہر نہیں نکلتے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ ایسی عاقبت نااندیشی کے وجہ سے تاریخ سے انصاف نہیں کر رہے۔ خورشید کو خود زندگی میں وقت نہ ملا کہ وہ ان ایام کی یادداشتوں کو کتابی شکل دیتے۔ میرا اور ان کے قدر دانوں اور دوستوں کا ان سے بار ہا اصرار ہوتا تھا کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ وقت گزر رہا ہے اور اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے یاد ہے، قاضی عیسیٰ اور مطلوب الحسن سید جو تحریکِ پاکستان کے نامور فرزند تھے اور مسلم

لیگ کے خاص ورکر بھی تھے، بارہا خورشید کو کہتے تھے کہ وہ قائداعظمؒ کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کو کتاب کی شکل دیں ۔ ان کا ارادہ تو تھا۔ ان کی ڈائریاں اور تحریریں سب محفوظ پڑی ہوئی تھیں ۔ یہی کہا کرتے تھے'' ایسے کام کے لیے مکمل یکسوئی اور فرصت کی ضرورت ہے۔ آسان کام نہیں ۔ انشاءاللہ کروں گا جب میں محسوس کروں گا کہ میں کرسکتا ہوں''۔

کاش! وہ یہ کرسکتے ۔ اس سال ان کا ارادہ تھا کہ اکٹھے تین کتابوں پر کام کرنا شروع کریں گے جن میں سب سے اہم قائداعظمؒ کے ساتھ 1944ء- 1947ء کے تاریخ ساز زمانے کا ذکر ہوگا۔ ان ایام کی کہانی ہوگی جب پاکستان اتنی جدوجہد اور محنت سے دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آیا۔لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی ۔ وہ بہت جلد اوراچانک دنیا سے منہ موڑ گئے ۔ ان کی موت ان کے گھر والوں اور خاندان والوں کے لیے ذاتی صدمہ اورنقصان کے ساتھ ساتھ قوم کا بہت بڑا نقصان ہے ۔ ان میں اتنا کچھ کرنے کی صلاحیت تھی ۔ اتنا کچھ کرسکتے تھے لیکن قدرت نے مہلت نہ دی ۔معلوم نہیں اس میں قدرت کی کیا مصلحت ہے کہ ایک ایسا انسان جو نہ صرف اپنے گھر والوں کے لیے بلکہ قوم اور ملک کے لیے جیتا ہے، یوں بے وقت کیوں چلا گیا ۔

ٹی وی کے پاس تو ان کی کوئی ایسی تصویر بھی نہیں جو اس اندوہناک حادثے کی خبر سناتے وقت وہ لوگوں کو دکھا سکے ۔ Granada ٹی وی والوں نے جب End of the Empire بنائی تو خورشید کا تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں ایک طویل انٹرویو لیا۔ اس فلم کی تصویر ٹی وی والوں نے خبروں میں دکھائی ۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ شاید کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ خورشید کا کئی سالوں سے ٹی وی پر داخلہ ممنوع تھا۔ ہر سال جب قائداعظمؒ کی پیدائش کا ہفتہ ملک میں منایا جاتا تو ٹی وی پر ایسے ایسے لوگ قائداعظمؒ کے سلسلے میں آتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ کسی نے اگر کسی موقع پر قائداعظمؒ سے ہاتھ بھی ملایا تھا تو وہ بھی بہت فخر سے یہ بات کرتا ہے لیکن خورشید صاحب جیسا شخص جو ان اہم دنوں میں قائداعظمؒ

اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے اتنا قریب رہا، ان کو توٹی وی والوں نے کبھی مدعو نہیں کیا۔ قائد اعظمؒ کا جو قرب انہیں حاصل تھا' وہ تو سب جانتے ہیں۔ وہ نہ صرف قائد اعظمؒ کے پرنسپل سیکرٹری تھے بلکہ انہیں گھر کے فرد کا اعزاز حاصل تھا۔ قائد اعظمؒ کے ساتھ رہتے تھے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے لیکن خورشید صاحب نے خود کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے قائد اعظمؒ کے ساتھ ان کے اتنے قرب کا پتہ چلے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے ساری زندگی کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ میں نے قائد اعظمؒ کو یہ کہا یا قائد اعظمؒ نے مجھے یہ کہا۔ ویسے بھی وہ کہا کرتے تھے کہ سب سے غیر اہم نقطہ ہماری زندگی میں 'میں' ہوتا ہے۔

اگر وہ چاہتے تو قائد اعظمؒ کے ساتھ اس تعلق، اس قرب، اس شفقت کا بھرپور فائدہ اپنی ذات کے لیے اٹھا سکتے تھے لیکن وہ ان باتوں کو بہت چھوٹا اور کمتر سمجھتے تھے۔ خود کبھی انہوں نے قائد کے متعلق کوئی بات کسی کو نہیں بتائی' کبھی پبلسٹی نہیں کی حالانکہ اس دور میں انہوں نے اعلیٰ کارکردگی کا جو مظاہرہ کیا' اس کے بارے میں خود قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ ''پاکستان میری بہن، میرے سیکرٹری اور میرے ٹائپ رائٹر نے حاصل کیا ہے۔'' اور اس پر روزنامہ نوائے وقت کے مدیر اعلیٰ حمید نظامی مرحوم نے ایک ادارتی نوٹ میں 1959ء میں یہ لکھا تھا کہ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ سیکرٹری کے ایچ خورشید ہی تھے۔ اس دور میں وہ روزانہ 18 گھنٹے کام کرتے تھے۔ نہ دن کا پتہ چلتا تھا اور نہ رات کا۔ قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کے دوسرے اہم لوگ بھی اسی طرح مصروف تھے۔ پاکستان حاصل کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ صرف انگریزوں سے مقابلہ ہوتا تو شاید اتنا مشکل نہ ہوتا۔ یہ تو ہندو کانگرس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ بھی ایک مسلسل جنگ تھی جو ہر قیمت پر پاکستان حاصل کرنے کی جدوجہد میں مشکلات پیدا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک فرضی اور خوبصورت خواب کا تصور ہے جسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن قائد اعظمؒ کے تدبر، محنت اور ان کے ساتھیوں کی لگن سے ایک ناممکن بات حقیقت بن گئی۔ آل انڈیا

مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے جالندھر سیشن میں وہ پہلی بار قائداعظمؒ سے ملے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد قائداعظمؒ 1944ء میں کشمیر تشریف لائے۔ خورشید کی آزادی کے لیے جدوجہد' پرعزم حوصلہ اور وفاداری دیکھی تو ان کا انتخاب کیا اور اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ اسی سال لندن میں حکومتِ برطانیہ کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں بھی خورشید قائداعظمؒ کے ساتھ تھے۔ تحریکِ پاکستان کے بعد پہلے گورنر جنرل کے سینئر سیکرٹری بننے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔

خورشید اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ اپنی مسکراہٹ سے بھری باتوں سے دوست تو دوست سیاسی حریفوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا جس کے ثبوت میں ان کی وفات پر ہر کشمیری کی آنکھ آنسوؤں سے نم تھی۔ مرحوم زندگی کے آخری حصے میں کشمیری طلبا کی دو تنظیموں کشمیر لبریشن سٹوڈنٹس کانفرنس اور جموں وکشمیر لبریشن سٹوڈنٹس فیڈریشن کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے قبل یہ دونوں جماعتیں لبریشن لیگ کی طلبا تنظیم کی حیثیت سے مصروفِ جدوجہد تھیں۔

خورشید نومبر 1954ء میں انگلستان سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر کے واپس آئے اور کراچی میں مسٹر آئی آئی چندریگر کے جونیئر کی حیثیت سے وکالت شروع کر دی۔ ان کا قیام محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ تھا جو قائداعظمؒ کی وفات کے بعد فلیگ سٹاف ہاؤس میں رہائش پذیر تھیں۔ انہوں نے بہت اصرار سے خورشید کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کیا۔ میں بھی شادی کے بعد جنوری 1956ء میں وہیں گئی تھی۔ محترمہ کی محبت تھی کہ انہوں نے اپنے ساتھ ہمیں رکھا۔ فلیگ سٹاف ہاؤس کی کشادہ کوٹھی کے ایک طرف ان کا مہمان خانہ تھا جسے وہ اپنے آفس کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ وہ پورا حصہ انہوں نے ہمارے لئے خالی کروایا' اس میں ضروری تبدیلیاں کیں اور ہمیں ہر طرح سے آرام میں رکھا۔ ناشتہ کمرے میں آتا تھا لیکن کھانا ہم ان کے ساتھ ہی کھاتے تھے۔ میں تو صبح گیارہ بجے ان کے پاس

چلی جاتی تھی۔ چائے ان کے ساتھ پیتی تھی اور ان کی دلچسپ شخصیت سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ میرے لئے بھی یہ ایک بہت ہی انوکھا اور غیر متوقع تجربہ تھا۔ مادرِ ملت کا اتنا قرب اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہنا زندگی کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کم عمری میں تو یہ بالکل ایک افسانوی حقیقت لگتی تھی۔ ان کی ہر بات میں غور سے سنتی، تجسس سے ان کا چہرہ دیکھتی اور پھر بعد میں سوچتی کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ ان ہی دنوں کے یادگار لمحے میں نے اپنی ایک کتاب ''فاطمہ جناح کے شب وروز'' میں محفوظ کئے ہیں۔

وہاں کے قیام نے خورشید کی شخصیت کو اور جلا بخشی۔ ملک کے نامور لوگ ان دنوں وہاں آتے۔ تحریکِ پاکستان سے وابستہ اکثر لوگ ان دنوں زندہ تھے۔ وہ وہاں آتے' خورشید ان کے لئے اجنبی نہ تھے۔ وہ بھی اکثر کو جانتے تھے۔ ملک کے متعلق باتیں ہوتیں حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہوتیں اور محترمہ اپنے خیالات سے مستفیض فرماتیں۔ وہ دن ہم دونوں کی زندگی کے یادگار لمحے ہیں۔

وہیں قیام کے دوران جب ہم 1958ء کی گرمیوں میں مری گئے تو مسلم کانفرنس کی تحریک کے ایل ایم (Kashmir Liberation Movement) زوروں پر تھی۔ مسلم کانفرنس کے صدر چودھری غلام عباس بہت مصروفِ عمل تھے۔ خورشید بھی تمام اجلاسوں میں شریک ہوتے۔ کے ایل ایم تحریک کا مقصد آزاد کشمیر کی سرحد کو پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونا تھا۔ ظاہر ہے حکومت کبھی اس بات کی اجازت نہ دیتی۔ ایسی ہی ایک میٹنگ میں شریک ہونے خورشید پنڈی گئے اور وہیں فیصلہ ہوا کہ انہیں چناری کی طرف جلوس کی شکل میں جانا ہے۔ بارڈر پر پہنچنے سے پہلے ہی حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا۔ میں اپنی شیر خوار بچی کے ساتھ مری میں تھی' وہاں سے واپس آئی۔ خورشید چار ماہ تک گھوڑا گلی ریسٹ ہاؤس میں قید رہے۔ چند دن انہیں پنڈی میں رکھا اور پھر انہیں وہاں منتقل کیا گیا۔ خورشید ڈائری لکھا کرتے تھے لیکن باقاعدگی سے نہیں۔ میں انہیں ہمیشہ کہتی کہ وہ

ایسے اہم لوگوں سے ملتے ہیں' قوم اور ملک کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں' کشمیر کی سیاست میں پوری طرح ملوث ہیں' اگر باقاعدگی سے ڈائری لکھیں تو کل کو اسے کتاب کی شکل بھی دے سکتے ہیں لیکن انہوں نے یہ نہ کیا۔ کچھ عدیم الفرصتی بھی ایک وجہ تھی، پھر عادت بھی۔ کاش! وہ ایسا کرتے تو آج قوم کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہمارے پاس ہوتا۔ کاش! ایسا ہوتا۔

لیکن گھوڑا گلی ریسٹ ہاؤس میں انہوں نے باقاعدہ ڈائری لکھی۔ اس کے دو اقتباس یہاں درج کر رہی ہوں:۔

3 ستمبر 1958ء

''تین دن سے میں گھوڑا گلی ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہوں۔ مقیم شاید نہیں کہنا چاہتا' اس لئے کہ اپنی مرضی سے نہیں آیا بلکہ قید میں ہوں۔ جولائی میں جب کے ایل ایم کی تحریک کے سلسلے میں جلوس کی شکل میں ہم نے چکوٹھی کی سرحد کو پار کرنے کی کوشش کی تو حکومتِ پاکستان نے ہمیں روک لیا اور پولیس کی بھاری جمعیت میں راولپنڈی جیل پہنچا دیا گیا۔ میں اور میرے ساتھی ''آزادیٔ کشمیر'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ پاکستان اور حکومت ہند دونوں سے یہ گزارش تھی کہ اپنی فوجیں ہماری زمین سے نکال لیں اور کشمیر ''کشمیریوں'' کو دے دیں۔ پھر ہمارے لوگ جو فیصلہ کریں وہ ہی دراصل کشمیر کے مسئلے کا اصل حل ہوگا۔ یہ ''خود مختار'' کشمیر کا نعرہ نہیں بلکہ کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کا نعرہ ہے لیکن حکومتیں کب سمجھتی ہیں۔ تقریباً ایک ماہ شدید گرمی کے ساتھ پنڈی جیل میں گزرا۔ شکر ہے کم از کم ٹھنڈی جگہ کی جیل تو اب نصیب ہوئی۔

اس دن جب میں پولیس کے چند سپاہیوں کے ساتھ یہاں لایا گیا تو راستے میں مجھے اپنا ایک خاص دوست مری سے پنڈی کی طرف آتے ہوئے اپنی موٹر میں سڑک پر نظر آیا۔ میں نے بڑے زور سے اسے ہاتھ ہلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا لیکن وہ بالکل

خاموشی سے میرے قریب سے گزر گیا۔ مجھے حیرت ہوئی اس لئے کہ وہ میرا ایک اچھا دوست ہے۔ دن کا وقت تھا' اس نے مجھے ضرور پہچان لیا ہوگا۔ پھر جان بوجھ کر سردمہری کیوں اختیار کی۔ شاید اس لئے کہ میں اس وقت حکومت کی Good Book میں نہیں ہوں۔ بعض لوگ بڑے ابن الوقت ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ' حالات کے ساتھ اپنی وفاداریاں بھی بدلتے ہیں لیکن میرا یہ دوست ایسا نہیں تھا۔ بہرحال مجھے اس کے رویئے پر افسوس ہوا۔

یہاں مجھ پر کوئی خاص پابندی نہیں حالانکہ قیدی تو ہوں لیکن میرے محافظ بڑے اچھے لوگ ہیں اور جانتے ہیں کہ میں بھاگ کر نہیں جاؤں گا' اس لئے میں آزادی سے جنگلوں میں گھومتا پھرتا ہوں۔ مجھے ویسے بھی جنگل اور پہاڑ بڑے پسند ہیں' خوب سیر کرتا ہوں۔ اب تو اخبارات بھی ملتے ہیں' پھر احباب کے ملنے پر کوئی خاص پابندی نہیں۔ آسانی سے جیل کے حکام سے اجازت نامہ لے کر مجھے ملنے آجاتے ہیں''۔

15 ستمبر 1958ء

''اس روز چند احباب کے ساتھ جیل میں شطرنج کھیلی اور برج بھی۔ وہ میرے لئے کتابیں لائے تھے۔ مجھے Biographies پسند ہیں۔ میرے ایک دوست میرے لئے چرچل کی Biography لائے۔ میں پڑھ تو چکا ہوں پہلے بھی لیکن یہ ایسی کتاب ہے کہ پھر پڑھی جا سکتی ہے۔ ثریا اور جوجو سیالکوٹ میں ہیں۔ چچا جان کے خطوط سے ان کی خیریت معلوم ہوتی ہے۔ اچھا ہے اس نے مجھے خط نہیں لکھا' ڈاک سنسر ہوتی ہے۔ اس وقت تو صرف گھر والوں کی خیریت کی خبر ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ جوجو میری غیر موجودگی محسوس کرتی ہوگی۔ مجھے بہت یاد آتی ہے۔ شاید ماں کو تنگ بھی کرتی ہو' بہت چھوٹی ہے' حالات تو نہیں سمجھ سکتی۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں زیادہ دیر تک حکومت نظر بند نہیں رکھے گی۔ مجھے یوں لگتا

ہے کہ ملک میں بھی کوئی اہم تبدیلی ہوگی۔ لگتا ہے سکندر مرزا کے دن پورے ہو گئے ہیں''۔

خورشید جمہوریت اور آزادی پسند' دیانت دار' بے لوث اور اصول پرست سیاست دان تھے۔ ساری زندگی جمہوریت کی بحالی' کشمیر کی جدوجہد آزادی اور تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ہمیشہ اصولی سیاست کی اور کشمیری عوام کی عزت اور وقار کو بلند کرنے کی کوشش کی۔

کے ایل ایم کی تحریک میں خورشید چار ماہ گرفتار رہے۔ پھر واپس کراچی جا کر پریکٹس شروع کر دی۔ اس وقت ملک میں اکتوبر کے مارشل لاء کے بعد صدر ایوب کے دور میں 1959ء میں مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ نے انہیں آزاد کشمیر کا صدر چنا جس میں پاکستانی حکومت کی مرضی بھی شامل تھی۔ ان دنوں صدر کا انتخاب ایسے ہی ہوتا تھا۔ خورشید نے پہلی بار اپنی صدارت کے زمانے میں یہ طریقہ بدلا اور اس دن سے آزاد کشمیر کے صدر کا انتخاب الیکشن کے ذریعے ہوتا ہے۔

کراچی میں ان دنوں یہ تاثر تھا کہ چونکہ خورشید کراچی میں پرانے مسلم لیگیوں کے ساتھ مل کر National Reconstruction Movement کی تحریک چلا رہے ہیں جس کا زیادہ کام وہ خود کرتے تھے' اس لئے اس اجتماع کو توڑنے کے لئے صدر ایوب نے انہیں وہاں سے ہٹانے کا یہ منصوبہ بنایا ہے۔ اس میں کہاں تک صداقت تھی' کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک فوجی سربراہِ مملکت واقعی ملک میں اس قسم کی کوئی تحریک کبھی پسند نہیں کر سکتا۔

خورشید نے یکم مئی 1959ء کو آزاد کشمیر کے صدر کا حلف اٹھایا۔ وہ اگست 1964ء تک آزاد کشمیر کے صدر رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے وہاں بنیادی جمہوریت کی طرز پر الیکشن کروایا اور صدر منتخب ہوئے۔ اپنی صدارت کے دوران انہوں نے جمہوری ادارے قائم کیے اور آزاد کشمیر کے دور دراز علاقوں کی تعمیر و ترقی کے لئے مختلف منصوبوں کا

آغاز کیا۔ انہوں نے اپنی صدارت کے دوران آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کرانے کے لئے آواز بلند کی۔ ان کا خیال تھا کہ آزاد حکومت پوری ریاست کی نمائندہ حکومت تسلیم کی جائے اس سے کشمیر کے مسئلہ کو مثبت تقویت ملے گی اور بین الاقوامی طور پر اس کے حل میں آسانی پیدا ہوگی۔ نمائندہ حکومت کا اپنا ایک مقام ہوگا' حقوق ہوں گے اور ایک حیثیت ہوگی۔ افسوس! برسر اقتدار طبقہ اور چند خود غرض لوگ کبھی اس جذبے کو نہ سمجھے۔ جان بوجھ کر ان پر ''خودمختار کشمیر'' کے علمبردار ہونے کا الزام لگایا اور انہیں ''علیحدگی پسند'' کہا حالانکہ اس میں کشمیریوں کا وقار تھا۔ ریاست کے تنازعے کا حل تھا۔ جب کبھی کشمیر کی تاریخ کسی غیر جانبدار مصنف نے لکھی تو خورشید کی اس تحریک کو سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ خود غرض لوگ اپنی غرض اور کرسی کے لئے قوموں اور ملکوں کی بہتری کا کبھی نہیں سوچتے۔

خورشید مسئلہ کشمیر پر ایک مکمل اتھارٹی تھے۔ کشمیریوں کی عزتِ نفس چاہتے تھے۔ ملک کی بہتری چاہتے تھے۔ کشمیر کا الحاق پاکستان سے چاہتے تھے۔ کشمیر کی آزادی کے لیے وہ زندگی بھر کوشاں رہے۔ پاکستان کے حکمرانوں کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ محب الوطن تھے اور زبانی باتیں کرنے میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ کشمیر کے متعلق ہمیشہ اخبارات میں بیان دیتے تھے۔ پریس کانفرنس کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ ''ریاست جموں وکشمیر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور کشمیر کے مستقبل کے بارے میں کوئی بھی حل قابلِ غور نہ ہوگا جو اس بنیادی سیاسی حقیقت کے خلاف ہو۔ انصاف کے تمام اصولوں کے مطابق اور انسانی حقوق کے منشور کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کی سرداری عوام کا حق ہے اور وہی اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی سسٹم یا طریقۂ عمل اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم ریاستی عوام کوئی ایسا فیصلہ قبول نہیں کریں گے جو ہم پر اوپر سے ٹھونسا جائے۔ قابلِ عمل صرف وہی ہوگا جو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق عوام آزادانہ طور پر ظاہر کریں گے۔

لوگوں کی رائے کے آزادانہ اظہار تک آزاد حکومت جموں وکشمیر جو لوگوں کی

قربانیوں کے نتیجہ کے طور پر قائم کی گئی تھی' اس کی اس طرح تشکیل نو کی جائے کہ وہ ریاست کے تمام عناصر کی نمائندہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کی جانشین ہو اور ساری ریاست کے ساتھ مکمل خودمختار حکومت کا سا سلوک کیا جائے۔

آزاد حکومت کی تشکیل نو کے سلسلے میں کم سے کم ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کی طرز پر ایک ذمہ دار اور منتخب حکومت قائم کی جائے جس سے آزاد حکومت کا نظریاتی کردار قائم رہ سکے۔ ایسی حکومت ایک منتخب صدر کے علاوہ ایک مکمل نمائندہ ادارہ پر مشتمل ہو جس کو قانون سازی اور بجٹ سازی کے اختیارات حاصل ہوں۔

اگر شیخ عبداللہ، مولوی فاروق اور دوسرے لوگ مقبوضہ کشمیر میں ریاست کو بھارتی تسلط سے آزاد کرانے اور حق خود اختیاری کے مسئلے پر کوئی تحریک جاری کریں تو حدِ متارکہ کے اس طرف کی پارٹیاں ان کی مکمل حمایت کرنے کی کوشش کریں گی''۔

وزارت امورِ کشمیر نے ہمیشہ آزاد کشمیر کے انتظامی ڈھانچے کو کمزور کیا۔ نظم و نسق کو چلنے نہ دیا گیا۔ امورِ کشمیر کے اعلیٰ افسران پنڈی میں بیٹھ کر آزاد حکومت کی باگ ڈور سنبھالے رہتے تھے۔ خورشید نے شروع میں ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ وزارتِ امور کشمیر ایک بے کار اور غیر ضروری ادارہ ہے جس کی آزاد حکومت کے انتظام کے لیے قطعاً ضرورت نہیں۔ حکومتِ پاکستان نے کبھی اس پر دھیان نہیں دیا۔

1949ء میں خورشید نے پہلی مرتبہ سرظفر اللہ خان کے ساتھ مسئلہ کشمیر اقوامِ متحدہ میں پیش کیا۔

خورشید کشمیر کی آزادی کے جذبے سے سرشار تھے۔ اپنے لوگوں کی فلاح، بہتری اور ایک باعزت مقام کے لیے زندگی بھر کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی موقعہ نہیں گنوایا۔ اخبارات میں پریس والوں کو، فلاحی تنظیموں کو، جب موقع ملتا تو کشمیر کی آزادی اور حقوق کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے، بیان دیتے اور جمہوری تقاضوں سے اپنا

مطلب سمجھانے کی سعی کرتے۔ ساری زندگی انہوں نے کبھی کوئی ''غیر جمہوری یا غیر آئینی'' بات نہیں کی۔ جمہوریت ان کی روح میں پوری طرح سرایت تھی' اس لیے کبھی اصولوں پر سودے بازی بھی نہیں کی۔

خورشید کشمیر کی آزادی کے شیدائی تھے۔ محب الوطن تھے۔ جمہوریت پسند تھے۔ آزاد کشمیر کی صدارت سے استعفیٰ دینے کے بعد بھی لبریشن لیگ کے صدر کی حیثیت سے اور پھر آزاد کشمیر اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد کی حیثیت سے ان کی زندگی کا نصب العین کشمیر کی آزادی اور عوام کا وقار اور عزتِ نفس تھا۔ آزاد فضاؤں میں وہ انہیں ایک باوقار مقام دینے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ یہ پروا کبھی نہیں کی کہ وہ حکومت میں نہیں ہیں۔ ان کے اختیارات نہیں ہیں۔ مارشل لا کی حکومتیں انہیں برداشت نہیں کر سکتیں۔ بارہا کہتے تھے ''ہمیں تو کام کرنا ہے۔ لوگوں کے حقوق کے لیے لڑنا ہے۔ ملک کی آزادی کے لیے آواز اٹھانی ہے۔ تگ ودو تو جاری رہے گی۔ زندگی میں یہ سب کچھ حاصل نہ بھی کر سکوں لیکن ایک مشن کے طور پر مجھے تو سب کرنا ہے''۔

مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے' خورشید کبھی اس سے بے خبر نہ رہے۔ ایک بار پریس میں بیان دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

> ''اس سال جنوری اور فروری کے مہینوں میں ایک ہزار سے زائد اشخاص کو جبری طور پر مقبوضہ کشمیر میں ضلع میر پور کے چھ دیہات سے نکال دیا گیا۔ ان کے مکان لوٹ لیے گئے اور املاک کو آگ لگا دی گئی۔ اس مقصد کے لئے رائفلیں اور مشین گنیں استعمال کی گئیں نیز ہندوستانی افسر اور ڈوگرہ عہدہ دار راجوری کے علاقے میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اکسا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ہندو بنانے اور ہندوؤں کی مسلمان عورتوں سے شادی کرنے کی وکالت کی جا رہی

ہے۔وہ تمام مسلمان جنہوں نے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا' مارے گئے۔مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ذہنی اور جسمانی طور پر غلام بنایا جائے تاکہ ان میں حکومت کے خلاف احتجاج کی سکت باقی نہ رہے۔

جنگ بندی لائن پر ظاہراً امن نظر آتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت حد بندی لائن پر واقع دیہات میں فوجی چوکیاں قائم کر رہی ہے۔فوجیں مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ کر اور فصلوں کو جلا کر انہیں آزاد علاقے میں دھکیل رہی ہیں اور بھارت کی حکومت کی ان یقین دہانیوں کے باوجود کہ ماضی کے واقعات غلط فہمیوں کا نتیجہ تھے اور آئندہ ایسا نہیں ہوگا' نہ صرف ایسا ہو رہا ہے بلکہ زیادہ شدت سے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔سرحدی علاقے میں فوجی چوکیوں کا قیام اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے صریحاً منافی ہے لیکن اس معاملے میں اقوام متحدہ پر بھی بھروسہ کرنا بے سود ہوگا۔

اس عالمی ادارے نے جب بھی کسی ملک میں مداخلت کی' وہاں کے اصل مسائل حل کرنے کی بجائے کچھ نئی مشکلات پیدا کر دیں مثلاً فلسطین' کوریا اور کانگو کے ممالک ایسے ہیں جو اقوامِ متحدہ کی مداخلت سے تقسیم ہو کر رہ گئے۔کشمیری عوام پر یہ مظالم تازہ نہیں' نہ ان کی اسیری کی داستان مختصر ہے۔اتنے برس اس انتظار میں گزر گئے کہ ان کی رہائی کی نوبت آیا چاہتی ہے' اب بڑی اقوام کا ضمیر بیدار ہوگا' اب اقوامِ متحدہ کی انجمن اپنے وعدوں کا پاس کرے گی لیکن ہنوز روزِ اوّل ہے۔کشمیری عوام نے آزادی کی جس جدوجہد کو جاری رکھا ہے'

وہ بہر حال جاری رہے گی اور روز بروز مستحکم اور زیادہ وسیع ہوتی جائے گی۔ آزادی ان کا حق ہے اور وہ آزاد ہو کر رہیں گے لیکن مستقبل کا مؤرخ تاریخ کے اوراق میں جہاں کشمیری عوام اور دیگر آزاد اقوام کا تذکرہ زریں حروف میں لکھے گا وہیں بڑی طاقتوں کے ضمیر کی سیاہی سے اقوام متحدہ کی ناکامی کا المیہ بھی رقم کرے گا اور کوئی آنکھ اس المیے پر اشک بار نہ ہوگی''۔

خورشید آزاد کشمیر' مقبوضہ کشمیر اور پاکستان کی سیاست میں ملوث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر قانون دان بھی تھے۔ پھر وکالت ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ زندگی کے آخری دنوں تک وہ اپنے کیس نپٹاتے رہے' اس لئے ان کا لاہور اور آزاد کشمیر آنا جانا لگا رہتا تھا جو بسا اوقات سیاسی مصروفیات کی وجہ سے بہت بڑھ جاتا تھا۔

قانون کے بارے میں ایک بار انہوں نے کہا ''کسی معاشرے میں نظامِ انصاف اور عدالتی کارروائی کا معیار اس قوم کے عوامی کردار سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ جب معاشرے کے ہر شعبے میں خود غرضی' مفاد پرستی' کینہ پروری' نسلی اور قبائلی امتیاز' دولت کی پرستش اور اقتدار کی چاپلوسی کے محرکات کارفرما ہوں تو نظام کو ان تمام خامیوں سے مبرا سمجھنا یا ان سے مبرا ہونے کی توقع عبث ہے۔

عدالتوں اور انصاف کے اداروں کی کارکردگی' ان کی اخلاقی اقدار اور ان کے روزمرہ کے اعمال کے پیمانے بہر حال جدا نہیں کیے جا سکتے۔ اس لئے موجودہ ماحول میں عدالتوں سے بہتر کارکردگی کی توقع رکھنا میرے خیال میں خود عدالتوں سے بے انصافی ہے۔ البتہ اس دائرہ کار میں کچھ بہتری کی صورت ضرور پیدا کی جا سکتی

ہے۔ اس سلسلے میں عام طور پر دو اعتراضات کئے جاتے ہیں: اولاً حصولِ انصاف میں تاخیر' دوم حصولِ انصاف میں ناقابلِ برداشت اخراجات کا بوجھ۔ جہاں تک تاخیر کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کسی معاشرے کے انصاف کے ادارے کس اصول پر قائم ہیں۔ حصولِ انصاف کے سلسلے میں مقدمات یا عدالتی کارروائیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اول وہ مقدمات ہیں جن میں حکومت یا ریاست براہ راست ایک فریق ہوتی ہے۔ ان کی بھی آگے چل کر دو قسمیں ہیں: ایک تو فوجداری مقدمات جو جرائم پیشہ افراد یا کسی جرم کے مرتکب ہونے والوں کے خلاف سٹیٹ یا سرکار کی طرف سے قائم کئے جاتے ہیں اور دوسرے وہ درخواستیں ہیں جو افراد کی طرف سے اپنے حقوق کے تحفظ اور بحالی کے لئے حکومت کے خلاف دائر کی جاتی ہیں۔ دوسرے حصے میں دیوانی مقدمات آتے ہیں جن میں بالعموم فریق دونوں طرف افراد ہی ہوتے ہیں اور حکومت اور سٹیٹ کا ماسوائے چند ایک مقدمات کے ان سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ نظامِ انصاف جو پاکستان میں رائج ہے' اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ تو ہم اس نظام سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ دوسرے نظام یعنی نظامِ شریعت اور مارشل لاء سے استفادہ کیا جا سکتا ہے بلکہ نظام انصاف کی اس تکون کے قائم ہونے سے عوام کی مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

قانون کی تشکیل ایک فرد یا گورنر یا صدر کے آرڈیننس سے

نہیں ہوتی بلکہ قوم کے نمائندے مسودہ قانون کی ایک ایک شق' ایک ایک لفظ پر بحث کرتے ہیں۔ قانون کو وسیع پیمانے پر مشتہر کیا جاتا ہے تا کہ عوام کا ردعمل معلوم ہو سکے۔ اس کے بعد قانون اپنی آخری شکل اختیار کرتا ہے اور اس قسم کے قانون کا احترام ہر شہری پر فرض ہوتا ہے۔

فوجداری نظام کے ضابطے میں اگر تبدیلی لانی ضروری ہے تو میرے خیال میں یہ ہے کہ مبینہ ملزم کی گرفتاری کے بعد اسے فوری طور پر عدالت میں پیش کیا جانا چاہئے اور اس کا حلفی بیان قلمبند کر کے اس پر جرح کرنے کا موقع دینا چاہئے۔ اس طرح کرنے سے کافی حد تک فوجداری معاملات میں حصولِ انصاف میں مدد مل سکے گی۔ موجودہ صورت میں ملزم کو نہ حلف دلایا جاتا ہے اور نہ اس پر جرح کی جا سکتی ہے۔

جہاں تک اخراجات اور مہنگائی کا تعلق ہے' اس کا جواب بالکل آسان ہے۔ اس لئے کہ موجودہ دور میں آٹے اور دال اور راج مزدور کی طرح اس پیشے میں بھی مہنگائی ناگزیر ہے۔ بعض ممالک میں اس کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ کم آمدنی والے ملزموں کے وکیلوں کو فیس سرکاری خزانے سے ادا کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس پہلو سے نپٹنے کے لئے اس تجویز پر عمل کیا جانا چاہئے لیکن جو حکومتیں آٹا اور دال سستا نہیں کر سکتیں' وہ انصاف کیا سستا کریں گی۔

دیوانی مقدمات افراد کے درمیان ہوتے ہیں اور ان میں کچھ ایسے بنیادی اصول' بنیادی اقدار اور بنیادی ہدایات کارفرما ہیں جن کو نظر انداز کرنا پورے نظام کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس سلسلے میں اور زیادہ ظلم' دھاندلی اور بے انصافی عموماً سادہ لوگوں یا

دیہات میں کمزور طبقے اور بیواؤں اور یتیموں کی جائیداد کو اینٹھنے کے سلسلے میں ہوتی ہے۔ ایک طاقتور زمیندار اپنے علاقے میں جھوٹے گواہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ گواہوں کو غائب بھی کروا سکتا ہے اور کاغذات پر جبراً دستخط بھی کروا سکتا ہے مگر یہ مسئلہ نظامِ انصاف کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے قومی کردار کی کمزوری اور ہمارے معاشرے کے کمزور افراد کے عدم تحفظ کی مثال ہے۔ اس کا علاج ایسے معاشرے کا قیام ہے جس میں ہر شخص خواہ اس کا تعلق کسی طبقے سے ہو اپنے آپ کو محفوظ تصور کرے۔

اس وقت قومی سطح پر اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے جو قابل قدر ہونے کے باوجود تب تک بارآور نہیں ہو سکتی جب تک اسلام میں عدل کے تصور کی حدود کا تعین نہ کیا جائے۔ قانون زمانے کے حالات اور تغیرات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدل میں تشدد کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف قسم کے آرڈیننس نافذ کرنے کی بجائے بہتر ہو گا کہ قوانین کا ڈھانچہ تیار کر کے رائے عامہ کے لئے مشتہر کیا جائے اور بعد ازاں اسے نافذ کرنے کی صورت اختیار کی جائے۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی نظام عدل میں خلیفہ یا حکمران کو عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسلامی تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جبکہ خلیفہ قاضی کے طلب کیے جانے پر عدالتوں میں موجود ہوتے تھے۔ یہ وہ عمل تھا جس نے اسلامی معاشرے میں عدالتوں کا وقار بلند کر دیا تھا اور یہی وہ چیز

ہے جسے ہم قانون کی بالادستی کہتے ہیں ۔اگر قانون کی بالادستی قائم کی
جائے تو یہ اسلامی نظامِ عدل کے عین مطابق ہوگا اور اس کے بعد
انصاف میں تاخیر اور مہنگا پن بہت چھوٹی چیزیں لگیں گی''۔

1959ء میں آزادکشمیر میں پہلا جنرل الیکشن انہوں نے کروایا اور پھر اس کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ الیکشن بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی صدارت کے دوران بنیادی جمہوریت کے ادارے قائم کیے اور آزادکشمیر کے دوردراز کے علاقوں کی تعمیر وترقی کے لیے مختلف منصوبوں کا آغاز کیا۔ اپنی صدارت کے دوران آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کروانے کے لیے آواز بلند کی۔ حکومتِ پاکستان سے چند اختلافات کی بنا پر انہوں نے 1964ء میں استعفیٰ دے دیا۔ 1962ء میں انہوں نے اپنی سیاسی جماعت جموں وکشمیر لبریشن لیگ مظفرآباد میں قائم کی جس میں آزادکشمیر اور پاکستان میں مقیم کشمیریوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور انہیں اس کا صدر چنا گیا جو وہ تاحیات رہے حالانکہ کئی بار پارٹی کے الیکشن ہوئے۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ نے جب ایوب خان کے مقابل الیکشن میں حصہ لیا تو خورشید محترمہ کے چیف پولنگ ایجنٹ تھے۔ محترمہ ان کی بہت قدردان تھیں اور خورشید کو ان کا بہت قرب حاصل تھا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

وہ زندگی بھر آزادیٔ کشمیر کے لیے کوشاں رہے۔ پاکستان کی فلاح اور بہتری کے لیے کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں کئی بار دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ بھی کیا اور کشمیریوں کی آزادی کے موقف سے دنیا کو روشناس کروایا۔

اصولوں کی وجہ سے صدارت سے استعفیٰ کے بعد ہمیشہ ''اپوزیشن'' میں رہے لیکن اس طرح بھی عوام اور ملک کی خدمت کرتے رہے۔ کبھی کسی غرض سے غلط راہوں کو نہیں اپنایا۔ غیر جمہوری طریقے اختیار نہیں کیے۔ غیرت اور خودداری کے نام پر آنچ نہیں آنے دی۔

دو سال پیشتر انہوں نے ہرارے میں منعقدہ ایک سو ایک مما لک کی غیر جانبدارانہ کانفرنس میں مسئلہ کشمیر سے دنیا کے سربراہوں کو روشناس کرایا یہاں تک کہ پمفلٹ خود ٹائپ کر کے لوگوں میں تقسیم کیے۔ حیرت ہے کہ اس غیر جانبدارانہ کانفرنس میں کشمیر کا مسئلہ بڑی آسانی سے فراموش کر دیا گیا تھا حالانکہ وہ دوسرے مسئلوں کے ساتھ ایک اہم مسئلہ ہونا چاہیے تھا۔

ہرارے کانفرنس میں ان کی شرکت کو بھارت نے خوب اچھالا۔ بھارتی حکومت کو یقین تھا کہ خورشید کو حکومت اپنے ساتھ لے گئی ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارت کو مقبوضہ کشمیر میں کشمیریوں کے اس الجھے ہوئے مسئلے کے سلسلے میں اگر کسی سے کوئی خوف تھا تو وہ خورشید ہی تھے جو قابل تھے، ایماندار تھے، ارادوں میں اٹل تھے، بکنے والے نہیں تھے، سودابازی کرنے والے نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ انہیں ہر قیمت پر اپنے ملک کی آزادی اور عوام کا وقار عزیز تھا۔ کاش! حکومتِ پاکستان ملک کی بہتری کے لیے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتی لیکن ہمارے لوگ تو ذاتی اغراض اور ذاتی فائدوں کی وجہ سے ملک کو بیچنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ حکومتِ وقت کو اچھے انسانوں کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟

خورشید نے کشمیریوں کو ووٹ کا حق دلوایا اور یہاں جمہوری اقدار کے لیے ہمیشہ آواز بلند کی۔ انہوں نے ہمیشہ باوقار سیاست کی۔ ساری زندگی سادگی سے گزاری۔ ان قدروں کو اپنایا اور ان کے لیے جدوجہد کی جو تحریکِ پاکستان کی بنیادی باتیں تھیں اور جن کو قوم بھول چکی ہے۔ قوم ان پستیوں میں کھو گئی ہے جہاں سے اس کی واپسی کی راہیں بند ہو گئی ہیں۔ دن رات ہر قیمت پر پیسہ بنانے کے چکر میں وہ سب کچھ فراموش کر دیا ہے جس کے لیے پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔

خورشید نے کبھی اپنی قومی اور ملی خدمات کو نہ اچھالا، نہ کبھی صلہ طلب کیا۔ ایک مردِ

درویش کی طرح صاف پاکیزہ اور ستھری زندگی گزاری۔ سیاست کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا اور نہ ہی قائداعظمؒ سے وابستہ قرب کو برسرِ عام نیلام کیا اور نہ ہی کسی طرح کا فائدہ اٹھایا۔ وہ ایک مضبوط کردار کے نہایت با اخلاق انسان تھے۔ منافقت کو بہت برا سمجھتے تھے۔ ان کی سچائی کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کرانا چاہتی ہوں اور ایسے واقعات ان کی زندگی میں کئی ہیں۔ دو سال پیشتر جب وہ ہرارے غیر جانبدارانہ کانفرنس میں بحیثیت ایک کشمیری لیڈر کے شریک ہوئے تو صدر ضیا انہیں وہاں دیکھ کر حیران ہو گئے اور کہا ''خورشید صاحب! اگر آپ یہاں آنا چاہتے تھے تو ہم آپ کو ساتھ لاتے''۔ خورشید نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اگر آپ کو کہتا تو آج میں یہاں اس کانفرنس میں شریک نہ ہوتا۔'' انہوں نے سچ کہا اور ذرہ بھر یہ نہ سوچا کہ یہ ڈکٹیٹر اس وقت ملک کا صدر اور سربراہ ہے۔ سیاست میں کسی طرح کی سودے بازی ان کی فطرت میں نہیں تھی۔ صاف اور کھری بات کہتے تھے اور اس بات کی انہیں پروا نہیں تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ سچ کو آنچ نہیں ہوتی۔ یہ ان کا زندگی بھر نصب العین رہا

پھول وہ چمن سے ٹوٹا کہ چمن ویران ہے
آج منہ ڈھانپ کے پھولوں میں صبا روئے گی
اے میرے قائد، بے باک، نڈر، شیر جری
تیری تربت پہ فطرت بخدا روئے گی

(سیف)

خورشید ایک باوقار با اصول اور ایمان دار سیاست دان تھے۔ وہ شکوک و شبہات میں کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا ضمیر بے داغ تھا' اس لئے وہ ناجائز اور غلط بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تو لوگ کرسی سے چپک جاتے ہیں' کسی قیمت پر الگ ہونا نہیں چاہتے۔ لیکن خورشید نے، جب ان کی صدارت کی دو سال سے زائد مدت باقی تھی۔ غیرت مندی سے استعفیٰ دیا۔ حالانکہ وہ منتخب صدر تھے۔ بنیادی جمہوریت کے

نظام کے تحت انہوں نے ہی آزاد کشمیر میں پہلی بار انتخابات کروائے اور پھر یہ طریقہ وہاں رائج ہوگیا۔

خورشید نے یکم مئی 1959ء کو آزاد کشمیر کے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور اگست 1964ء میں ان ناگزیر حالات کی وجہ سے استعفیٰ دیا جن کا ذکر انہوں نے خود کئی بار اپنے پیغامات میں کیا اور جس کے متعلق اخبارات میں بھی آتا رہا۔ اس لئے اس موضوع پر میں مزید کہنا مناسب نہیں سمجھتی۔

بحیثیت صدر جو کام انہوں نے ملک کی فلاح اور ریاست کے لوگوں کی بہتری کے لئے کئے' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن میں اپنی گھریلو زندگی کے حوالے سے ان باتوں کا ذکر کروں گی جو شاید اب بھی بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہوں۔ ایوانِ صدر ان دنوں ایک سادہ اور مختصر سے گھر پر مشتمل تھا۔ میں نے سارا عرصہ دو سونے کے کمروں میں گزارہ کیا۔ جب گھر کے افراد ہمیں ملنے آتے تو ہم بچوں کا کمرہ خالی کر کے انہیں دیتے۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی اور جب کبھی میں خورشید سے کہتی کہ جگہ کم ہے' ایک آدھ کمرہ بن جائے تو آسانی ہو جائے۔ ہمیشہ کہتے شکر کرو تمہیں کیمپ میں نہیں رہنا پڑتا۔ یہاں تو "کیمپ لائف" ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ ملک کا فیصلہ التوا میں ہے۔ ہم باہر کے لوگوں کو کہتے ہیں کہ کشمیر کا جھگڑا طویل ہو گیا ہے' اس لئے رائے شماری ہونی چاہئے' لوگوں کو فیصلہ کرنے کا حق ملنا چاہئے۔ ایسی باتیں کر کے خود بڑے بڑے آرام دہ گھروں میں رہائش رکھیں' کتنا مضحکہ خیز ہے۔

اس سارے عرصہ میں ایک بار ایوان صدر میں چند کمرے بنے اور کچھ اور تبدیلیاں ہوئیں اور وہ اس لئے کہ شیخ عبداللہ جب مئی 1964ء میں پاکستان اور آزاد کشمیر آئے تو انہیں ایوانِ صدر میں ہی رہنا تھا۔ مجبوری تھی' اس لئے خورشید نے اس پر اعتراض نہ کیا لیکن چونکہ اپنے لئے وہ یہ سب کچھ کرنے کے کبھی حق میں نہیں تھے۔ ہم اس کے بعد بہت کم عرصہ یہاں رہے۔ اگست 1964ء میں انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔

مجھے یاد ہے مظفر آباد آتے ہی ایوان صدر کے نصف سے زیادہ نوکر انہوں نے واپس کر دیے تھے۔ سرکاری برتن اور چیزیں گیسٹ ہاؤس میں بھجوا دیں تھیں۔ ہم اپنا ذاتی سامان استعمال کرتے رہے۔ گارڈ بھی بہت کم کر دی تھی۔ جب کبھی میں اپنے والدین کے پاس بچوں کے ساتھ سیالکوٹ جاتی تو پنڈی سے چپسٹر کا کرایہ ادا کیا جاتا۔ یہ تو کبھی نہ ہوا کہ ایوانِ صدر کی کار میں نے خورشید کے بغیر استعمال کی ہو۔ ایک بار ہماری 4 سالہ بچی یاسمین نے بڑی ضد کی کہ اس نے جھنڈے والی کار میں سکول جانا ہے۔ ان دنوں وہ نرسری میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے بچی کی ضد سمجھ کر بھجوا دیا۔ سکول ایوانِ صدر کے بالکل قریب سیکرٹریٹ کے پاس تھا۔ شام کو بچی نے نہایت اشتیاق سے ابا جان کو بتایا کہ وہ آج جھنڈے والی گاڑی میں سکول گئی تھی۔ خورشید کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ بعد میں مجھے کہنے لگے "آج تو یہ ہو گیا آئندہ سے احتیاط کرنا۔ جھنڈے والی کار بیوی بچوں کے استعمال کے لئے نہیں ہے۔ بچے تو یہ نہیں جانتے تم تو جانتی ہو کہ یہ غلط ہے"۔

کشمیر کی جیل سے لاہور واپس آنے کے بعد جب انہوں نے "گارڈین" اخبار نکالا تو ایک بار اس وقت کے گورنر سردار عبدالرب نشتر سے ملنے گئے۔ وہ خورشید کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ قائد اعظمؒ کے پرانے ساتھیوں میں سے تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے خورشید سے پوچھا کہ رہائش کہاں ہے؟ خورشید نے کرائے کے اس فلیٹ کا ذکر کیا جہاں وہ رہتے تھے۔ نشتر صاحب نے چند دنوں میں ہی انہیں کوئنز روڈ پر ایک بہت عمدہ گھر الاٹ کر دیا۔ وہ کچھ عرصہ وہاں رہے پھر بار ایٹ لاء کرنے انگلستان چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ گھر کسی نے اپنے نام الاٹ کروا لیا۔ آزاد کشمیر کی صدارت کے دوران میں نے ان سے کہا کہ وہ گھر باقاعدہ ان کے نام پر الاٹ ہوا تھا آپ وہ واپس لے لیں۔ انہیں یہ بات اچھی نہ لگی۔ کہنے لگے "یہ پبلک آفس ہے۔ یہاں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے۔ جائیداد بنانے یا کچھ لینے کے لئے تو میں یہاں نہیں آیا"۔ میں نے دوسری بار اس

موضوع پر بات نہ کی اور مجھے اس بات سے بڑا سکون ہے کہ میں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جو انہیں ناپسند ہو۔ کوئی ایسی فرمائش نہیں کی جو وہ پوری نہ کر سکتے ہوں اور کبھی کسی خواہش کے لئے اصرار نہیں کیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ عام لوگوں سے ہٹ کر ہیں۔ ان کی سوچ مختلف ہے۔ ان کی توجہ ملک اور قوم کے حقوق اور بہتری کی طرف رہتی ہے۔ وہ گھر اور بچوں میں پوری طرح ملوث ہیں لیکن وہ کسی اور مقصد کے لئے پیدا ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دل و دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہونا چاہئے۔

میں نے تو جائز بات کے لئے بھی خورشید پر کبھی بوجھ نہیں ڈالا۔ ایوانِ صدر میں ہم نے بہت سادہ زندگی گزاری۔ ہماری ضروریات محدود تھیں' مختصر تھیں اور زندگی میں کرنے کو بہت کچھ تھا۔ افسوس کبھی نہیں ہوا، اس لئے کہ ہمارے سوچنے کا انداز ہی یہ تھا۔ دنیاوی جاہ و حشمت کو ہم نے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ سادہ آرام دہ زندگی کو ترجیح دی اور شاید یہی زندگی کی معراج بھی ہے۔ ورنہ دولت کی کشش اور اسے حاصل کرنے کے ہر وہ طریقے جو لوگ اختیار کرتے ہیں' کب ختم ہوتے ہیں۔ لالچ اور حرص بڑھ جاتا ہے اور انسان سراب کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے لوگوں کو ذہنی سکون بھی ہوتا ہے۔ اگر دنیاوی مال و دولت سے سکون مل سکتا تو کیا بُرا تھا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بے چین رہتے ہیں۔ انہیں خود سمجھ نہیں آتی کہ زندگی میں کیا کمی ہے۔ دولت کبھی انسانی قدروں کا مداوا نہیں ہو سکتی۔

فروری 1970ء میں بنگلہ دیش' جو ان دنوں مشرقی پاکستان تھا' کے ایک شاعر جن کا نام بھی خورشید احمد تھا' نے خورشید کے متعلق بڑی خوبصورت نظم لکھی اور ہمیں بھیجی۔ وہ اس طرح تھی۔

اہلِ کشمیر کے ہیں درد کے مارے خورشید
کب تلک دیکھیں گے اوروں کے سہارے خورشید

ناخدا کشتیِ کشمیر کہتے ہیں تجھے
جلد اب اس کو لگا دے تو کنارے خورشید
نام میرا بھی ہے خورشید لیکن صد حیف
مجھ میں اور تجھ میں بہت فرق ہے پیارے خورشید
میں جہاں ہوتا ہوں تاریکی سدا رہتی ہے
تیری ہستی سے رواں نور کے دھارے خورشید
مجھ کو ''میرا'' بھی کوئی کہتا نہیں ہے ہرگز
تجھ کو سب فخر سے کہتے ہیں ہمارے خورشید
بس اگر میرا چلے کاش تو کیا کیا نہ کروں
تجھ پہ قربان کروں چاند ستارے خورشید
گرچہ ہیں دور مگر دل کے قریب رکھنا انہیں
کچھ بھی ہیں پھر بھی ہیں خورشید تمہارے خورشید

(نظم نمبر 2)

رہیں گے اپنے وطن میں ہم اجنبی کب تک
حضور ہم سے یہ اندازِ بے رخی کب تک
ہر ایک گام پہ کرتے ہو امتحانِ وفا
وفا پرستوں سے اے دوست بدظنی کب تک
کبھی تو آنکھوں سے آنکھیں ملا کے بات کرو
نگاہِ ناز رہے گی جھکی جھکی کب تک
لٹے ہیں قافلے ہر رہ گزار پر اپنے
لباسِ راہبری میں یہ راہزنی کب تک

ہر ایک بات مری ان پہ بار ہوتی ہے
مزاج یار میں آخر یہ نازکی کب تک
عروسِ صبح کی زلفیں سنوارنے والو!
تمہارے اپنے دلوں کی یہ تیرگی کب تک
ابھی تو تم کو کڑی دھوپ میں ہی چلنا ہے
ملے گی راہ میں چھاؤں تمہیں گھنی کب تک
یہ وقت اور ہی بدلا ہوا زمانہ ہے
اب ایسے دور میں خورشید شاعری کب تک؟

خورشید نے استعفیٰ بھی ایسے حالات میں دیا کہ ان کا باوقار کردار اور عظمت اس میں پنہاں ہیں۔ ابھی ان کی صدارت کی 3 سال سے زائد مدت باقی تھی، وہ منتخب شدہ صدر تھے لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں اچھے سازگار ماحول میں کام کرنا آسان نہیں رہا، اس لئے انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی اور واپس کراچی جا کر قانون کی پریکٹس شروع کر دی۔ میں بچوں کے ساتھ اپنے والدین کے پاس سیالکوٹ چلی گئی اور چند ماہ کے بعد کراچی گئی جب انہوں نے رہنے کے لئے گھر تلاش کر لیا اور اپنا کام شروع ہو گیا۔ میرے پاس ان کے سارے خط محفوظ ہیں جو وہ کبھی کبھی مجھے لکھتے تھے۔ کراچی سے جتنے خط ان کے آئے، سب تفصیل لکھ کر ایک فقرہ ضرور لکھتے۔ ''یہ بہت معمولی باتیں ہیں۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں''۔

جب خورشید نے استعفیٰ دیا تو میں بھی بچوں کے ساتھ پنڈی میں تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میں اپنا سامان لینے مظفر آباد خود جاؤں لیکن انہوں نے منع کر دیا کہ مناسب نہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی شوکت حسن ہمارا سامان لینے گئے، بہت سا سامان ضائع ہوا، اس لئے کہ واپسی پر انہوں نے بتایا کہ گھر میں سرکاری عملہ جمع تھا جو ساری چیزوں کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔

خورشید کے کردار کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ تکبر یا جھوٹی شان کبھی انہیں چھو کر نہیں گزری۔ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں' ایسے اپنے کئی احباب بھی ہیں جو ایک اچھے مقام یا عہدے کے بعد واپس اس مقام پر آ جانے سے بہت بے سکون ہو جاتے ہیں جہاں وہ پہلے تھے۔خود کو عادی ہی نہیں کر سکتے۔ذہن میں افسری بس جاتی ہے۔اچھی پوزیشن اور سٹیٹس انہیں بدل کر رکھ دیتا ہے اور وہ خود کو ایک ایسی مخلوق سمجھنے لگتے ہیں جن کا عام لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔باتوں میں' رہن سہن میں' رویئے میں اتنا فرق آ جاتا ہے کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی ہے۔

مجھے فخر ہے کہ ہمیں اس چیز نے کبھی متاثر نہیں کیا۔سٹیٹس' عزت اور شہرت اللہ تعالیٰ کی دین ہیں۔ان نعمتوں سے تو انسان کو اور عاجز ہو جانا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ خورشید نے کبھی ان باتوں کو سر پر نہیں بٹھایا۔کبھی نہیں بدلے۔خدا نے اتنی عزت سے نوازا۔اچھے اور بڑے لوگوں سے ان کے مراسم تھے۔ملک میں بھی اور ملک سے باہر بھی لیکن وہ ایک بہت سادہ طبیعت اور مطمئن انسان تھے' چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی خوشیاں حاصل کرتے تھے اور کبھی زندگی میں کسی کمی کی شکایت انہوں نے نہیں کی۔اچانک ان کے استعفیٰ پر ملک کے اخباروں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ایک اخبار کے اداریے کا یہاں حوالہ دیتی ہوں۔

''مسٹر خورشید کا استعفیٰ''

''مسٹر کے ایچ خورشید آزاد کشمیر کی صدارت سے ذاتی وجوہ کی بنا پر مستعفی ہو چکے ہیں۔ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا ہے اور ان کی جگہ عارضی طور پر جسٹس عبدالحمید خان کو صدر نامزد کر دیا گیا ہے۔مسٹر خورشید کیوں مستعفی ہوئے اور وہ ذاتی وجوہ کیا تھیں؟ اس بارے میں چونکہ مسٹر خورشید نے ''خامشی معنی دارد کہ در گفتن نمے آید'' کے مقولے پر عمل کیا ہے۔ اس لئے ہم بھی اس بارے میں خاموش رہنا چاہتے ہیں۔مسٹر خورشید آزاد کشمیر کے پہلے

منتخب صدر تھے اور انہوں نے مسلم کانفرنس کو شکست فاش دے کر یہ انتخاب جیتا تھا۔ وہ ایک نہایت زیرک، تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد حکومت میں آزاد کشمیر کی ترقی و تعمیر میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آزاد کشمیر میں ان کے عہد میں جو تعمیر و ترقی ہوئی ہے، آزاد کشمیر کی اقتصادی حالت میں جو بہتری پیدا ہوئی ہے، تعلیم کے میدان میں آزاد کشمیر نے جو ترقی کی ہے' کسی سابق حکومت میں اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوا۔ یہ مسٹر خورشید کا دور ہی تھا جس میں سب سے بڑی نعمت یعنی جمہوریت آزاد کشمیر کے عوام کو نصیب ہوئی۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کیا گیا اور صدر آزاد کشمیر جو اس سے قبل بے عمل جماعت مسلم کانفرنس کا نامزد ہوا کرتا تھا' وہ بھی عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوا۔ مسٹر خورشید نے مہاجرین جموں وکشمیر کی مشکلات حل کرانے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی مساعی سے حکومت نے مہاجرین اور آزاد کشمیر کے عوام سے پورا پورا ربط وضبط قائم رکھا اور ان کو ایک نظام میں منسلک کر دیا۔ آزاد کشمیر کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں وہ نہ پہنچے ہوں اور عوام کی تکالیف سے واقفیت حاصل نہ کی ہو۔ مسٹر خورشید میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بین الاقوامی سیاست پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور بے تکان ہر بین الاقوامی مسئلہ پر گفتگو کر سکتے تھے۔ بھارت نے جو اعصابی جنگ کشمیر کے مسئلے پر جاری کر رکھی ہے' اس کا منہ توڑ جواب دینے میں وہ ایک ماہر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے برادری ازم کا قلع قمع کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ حالات نے انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔''

ہم لوگ 1967ء کے آخر میں مستقل طور پر کراچی سے لاہور آ گئے۔ کراچی میں دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ لاہور میں شروع میں اچھا نہ لگا لیکن آہستہ آہستہ یہاں بھی دل لگ گیا۔ پھر خورشید کے لئے آزاد کشمیر جانا آسان ہو گیا۔ وہ اپنے لوگوں کے قریب ہو گئے۔ ملک کی سیاست میں زیادہ ملوث ہو گئے۔ الیکشن میں بھی حصہ لیتے رہے

لیکن صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد خورشید کو پبلک آفس پھر کبھی نہ مل سکا۔ ہمیشہ اپوزیشن میں رہے لیکن بہت عزت سے ایک باوقار مقام حاصل کیا۔ ہمارے ملک میں اپوزیشن میں جو لوگ ہوتے ہیں انہیں زیادہ اہمیت نہیں ملتی حالانکہ یہ بڑی غلط بات ہے۔ چونکہ ملک میں زیادہ تر مارشل لاء اور فوجی حکومتیں رہی ہیں اس لئے جمہوری قدروں کو بھی ہمیشہ پس پشت ہی ڈالا جاتا رہا ہے۔ خورشید نے اتنے سال اپوزیشن میں رہ کر ہمیشہ ایک باوقار اور با مثال کردار ادا کیا ہے جو دوسروں کے لئے مشعل راہ ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خورشید نے اپوزیشن میں بیٹھ کر ایک بھرپور کردار ادا کیا۔ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر 1962ء میں لبریشن لیگ کا قیام عمل میں نہ آتا تو آج کے اس تہذیب یافتہ دور میں بھی آزاد کشمیر کے عوام سیاسی شعور سے بہرہ ور نہ ہوتے اور وزارتِ امورِ کشمیر کے کلرک یہاں کے عوام پر حکمرانی کر رہے ہوتے۔ اس کے بعد لبریشن لیگ تقریباً ربع صدی اپوزیشن میں رہنے کے باوجود آج بھی آزاد کشمیر کی دوسری منظم سیاسی جماعت ہے۔

خورشید نے آزاد کشمیر کی حکومت کو مہاراجہ کی باغی اور جانشین حکومت تسلیم کروانے کا جو دلکش نظریہ دیا ہے وہ ان کی زندگی میں غیر معمولی پذیرائی تو حاصل نہ کر سکا لیکن وہ تمام مصلحتوں کی پرواکئے بغیر آخری دم تک اس پر قائم رہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خورشید اپنے موقف کے حوالے سے ہٹ دھرم تھے بلکہ وہ دلیل سے بات کرنے کے قائل تھے اور کئی بار انہوں نے یہ پیش کش بھی کی کہ کشمیر کی آزادی کے لئے اس سے بہتر پروگرام اگر کسی کے پاس ہے تو ہم اس پر بھی غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ گلگت اور بلتستان کے بارے میں لبریشن لیگ کا شروع سے ہی موقف ہے کہ یہ علاقے ریاست جموں وکشمیر کا مسلمہ حصہ ہیں۔

1971ء کے آخر میں بھارت اور پاکستان کی دوسری جنگ ہوئی۔ ان ہی دنوں مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور ''بنگلہ دیش'' کی حکومت وہاں معرض وجود میں آئی۔ خورشید کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے طور پر مشرقی پاکستان کے لیڈر مجیب الرحمان جو وہاں کی سیاسی جماعت عوامی لیگ کے صدر بھی تھے' کو ملنے ڈھاکہ گئے تھے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی تو تاریخ کا ایک المیہ ہے۔ پاکستان کا ایک بازو کٹ گیا۔ ہمارے 90 ہزار فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے۔ مہینوں تک لوگوں کو اپنے عزیزو اقارب کی خبر نہیں تھی کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ بھارت کے فوجی کیمپوں میں آئے دن بلوے ہوتے تھے' گولی چلتی تھی' لوگ مرتے تھے۔ قوم کے لئے بڑے صبر آزما دن تھے اور ان کے لئے اور بھی زیادہ جن کے لخت جگر' بھائی اور باپ دشمن کی قید میں تھے۔ یہ ایک افسوس ناک داستان ہے اور اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی اس سانحے سے پردہ نہیں اٹھا کہ آخر مشرقی پاکستان کا المیہ ہوا کیوں اور ہماری فوج نے ہتھیار کیوں ڈال دیئے جب کہ وہ لڑ سکتی تھی؟ غالباً دنیا میں کبھی 90 ہزار فوجیوں نے آج تک ہتھیار نہیں ڈالے۔ اس سلسلے میں قیاس آرائیاں تو بہت ہوئیں لیکن صحیح حالات کبھی منظر عام پر نہ آ سکے۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ خورشید کہا کرتے تھے کہ جب ملک پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہمارے لئے بھی کوئی نہ کوئی آزمائش آ جاتی ہے۔ 1971ء کے اختتام پر ملک میں بڑی بے چینی' افراتفری اور گڑبڑ تھی۔ بدقسمتی سے نومبر 1971ء میں ہمارا بڑا بیٹا ایرج فاروق خورشید جو نویں کلاس کا ایک ہونہار طالب علم تھا' اچانک بیمار ہو گیا۔ اس کی عمر 13 برس تھی۔ اس کمسنی میں وہ نظمیں لکھتا تھا' مضمون لکھتا تھا' سکول کے مباحثوں میں انعام لیتا تھا' بہترین کرکٹ کھیلتا تھا اور ایک اچھا طالب علم بھی تھا۔ اللہ نے اسے بڑی فرصت میں بنایا تھا۔ اپنے بچے کے متعلق کہنا کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن وہ بے حد حسین اور جاذب نظر تھا۔

اس کے چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ مزاج میں دھیما پن اور کچھ کرنے اور خاص مقصد کے لئے زندہ رہنے کا عزم اس نوعمری میں ہی اس میں اتنا زیادہ تھا کہ اس کی سنجیدگی بعض اوقات اس کی عمر سے بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ قدرت کے اتنے خوبصورت انعام پر ہم دونوں ہی بہت خوش ہوتے تھے، خورشید کو بچے ویسے بھی بہت اچھے لگتے تھے۔ ایرج سے انہیں خاص طور پر بہت پیار تھا۔

اس کی بیماری اور تکلیف دہ جدائی پر لکھتے ہوئے میرا قلم کانپتا ہے' ہاتھ لرزتا ہے۔ اسے میں زندگی بھر بھول نہیں سکتی لیکن بہت ہمت کر کے زندگی کے اس المیے پر میں نے پردہ ڈال دیا ہے ورنہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔ اس کی تکلیف دہ بیماری اور اس کی دائمی جدائی کے بعد خورشید بھی آبدیدہ ہو کر مجھے کہا کرتے تھے۔ ''بابا (ایرج کو پیار سے ہم بابا کہا کرتے تھے) کا ذکر اب ہمارے یہاں نہیں ہونا چاہئے۔ وہ ہماری یادوں میں ہمیشہ بسا رہے گا' اسے ہم بھول نہیں سکتے لیکن دوسرے بچوں اور گھر کے خوشگوار ماحول کی خاطر ہمیں اس کے متعلق باتیں نہیں کرنا چاہئیں''۔ ہمارے لئے بھی اور ملک کے لئے بھی بڑے صبر آزما دن تھے۔ میں نے اپنی 3 ستمبر 1971ء کی ڈائری میں لکھا:۔

''آج تیسرے پہر ہمارے مغربی محاذوں پر لڑائی شروع ہو گئی۔ پاکستان ریڈیو نے شام 5 بجے کی خبروں میں بتایا کہ بھارت نے مغربی محاذ پر نئی جگہ سے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ بی بی سی نے بھی خبر دی۔ شہر میں اس وقت افراتفری پھیل گئی۔ لوگ کافی تعداد میں لاہور سے باہر جا رہے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے آج رات یہاں کے عوام کے لئے سخت کڑی ہو۔ دشمن کی بمباری اور ہوائی حملوں کا شدید خطرہ ہے۔ لاہور تو توپوں کی زد میں ہے۔ شہر میں مکمل بلیک آؤٹ ہے میں نے بچوں کیلئے پیکنگ فوراً کر دی ہے کیونکہ ان حالات میں یہاں رہنا شاید ممکن نہ ہو۔ بابا کو شاید ہسپتال میں داخل کروانا پڑے لیکن دوسرے بچے تو جا سکتے ہیں۔ آج بھی ڈاکٹروں نے اس کا پورا چیک اپ کیا ہے' دل سخت

پریشان ہے' اللہ اپنا کرم کرے۔

مغربی محاذ پر تو اب جنگ شروع ہوئی ہے۔ دراصل پاکستان میں تو مارچ سے ہی لڑائی شروع ہے، جب سے مشرقی پاکستان میں سول وار اور بدامنی کے بعد 'مکتی باہنی' نے بھارت کی بھرپور تائید سے وہاں لڑنا شروع کیا ہے۔ 22 نومبر سے تو واقعی وہاں جنگ شروع ہوگئی تھی۔ جب بھارت نے کھلم کھلا اپنی افواج مشرقی پاکستان میں لڑنے کے لئے بھیج دیں۔

6 دسمبر 1971ء

آج بابا کو ہسپتال میں داخل کروادیا۔ میں مستقل طور پر اس کے ساتھ رہوں گی۔ خورشید آتے جاتے رہیں گے۔ دوسرے بچوں کو خالہ کے پاس مردان بھجوادیا ہے۔ اللہ سے التجا ہے کہ بابا کی تکلیف معمولی نوعیت کی ہو۔ اس کی بیماری کی بے حد پریشانی ہے پھر ملک کے حالات بھی ایسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی کڑی آزمائش ہے۔

پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے اہم شہر چھمب پر قبضہ کرلیا ہے اور ہماری افواج دریائے توی کو عبور کر کے ضلع جموں میں داخل ہوگئی ہیں۔ سیالکوٹ کے محاذ پر شکر گڑھ کے علاقے میں بھی بھارتی افواج کا ایک بڑا حملہ ناکام ہوگیا ہے۔ لاہور سیکٹر میں بھی ہماری افواج دشمن کے علاقے میں کئی میل آگے ہیں۔ سکیورٹی کونسل میں بڑی طاقتوں نے بھارت اور پاکستان میں فوراً جنگ بندی پر دو قراردادیں منظور کر لی ہیں جو روس نے 'ویٹو' کر دی ہیں اور 'بنگلہ دیش' کے عوام کے مطالبہ آزادی کو تسلیم کرنے پر اصرار کیا ہے۔ ادھر چینی حکام اعلیٰ یہ اعلان کر چکے ہیں کہ اگر پاکستان کے خلاف کوئی قرارداد پیش کی گئی تو اسے وہ 'ویٹو' کر دیں گے۔ اس صورت میں سلامتی کونسل عملاً غیر موثر ہوگئی ہے اور اب معاملہ صرف اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ آج صدر نے مرکز میں ایک 'مخلوط حکومت' کا اعلان کر دیا۔ جس کے وزیر اعظم بنگال کے نور الامین اور نائب وزیر اعظم اور

وزیر خارجہ مسٹر بھٹو ہوں گے۔

لاہور میں بار ہا ہوائی حملے ہو چکے ہیں۔رات کو زیادہ ہوتے ہیں۔ بھارت کے طیاروں نے راوی کے پل اور لاہور ایئر پورٹ پر متعدد بار حملے کئے ہیں لیکن اللہ کے فضل سے ابھی تک کوئی نقصان نہیں ہوا۔خدا پاکستان کو ہر آنچ سے محفوظ رکھے۔آمین

12 دسمبر 1971ء

بابا کے متعلق ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دماغ کے دائیں طرف کسی جگہ اسے چوٹ آئی ہے جس سے بائیں طرف اثر ہے۔طبیعت اتنی پریشان اور فکر مند ہے کہ کچھ نہیں سوجھتا۔معصوم بچے کو تکلیف بھی ایسی ہوئی جس کا تعلق دماغ جیسے اہم حصے سے ہے۔اس ٹسٹ کے لئے انہیں ایک خاص انجکشن لگانا پڑتا ہے۔اس کے بعد ایکس رے ہوتے ہیں۔ان ڈاکٹروں کے ساتھ ہم دیگر ماہر ڈاکٹروں کی رائے بھی لے رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ اپنا کرم کرے۔سوچ کر دل دہل جاتا ہے۔بچوں کی تکلیف والدین کا سکون چھین لیتی ہے۔ ملک پر بھی قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔لڑائی بڑی خوفناک ہوتی ہے۔ہماری افواج مغربی محاذ پر کافی جگہوں پر دشمن کے علاقے میں ہیں۔اکھنور،فیروز پور اور امرتسر پر ہماری افواج کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔لڑائی تقریباً stand still ہو رہی ہے۔مشرقی پاکستان میں ہماری پوزیشن بہت کمزور ہے۔ BBC کے مطابق ہمارے سینکڑوں فوجی روز ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ڈھاکہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔اردگرد کی کافی جگہوں پر بھارت کا قبضہ ہو گیا ہے۔یہاں کمک پہنچانا بھی تو مشکل ہے۔بحری،بری اور ہوائی سروس کسی طرح بھی مشرقی پاکستان میں ہماری طرف سے موثر نہیں۔دکھ تو یہ ہے کہ سب کچھ ہمارے عاقبت نا اندیش حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔فوجی حکمرانوں کے تیرہ سالوں میں ملک پر دوسری جنگ مسلط ہوئی ہے۔عام شہری کا آخر کیا قصور ہے کہ اسے اتنی بڑی سزا ملے؟صرف ملی ترانوں اور نعروں سے تو لڑائیاں نہیں جیتی جا سکتیں۔ بے گناہوں کا خون کس کے سر ہے؟

صرف ملک کے حکمران ہی ذمہ دار ہیں۔آخر ایسے حالات کیوں پیدا ہوئے کہ ملک پر یہ قیامت ٹوٹی۔

17 دسمبر 1971ء

آج پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ دن ہے اور قوم کے لئے رونے کا مقام۔کل مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہماری تمام تر فوج نے اپنے جرنیل کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے اور ڈھاکہ کے ریڈ کراس ایریا میں ہماری فوج نے پناہ لی۔ اتنی جلدی اور عاقبت نا اندیشی سے 7 کروڑ باشندوں اور 56 ہزار مربع میل کا ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر گزشتہ سال ہی اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل ہو جاتا تو شاید دنیا کے نقشے پر بنگلہ دیش نہ ابھرتا لیکن ہوس اور طاقت کے نشے میں چور حکمران کب یہ باتیں سوچتے ہیں۔

پاکستان کا نصف حصہ اس سے الگ ہو گیا

آج رات سے مغربی سرحدوں پر بھی ''فائر بندی'' ہو گئی۔کیا بے معنی اور بے تکی لڑائی تھی۔ہزاروں بے گناہوں کا خون بے فائدہ بہایا گیا' شہری آبادی الگ برباد ہوئی۔ خوف و ہراس الگ پھیلا۔ یہ حقیقت ہے کہ مغربی محاذ پر بھی ہماری افواج نے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کی تو پھر اس لڑائی کا مقصد کیا تھا؟ کیا مشرقی پاکستان کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر مغربی محاذ پر لڑائی شروع کروا کے صدر نے خود کو حق بجانب قرار دلوانے کی ناکام کوشش نہیں کی؟ اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہوگی کہ نصف ملک ویسے ہاتھ سے نکل گیا اور نصف کو خود تباہی سے ہمکنار کیا۔

بابا کی بیماری کا میں جان بوجھ کر لکھنا نہیں چاہتی ورنہ میں اصل موضوع سے ہٹ جاؤں گی۔ اتنی تکلیف دہ داستان ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ دکھوں' سسکیوں اور اشکوں کی ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ 26 اپریل 1972ء کی رات بابا ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں ہمیں داغ جدائی دے گیا اور ٹھیک دو سال بعد 19 مئی 1974ء کو ہمارا سب سے

چھوٹا بیٹا عروج کامل خورشید سات سال کی عمر میں ہمیں روتا تڑپتا افق کی ان نا قابل فہم وادیوں میں کھو گیا جہاں ہماری پہنچ نہیں۔ ان دونوں بیٹوں کی المناک جدائی ہم دونوں کی زندگی کا ایک ایسا اذیت ناک حادثہ تھا جس سے ہم کبھی خود کو پہلے کی طرح محسوس نہ کر سکے۔ لیکن چونکہ دونوں اکٹھے تھے اس لئے نہ کہتے ہوئے بھی یہ دکھ دونوں بانٹ لیتے تھے۔ خورشید کے حادثے نے تو مجھے بالکل تنہا کر دیا۔ تنہا یہ غم سہنا کتنا مشکل ہے کتنا صبر آزما ہے کتنا جان لیوا ہے لیکن انسان بالکل بے بس بالکل کمزور ہے۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کاش! ایسے نہ ہوتا دو بچوں کی المناک جدائی کے بعد خورشید کا دکھ میں زندگی میں نہ دیکھتی! کاش ایسے نہ ہوتا!

عروج کو تو ہم علاج کے لئے انگلستان لے گئے۔ پہلے حادثے سے اتنا ڈر گئے تھے۔ پھر اپنی بدقسمتی کے ساتھ ڈاکٹروں کا رویہ اور ان کا آپس میں اختلاف رائے ہمارے لئے بڑا تشویش ناک تجربہ تھا۔ چنانچہ عروج جب بیمار ہوا تو ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ اس کا علاج انگلستان میں ہی ہو۔ میں یکم جولائی 1973ء کو بچے کے ساتھ نہایت آزردہ اور بھاری دل کے ساتھ لندن چلی گئی۔ ڈاکٹر اور ہسپتال میں پہلے ہی عروج کے متعلق بات کی ہوئی تھی۔ خورشید کا اس سال ویسے بھی انگلستان جانے کا ارادہ تھا۔ اپنے لوگوں کو ملنے اور کشمیر کے متعلق وہاں جلسے اور تقریریں کرنے کا ایک طویل پروگرام تھا۔ لبریشن لیگ کو انگلستان میں منظم کرنا تھا اور سیاسی صورت حال کو وہاں واضح کرنا تھا۔ وہ جولائی کے آخر میں انگلستان گئے۔ میں تو عروج کی وجہ سے ایک جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے سارے انگلستان کا بڑا کامیاب دورہ کیا۔ ہمارے ساتھ بھی کافی دن گزارے۔ بچے کی صحت کی پریشانی کے باوجود انہوں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم کس اذیت سے گزر رہے ہیں۔ ان کے کردار کا یہ ایک خاص پہلو تھا کہ وہ اپنی پریشانی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ صبر اور تحمل کے ساتھ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے کچھ ایسا ہی بنا دیا تھا حالانکہ بچے کی جان لیوا بیماری اور بڑے بیٹے کا ایک سال پہلے المناک حادثہ برداشت

کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی ۔ میں پہلے وطن واپس آ گئی' خورشید بعد میں آ ئے ۔عروج چند ماہ یہاں آ کر ٹھیک رہا۔لیکن قدرت نے بڑا سخت امتحان لیا۔ بڑی سخت آ زمائش میں ڈالا ۔ نیلی آ نکھوں اور سنہری بالوں والا، سرخ وسفید ہمارا بیٹا عروج 19 مئی 1974 ءکو ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ہم پر ایک بار پھر قیامت ٹوٹی' طوفان آیا' پہاڑ ٹوٹا ۔ ایسے سانحے پیچھے رہ جانے والوں کے لئے کیسی تلخ یادیں چھوڑ جاتے ہیں اور جانے والے اگر چہ جا کر واپس نہیں آ تے لیکن یادوں میں روز آ کر ایسے رلاتے ہیں گویا ہمارے ساتھ ہوں ۔ ان کا قرب' ان کی باتیں' ان کا وجود اپنے پاس محسوس ہوتا ہے ۔ دونوں بھائی موت کی وادیوں میں کھو کر جنت کی ابدی دنیا میں چلے گئے جہاں ایسا کوئی سانحہ نہیں ہوتا ۔ ایسی تلخ حقیقت نہیں' ایسے صدمے نہیں' ایسے دکھ نہیں لیکن ہمیں تڑپنے کے لئے چھوڑ گئے ۔

ان دونوں کا اگر ذکر کرنے لگوں انہیں یاد کروں تو خورشید کی زندگی کے متعلق جو لکھنا چاہتی ہوں' وہ نہ لکھ سکوں گی۔ اس لئے بوجھل دل اور بوجھل قلم سے اپنے پیارے جگر کے ٹکڑوں کا ذکر یہاں ختم کر دیتی ہوں ۔ یہ تو صرف میں جانتی ہوں کہ ان کی جدائی کو میں نے کیسے برداشت کیا ہے لیکن برداشت کیا ہے ۔بس ایک مجبوری ہے جس سے چھٹکارا نہیں ۔

مئی 1975 ء میں آ زاد کشمیر میں پارلیمانی طرز کا الیکشن ہوا۔خورشید لاہور سے وادئ کشمیر کی سیٹ پر بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے ۔ان دنوں آ زاد کشمیر کی چار سیاسی جماعتوں نے ''متحدہ محاذ'' قائم کیا۔حکومت سے ان دنوں خورشید کی بار بار ملاقاتیں ہوئیں ۔ لبریشن لیگ گزشتہ دس سال سے نہایت آبرو اور کامیابی سے حزبِ مخالف کا رول ادا کرتی رہی تھی ۔ الیکشن سے چند دن پہلے آ زاد کشمیر کے صدر سردار عبد القیوم کو حکومتِ پاکستان نے ان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے صدارت سے علیحدہ کر دیا تھا اور سپیکر صدر بن گئے تھے ۔مسٹر بھٹو جو ان دنوں پاکستان کے وزیر اعظم تھے الیکشن میں سیاسی پارٹیوں کو یکجا کر کے پیپلز پارٹی کی کامیابی آ زاد کشمیر میں چاہتے تھے۔ کشمیر کے لیڈروں کے آپس میں نفاق کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے

اس قدم کو کافی تقویت ملی ۔ ایسے حالات میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے ۔ اس الیکشن میں لبریشن لیگ کے 5 امیدوار کامیاب ہوئے ۔ باقی کامیاب امیدوار متحدہ محاذ کے تھے ۔ الیکشن کے نتائج کا اعلان ہوتے ہی متحدہ محاذ کے سارے کامیاب امیدواروں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا حالانکہ فیصلہ یہ نہیں ہوا تھا کہ وہ یہ کریں گے ۔ خورشید کو پھر اپنی پارٹی اور اپنے کامیاب امیدواروں کے ساتھ اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا ۔

ان دنوں پیپلز پارٹی کے اخبار مساوات میں خورشید کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا ۔ اس کے کچھ اقتباسات لکھ رہی ہوں : ۔

''کشمیر لبریشن لیگ کے پاکستان پیپلز پارٹی میں ضم ہونے سے آزاد کشمیر کی سیاست میں جناب کے ایچ خورشید کافی اہمیت اختیار کر گئے ہیں ۔ جناب خورشید آزاد کشمیر کے لئے ایک واضح موقف رکھتے ہیں اور ان کی تحریک کی منزل پاکستان سے الحاق رہی ہے ۔ اس لحاظ سے کشمیر لبریشن لیگ کی پیپلز پارٹی میں شمولیت سے جہاں آزاد کشمیر کی تحریک کو مزید تقویت ملی ہے' وہاں جناب خورشید کا یہ فیصلہ اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ وزیر اعظم بھٹو مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں ۔ جناب خورشید کو قائد اعظمؒ کے سیکرٹری ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور آج جناب بھٹو پاکستان کو مستحکم اور خوشحال بنانے کے لئے قائد اعظمؒ کے مشن کی تکمیل کے لئے کوشاں ہیں'' ۔

جناب خورشید نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کے فیصلے کے بارے میں طویل پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا ''سردار قیوم نے پچھلی دفعہ جماعتِ اسلامی سے باضابطہ امداد لے کر الیکشن جیتا ہے جس نے کشمیر میں پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے عمل دخل کی راہ ہموار کی اور اس کے ردعمل کے طور پر آزاد کشمیر پیپلز پارٹی وجود میں آئی ۔ ان حالات میں ہم نے محسوس کیا کہ تاریخ اور واقعات تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور ایسی بنیادی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے جو ہماری پالیسی پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہے ۔ لبریشن لیگ نے بارہ

سال قبل کشمیر کے مسئلے کو زندہ رکھنے اور اجاگر کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ روس نے اقوام متحدہ میں کشمیر کی قرارداد کو چونکہ ویٹو کر دیا ہے لہٰذا آزاد کشمیر گورنمنٹ کو باغی گورنمنٹ تسلیم کروا کے اس کی امداد کی جائے لیکن اس تجویز کو پاکستان کے سیاسی اور سرکاری حلقوں میں نہ تو پذیرائی حاصل ہوئی اور نہ ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ہم 12 سال تک انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ راستہ اختیار کرنا چاہئے کیونکہ افریقہ کی جوئی ریاستیں آزاد ہو رہی ہیں وہ حق خود اختیاری کی بنیاد پر آزادی حاصل کر رہی ہیں لیکن ہماری تجویز کو رد کر دیا گیا اور الٹا ہم پر یہ الزام لگایا گیا کہ ہم علیحدگی پسند اور ہندوستان کے ایجنٹ ہیں۔ اس وجہ سے کشمیر کو پاکستان سے الگ رکھنا چاہئے چنانچہ اس پراپیگنڈہ کے بوجھ تلے اس کی افادیت عوام کے ذہن نشین نہیں ہوسکی اور ہم نے بھی محسوس کیا کہ موجودہ حالات میں اس تجویز پر زور دینا مناسب نہیں۔

جناب خورشید نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ 1940ء میں پاکستان کی قرارداد منظور ہوتے وقت ہم نے یہ عہد کیا تھا کہ سری نگر مسلم سٹوڈنٹس یونین پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد کرے گی۔ اس پاکستان کے لئے جس میں 'ک' کا مطلب کشمیر ہے لیکن 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد کشمیر کا مسئلہ اٹک گیا۔ اقوام متحدہ میں جانے سے اس کے پر امن حل کی جو توقع تھی وہ بھی ادھوری رہی۔ 1957ء میں روس نے پہلی بار ویٹو کیا تو ہم متبادل حالات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو گئے اور کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس جدوجہد کے لئے آزاد کشمیر کی حکومت کو نمائندہ حکومت تسلیم کیا جائے اور بین الاقوامی طور پر اس مسئلہ کو آزاد کشمیر کی خود مختار حکومت کی طرف سے اٹھایا جائے لیکن بنیادی مقصد وہی تھا کہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر پارٹی کی تجویز کو پاکستان اور رائے عامہ کی تائید حاصل نہیں ہوتی تو ہم آگے نہیں چل سکتے اور اگر پاکستان میں اس تجویز کو پذیرائی حاصل نہ ہوسکی تو اس صورت میں دوسرا متبادل راستہ اختیار کریں

گے۔ چنانچہ اس بدلتی ہوئی فضا اور نظریہ کے مطابق ہم نے بہتر سمجھا کہ پاکستان کی کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے پاکستان کے نظریہ کو تقویت دینے کے لئے اپنی پارٹی پیپلز پارٹی میں ضم کر دی ہے۔ ہم نے پاکستان اور کشمیری عوام کے درمیان وسیع تر بنیادوں پر اعتماد کو مضبوط کیا ہے۔

پاکستان کی کسی اور سیاسی جماعت میں شمولیت نہ کرنے اور پاکستان پیپلز پارٹی میں ضم ہونے پر اعتراضات کے بارے میں سوال پر مسٹر خورشید نے کہا ''ہمارے لئے یہ ضروری تھا کہ ہم غیر جانبداری سے یہ فیصلہ کریں کہ ہمیں پاکستان کی کس پارٹی میں شامل ہونا چاہئے اور کشمیریوں کا مفاد کس میں ہے۔ پاکستان کی سیاسی پارٹیوں میں سے کالعدم ''نیپ'' کا ذکر بھی نامناسب ہے کیونکہ اس کے پاکستان کے منافی موقف اور پالیسی کے باعث اسکے ساتھ کسی قسم کے اشتراک کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ جمعیت العلمائے اسلام' مفتی گروپ اور دوسری جماعتیں علما کی جماعتیں ہیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ عوام پر ان کے دروازے بند ہیں اور یہ جماعتیں صرف علما تک محدود ہیں۔

جہاں تک جماعتِ اسلامی کا تعلق ہے' اسے میں نے کبھی سیاسی جماعت سمجھا ہی نہیں اور شروع سے میرا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ اگر جماعت اسلامی اپنی سرگرمیاں اسلام کی تبلیغ' اسلامی عقائد اور اصولوں کو عوام تک واضح طور پر پہنچانے کے سلسلے میں کام کرتی رہی تو ملک وقوم کی بہتر خدمت ہوگی۔ اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی کے کردار کے بارے میں جو بحث چل نکلی ہے اور اس جماعت کے ذمہ دار اراکین جس طرح واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں' اس سے بھی ہمارا یہ یقین مضبوط ہو جاتا ہے کہ جماعت کو سیاسی سرگرمیاں چھوڑ دینا چاہئیں اور بجائے اس کے کہ قومی معاملات میں تلخی پیدا کی جائے اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہئے۔

بعض دوستوں نے مسلم لیگ میں شامل نہ ہونے کی شکایت کی ہے مگر میں نے

جس مسلم لیگ میں قائداعظمؒ کی زیر قیادت کام کیا' وہ آل انڈیا مسلم لیگ تھی ۔ میں بمبئی شہر میں سٹی پرائمری مسلم لیگ کا چار آنہ کا ممبر تھا۔ یہ مسلم لیگ 1948ء میں ختم ہوگئی اور اس کی جگہ دو جماعتیں پاکستان مسلم لیگ اور انڈین یونین مسلم لیگ اس کی جانشین بنیں مگر ان میں سے کسی کے ساتھ میرا واسطہ نہیں تھا مگر جذباتی لگاؤ کے باوجود مسلم لیگ نے 7 سال برسراقتدار رہنے کے باوجود آئین سازی میں ناکامی' انتخابات سے گریز اور نوکر شاہی کا غلبہ پیدا کر کے ملک کو ایسی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ عقیدت یا وابستگی کا سوال باقی نہیں رہا اور پھر یہ مسلم حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈروں نے سکندر مرزا سے کہہ کر پاکستان میں مارشل لاء لگوایا جس سے ملک کو بارہ سال کی طویل آمریت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر جمہوریت پر اپنا اعتماد کھو بیٹھے تھے اور میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ قائداعظمؒ کا کوئی سچا رفیق جمہوریت سے انحراف کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں کشمیر کے معاملات میں بھی مسلم لیگی حکومتوں نے جو پالیسی اختیار کی' وہ کافی حد تک افسوس ناک تھی اور اس پالیسی کے مضر اثرات سے ابھی تک آزاد کشمیر کو پوری طرح نجات حاصل نہیں ہوسکی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ کی موجودہ قیادت اور تنظیموں میں سے کسی میں ہمارے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ مزید یہ کہ لبریشن لیگ نے ہمیشہ جمہوری انداز سے اپنے فیصلے اور لائحہ عمل مرتب کیا ہے اور ہمارے کارکنوں کی بھاری اکثریت پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کے حق میں تھی۔

شملہ معاہدہ کے بارے میں بعض سیاسی حلقوں میں جس قسم کی قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں اور خود جناب خورشید کے ذہن میں اس وقت اسی مسئلہ کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں' اس بارے میں جناب خورشید نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "شملہ معاہدہ کے بعد جب سیز فائر لائن کا نام لائن آف کنٹرول رکھا گیا تو اس سے بعض حلقوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے کیونکہ ان کے فوری بعد ہندوستان نے یو-این-او کے مبصروں کی

واپسی کا مطالبہ کر دیا تھا مگر بعد میں پوزیشن واضح ہو گئی کہ نام بدلنے سے مسئلہ کی نوعیت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ جہاں تک شملہ معاہدہ کا تعلق ہے تو ہمارا اپنا نظریہ یہ رہا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ اگر پاکستان کے تعلقات بہتر ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن ماضی کے حالات اور واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کشمیر کے بارے میں اگر سودے بازی سے ہندوستان کو خوش کرنا یا اس کی دوستی مطلوب ہے تو یقیناً ہمارے لئے یہ قابلِ قبول نہیں ہو گا اور اب بھٹو صاحب اور پاکستان کی موجودہ حکومت نے سفارتی تعلقات کی بحالی' ذرائع آمدورفت اور رسل ورسائل کو بھی بحال کر دیا ہے اور اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے پہل بھی کی ہے تو اب یہ ذمہ داری ہندوستان پر آن پڑی ہے کہ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پیش قدمی کر کے اس کے مناسب حل کے لئے آگے بڑھے''۔

ان ہی دنوں مظفر آباد میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے خورشید نے کہا اگر صدر بھٹو شملہ معاہدہ کے تحت کشمیر کے کسی مثبت حل کے بارے میں پر امید ہیں تو ہم پُر امن کوششوں کے نتائج کا انتظار کریں گے لیکن اس کے بعد آزاد کشمیر حکومت کو ساری ریاست کی نمائندہ حکومت تسلیم کرنے یا اس کے متبادل کسی ٹھوس پروگرام بنانے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ صدر بھٹو سے یہ منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے آزاد کشمیر حکومت کو تسلیم کرانے کے مطالبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ 25 سال میں پاکستان کی کسی حکومت نے اسے مقصد نہیں سمجھا۔ ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ گزشتہ حکومتوں نے مسئلہ کشمیر کے اس پہلو پر غور نہیں کیا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے جذباتی نعرہ بازی ترک کر کے مثبت پروگرام اپنانا چاہئے۔ جہلم ویلی روڈ کو مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے لوگوں کی آمدورفت کے لئے کھول دینا چاہئے۔ آزاد کشمیر کی برسر اقتدار جماعت اس علاقہ پر اکتفا کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں کسی متفقہ قرارداد کا ذکر کیا جا رہا ہے جس سے حکومت پاکستان سے قومی اسمبلی میں نمائندگی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مسئلہ قوم کے مستقبل سے تعلق

رکھتا ہے۔ کسی گروہ کو اختیار نہیں کہ وہ قوم کو بے خبر رکھ کر کسی قسم کی سودے بازی کرے۔ ایسی اگر کسی قرارداد کا وجود ہے تو اس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں اور ایسی ہر کوشش جو کشمیریوں کے حق خودارادیت کے منافی اور کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرنے پر مبنی ہوگی' آزاد کشمیر کے عوام قبول نہیں کریں گے۔ ایک طرف بھارت کنٹرول لائن کو مستقل سرحد قرار دے رہا ہے جیسا کہ سورن سنگھ کے بیانات اور مغربی ممالک کے اخبارات کے تبصرے اس قسم کا تاثر دے رہے ہیں اور دوسری طرف آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے اور پاکستان کی قومی اسمبلی میں نمائندگی کا مطالبہ کرنے سے شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ حکومت پاکستان کو چاہئے کہ اس بارے میں اپنی پوزیشن واضح کرے۔ اگر بھارت پاکستان کے ساتھ کشمیر سمیت تمام جھگڑے نیک نیتی سے طے کرنا چاہتا ہے تو اسے جنگی قیدیوں کو بلا تاخیر واپس کرنا چاہئے۔

خورشید بے انتہا خوبیوں کے مالک تھے۔ سیاست اور وکالت کے ساتھ دوسرے بے شمار کاموں میں ان کی دلچسپی تھی۔ کئی صحت مند مشاغل تھے جن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور تھا۔ اپنے ملک کی زبانیں تو تقریباً سب ہی نہایت اچھی طرح سے بولتے اور سمجھتے تھے لیکن جرمن' فرانسیسی' ہسپانوی' روسی اور فارسی زبانیں بھی بول سکتے تھے۔ یہ سب انہوں نے خود سیکھی تھیں' ان کتابوں کی مدد سے جو زبانیں سکھانے میں مددگار ہوتی ہیں۔ ان کی میز پر کسی نہ کسی زبان کی کتاب اور نوٹ بک رہتی تھی۔ فرصت کے اوقات میں ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ برصغیر کی زبانوں میں ہندی' کشمیری' سندھی اور پہاڑی مرہٹی زبان بھی بول اور لکھ سکتے تھے۔ بہترین مقرر تھے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں نہایت عمدہ تقریر کرتے تھے۔ کشمیری زبان کے بھی نہایت اچھے مقرر تھے اور عجیب بات یہ تھی کہ کبھی لکھ کر یا پڑھ کر انہوں نے تقریر نہیں کی۔ فی البدیہہ بولتے تھے اور بہت روانی سے بولتے تھے۔ مجھے کبھی یہ یاد نہیں کہ کسی خاص تقریب کے لئے انہوں نے تقریر کی مشق کی ہو یا کچھ لکھا ہو یا تیاری کی ہو۔ ان کے ذہن میں موضوع کے متعلق سب کچھ ہوتا تھا اور

جب بولتے تھے تو یوں لگتا تھا کہ ایک سمندر موجزن ہے۔ طرز انداز اور طرز بیان نہایت مسحور کن ہوتا تھا۔

مطالعے کی بھی انہیں بہت عادت تھی۔ زیادہ تر سوانح انہیں پسند تھیں۔ Sherlock Homes ان کی پسندیدہ کتاب تھی۔ اس کے علاوہ ہلکے پھلکے مطالعے میں fiction اور جاسوسی کتابیں بھی پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ اخباروں اور رسائل کا مطالعہ ان کے روزمرہ کے معمولات میں سے تھے۔ بہت کچھ تھوڑے وقت میں پڑھ لیتے تھے۔ کبھی کبھار لطیفوں کی کتابیں اور مزاحیہ کتابیں بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ریڈیو سے ہر اسٹیشن اور ہر جگہ کی خبریں سننا ان کی عادت تھی۔

اگست 1975ء میں حکومتِ پاکستان نے کشمیر سٹیٹ کونسل کی تشکیل کے سلسلے میں خورشید کے ساتھ کافی گفت وشنید کی۔ حکومت انہیں امورِ کشمیر کا مشیر بنانا چاہتی تھی۔ اس عہدہ کا سٹیٹس فیڈرل منسٹر کے برابر تھا۔ رہائش اسلام آباد میں تھی۔ اس کے ساتھ آزاد کشمیر اسمبلی کی سیٹ بھی برقرار رہنا تھی لیکن خورشید نے حکومت کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ محدود اختیارات میں وہ اپنے لوگوں اور ملک کے لئے کچھ نہیں کرسکیں گے اور محض عہدہ قبول کرنا زندگی میں کبھی بھی ان کا نصب العین نہیں تھا۔ اگر وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ عام آدمی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے اور کوئی خاص عہدہ کسی بہتر غرض کے لئے نہیں ہے تو انہوں نے کبھی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی۔ اس لئے آزاد کشمیر کی صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد وہ ہمیشہ اپوزیشن میں رہے لیکن اس حیثیت سے بھی اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی۔ آزاد کشمیر اسمبلی میں ان کی تقریریں، حکومت کی غلط پالیسیوں پر اعتراضات اور عوام کے حقوق کے لئے جدوجہد ان کی سیاسی زندگی کا ایک درخشاں باب ہے۔

قائداعظمؒ اکیڈیمی کے قیام کا مقصد بابائے قوم کی سوانح عمری لکھنا اور ان کے سارے کاغذات یکجا کرنا تھا جو چند سال قبل 1979ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں

قائداعظمؒ کے وہ تمام رفقاء اورتحریک پاکستان کے وہ سارے لوگ شامل تھے جنہوں نے حصول آزادی کے لئے جدوجہد کی تھی۔ خورشید سوانح عمری کی کمیٹی کے ممبر اور بورڈ آف گورنرز کے ممبر بھی تھے۔ وہ ہمیشہ باقاعدگی سے اس کی میٹنگ میں کراچی جاتے اور ان کی ہر کوشش میں شریک ہوتے۔ میں ان سے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ قائداعظمؒ کو ان کا سب سے بڑا خراج تحسین یہ ہوگا کہ وہ ان کے متعلق کتاب لکھیں۔ 47-1946ء کے تاریخ ساز دور کے متعلق آنے والی نسلوں کے لئے وہ چشم دید واقعات کا ریکارڈ محفوظ رکھیں جسے انہوں نے اتنے قریب سے دیکھا ہے۔ وہ یہ کرنا چاہتے بھی تھے لیکن اس اہم کام کے لئے انہیں پوری یکسوئی اور توجہ کی ضرورت تھی' وقت کی ضرورت تھی جس کا انہیں موقع نہ ملا۔ کاش! ایسا ہوتا۔ ان کے ذہن میں تو خزانے مدفون تھے۔ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ اس دور کی ایک ایک بات انہیں یاد تھی۔ افسوس ایسا نہ ہوسکا اور جب ارادہ کیا تو زندگی نے مہلت نہ دی۔

خورشید اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی طبیعت میں دھیما پن اور ٹھہراؤ تھا۔ ایک ہی وقت میں کئی کام کرتے تھے۔ بے انتہا مصروفیت ہوتی تھی لیکن رویہ اتنا پُرمتانت ہوتا تھا گویا انہیں کسی بات کی جلدی نہ ہو' عجلت نہ ہو اور بہت فرصت ہو حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بسا اوقات اتنے مصروف ہوتے تھے کہ اپنے کئی ضروری کام رہ جاتے تھے۔ آرام کرنے کے لئے وقت نہیں ملتا تھا نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔ نیند سے مجھے یاد آیا کہ جب بھی ہم سفر کرتے خواہ جہاز کا ہو' ٹرین کا ہو یا موٹر کا' وہ ہمیشہ سوجایا کرتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے میں تو اپنی نیند سفر میں پوری کرتا ہوں۔ اس منحوس سفر میں جس نے ان کی جان لی' مجھے یقین ہے وہ ضرور سو گئے ہوں گے اور نیند میں انہیں معلوم ہی نہیں ہوا ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ حادثے کے بعد ان کا چہرہ پرسکون تھا۔ اس پر کوئی کرب نہیں تھا۔ انہیں یقیناً حادثے کا علم ہی نہیں ہوا اور منٹوں میں زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔

لاہور میں 1984ء میں ایک ''پاکستان سوسائٹی'' قائم ہوئی۔ خورشید اس کے

بنیادی رکن تھے۔ انہوں نے سوسائٹی کے قیام اور اس کے امور میں بھرپور دلچسپی لی۔ اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ ملک کے سیاسی مسائل بالخصوص یک جہتی کے معاملے پر غور و خوض کرنے اور اس کو فروغ دینے کے لئے کوئی اور سیاسی فورم موجود نہ تھا۔ سیاسی اجتماعات پر مارشل لاء حکم کے تحت پابندی عائد تھی۔ اگست 1983ء میں جب ایم آر ڈی نے تحریکِ بحالیٔ جمہوریت شروع کی تو متعدد وجوہ کی بنا پر سندھ میں اس کا کردار سندھی قومیت کی شکایات کے اظہار سے وابستہ ہو گیا۔ لاہور کے جمہوریت پسند حلقوں میں یہ اظہار دوچند ہو گیا کہ اہلِ پنجاب نے جمہوریت کی بحالی کے لئے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی سندھی بولنے والے توقع رکھتے ہیں۔ اس احساس کے اظہار کے لئے ملک امجد حسین ایڈووکیٹ اور محمود مرزا ایڈووکیٹ نے مل کر ستمبر 1983ء میں روزنامہ جنگ میں ایک مضمون لکھا جس میں اہلِ پنجاب کو یہ ترغیب دی گئی کہ وہ آئین اور جمہوریت کی بحالی کے لئے جمہوری کردار ادا کریں۔ میاں ممتاز دولتانہ، ڈاکٹر مبشر حسن، پروفیسر محمد عثمان اور خورشید نے اس موقف کی تائید کی۔ اسی اثناء میں سندھ کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے محمود مرزا نے نومبر 1983ء کے دوران سندھ کا تفصیلی دورہ کیا اور ''آج کا سندھ'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ میں ایک مفصل رپورٹ لکھی۔ اس رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد متعدد سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں نے فیصلہ کیا کہ دانشوروں کی سطح پر ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جو علاقوں کے مابین شکایات پر غور کر کے قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے کردار ادا کرے۔ اس مقصد کے لئے ''پاکستان سوسائٹی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی جس میں مندرجہ ذیل افراد شریک ہوئے:-

میاں ممتاز دولتانہ، ملک وزیر علی، ملک معراج خالد، عابد حسن منٹو، ڈاکٹر مبشر حسن، فخر زمان، کے ایچ خورشید، ڈاکٹر پرویز حسن، حسین نقی، ڈاکٹر نذیر احمد، صفدر حسن صدیقی، ظہور عالم شہید، پروفیسر محمد عثمان، نصیر اے شیخ، عبداللہ ملک، خورشید محمود قصوری، سید افضل حیدر، ملک امجد

حسین محمود مرزا۔ خورشید کے کہنے پر ''انصاف'' اخبار کے ایڈیٹر میر عبدالعزیز کو بھی رکن بنایا گیا۔ محمود مرزا اس کے کنوینر مقرر ہوئے۔ اس کے متعدد اجلاس ملک امجد حسین کے گھر پر منعقد ہوئے۔ ان اجلاسوں میں غلام مصطفیٰ شاہ، میر غوث بخش بزنجو، نواب زادہ نصر اللہ خان، یحییٰ بختیار، جسٹس یعقوب علی خان، ایئر مارشل اصغر خان اور ڈاکٹر مبشر حسن نے جمہوری، آئینی اور قومی مسائل پر خطاب کیا۔ خورشید نے 20 مارچ 1984ء کو ''کشمیر اور پاکستان کی سلامتی'' کے عنوان پر تقریر کی۔ اس کی رپورٹ اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔

سوسائٹی نے یک جہتی کے مسائل کے حل کے لئے ایک تین نکاتی پروگرام بھی طے کیا جس میں یہ کہا گیا کہ صوبائی خودمختاری کا دائرہ بڑھایا جائے۔ حکومت کا نظم ونسق چلانے کے لئے ریاستی اختیارات کی تقسیم میں توسیع کر کے انہیں عوام کے قریب لایا جائے اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے بڑی سیاسی جماعتوں کو ایک معاہدے پر آمادہ کیا جائے کہ آئندہ انتخابات کے بعد تمام سیاسی جماعتیں مل کر حکومت بنائیں تاکہ مل کر آئین اور قوانین اور نظم ونسق کے ڈھانچے میں اس پروگرام کے مطابق ترمیم کر سکیں۔ اس پروگرام پر اتفاق رائے حاصل کرنے کے لئے ایک چار رکنی کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں ڈاکٹر مبشر حسن، کے ایچ خورشید، ملک امجد حسین اور محمود مرزا شامل تھے۔ اس کمیٹی نے ایم آر ڈی اور اس سے باہر تمام قابل ذکر رہنماؤں کو اس بارے میں تفصیلی مراسلے ارسال کئے۔ 'پاکستان سوسائٹی' کی یہ کاوش اس حد تک کامیابی سے ہمکنار ہوئی کہ صوبائی خودمختاری کے معاملے پر ایم آر ڈی میں شامل تمام جماعتوں میں اتفاق رائے ہو گیا مگر جہاں تک بعد از انتخابات تمام سیاسی جماعتوں کی قومی حکومت کے قیام کا تعلق ہے، اس پر بڑی سیاسی جماعت متفق نہ ہو سکی۔ اس کے نتیجے میں صوبائی خودمختاری کے حق میں ایم آر ڈی کی قراردادوں پر عمل نہ ہو سکا۔

خورشید پاکستان سوسائٹی کے اس موقف کے پُر زور حامی تھے کہ ملکی آئین کو جمہوریت اور وفاقی نظام کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے عارضی دور کے لئے تمام

سیاسی جماعتوں کی قومی حکومت بہت مفید کردار ادا کرسکتی ہے۔وہ باقاعدگی سے "پاکستان سوسائٹی" کی میٹنگ میں شریک ہوتے تھے۔اگر لاہور سے باہر ہوتے تھےتو مجبوری تھی ورنہ کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔خورشید پاکستان فلسطین دوستی کے بھی صدر تھے۔اس کا دفتر انہوں نے اپنے دفتر میں ہی بنایا ہوا تھا۔تنظیم کے پاس فنڈ کم تھے'اس لئے اس کیلئے دفتر بنانا آسان نہیں تھا۔گھر میں بھی میٹنگ کرتے'دفتر میں بھی کرتے اور فلسطینی طلبا کے مسائل پر پوری توجہ دیتے۔ان کی ہر طرح مدد کرتے'ان کی رہنمائی کرتے۔فلسطینیوں کی جنگ بھی توظلم کے خلاف ایک جہاد تھا۔چونکہ کشمیر میں بھی یہی مسئلہ تھا اور ان کے ہم وطن بھی ان کی طرح ظلم و تشدد کا شکار تھے'اس لئے اہل فلسطین سے انہیں بہت ہمدردی تھی۔ویسے بھی انسانیت کے ناتے دنیا کے کسی کونے میں آزادی کی جدوجہد میں خورشید کی بھرپور ہمدردیاں محکوم اور پسے ہوئے عوام کے ساتھ ہوتی تھیں۔ان کے لئے محسوس کرتے تھے اور اپنی پہنچ کے مطابق ہر طرح ان کے ساتھ ہوتے تھے۔وہ جمہوریت اور آزادی کے دیوانہ وار شیدائی تھے اور اس جذبے کے لئے وہ کسی بھی انسان کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

1984ء میں خورشید نے پھر ایک بار انگلستان کا دورہ کیا۔اپنے لوگوں سے ملے' جلسے کئے'تقریریں کیں'لبریشن لیگ کی تنظیم کو وہاں زیادہ موثر کیا۔لوگوں کو "مسئلہ کشمیر" کے آئینی اور سیاسی پہلوؤں سے روشناس کیا۔امریکہ بھی گئے'پاکستانی احباب سے بھی ملے۔یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں مسئلہ کشمیر پر تقریریں کیں۔اخبار والوں کو انٹرویو دیئے اور دو ماہ کے سفر اور مصروفیات کے بعد جب واپس وطن آئے تو تھکاوٹ کے باوجود اتنے تروتازہ اور شاداب تھے گویا کوئی مقصد پالیا ہو۔

باب دوم

قائداعظمؒ میری نظر میں

برصغیر کی تحریکِ آزادی میں قائداعظمؒ کے کردار کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مگر پیشتر اس کے کہ ہم ان مختلف باتوں کا تذکرہ کریں، ایک اہم بات پر زور دینا لازمی ہے اور جو اکثر لوگ جانتے ہوئے بھی محسوس نہیں کرتے وہ یہ ہے کہ برصغیر کی تحریکِ آزادی میں طویل ترین جدوجہد اور سب سے طویل سیاسی کردار قائداعظمؒ کا ہے۔ 1910ء سے 1947ء تک وہی اس پر چھائے رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو تو بہت بعد میں آئے۔ قائداعظمؒ تو پنڈت موتی لال نہرو کے ہم عصر تھے جن کا اپنا سیاسی کردار مختصر تھا۔ گاندھی بھی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد برصغیر میں داخل ہوئے۔ ابوالکلام آزاد بھی بہت کم عرصہ سیاست میں رہے۔ اگرچہ کانگرسی لیڈروں میں ان کی سیاسی زندگی سب سے لمبی ہے۔

اس طرح برصغیر کی آزادی کے وقت قائداعظمؒ کو سیاسی میدان میں اترے ہوئے پورے 37 سال ہوئے تھے اور اس طویل سفر میں بے شمار نشیب و فراز، خاردار اور تنگ و تاریک موڑ ان کے راستے میں آئے۔ کئی بار مایوسی کے بادل بھی چھائے مگر انہوں نے برصغیر کی آزادی کی جنگ جاری رکھی۔

میں عملاً یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میرا اپنا تجربہ ہے کہ برصغیر کی جدوجہد میں سب سے نمایاں، اہم، مثبت کردار اور کاوش قائداعظمؒ کی ہی رہی ہے۔

ایم کے گاندھی

اس میں شک نہیں کہ ایم کے گاندھی ہندو ہونے کی وجہ سے ہندو عوام میں اپنے مذہبی رشتے کی وجہ سے مقبول ہوئے اور چونکہ برصغیر میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی، اس

کی وجہ سے برصغیر کے بیشتر حصوں میں ہندو عوام نے ان کا ساتھ دیا اور وہ بیرونی دنیا میں اس وقت زیادہ شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ بھی درست ہے کہ ہندوؤں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں مسٹر گاندھی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قائد اعظمؒ

برصغیر کی تحریکِ آزادی کو مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ ہمارے مخالفوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ قائد اعظمؒ کا کردار، ان کی سیاسی بصیرت اور ان کا عمل سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ انہوں نے تحریک آزادی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھی۔ سیاسی، آئینی، بین الاقوامی اور انقلابی رخ ہمیشہ مدنظر رکھے۔ اس کے برعکس کانگرسی لیڈرشپ جذبات کا شکار رہی۔ کبھی کبھی پنڈت نہرو، اپنے تخیل میں کھو کر کسی موہوم قسم کے سوشلزم اور لادینیت کی بات ضرور کرتے تھے لیکن اس کا ہندوستان کی عملی سیاست پر کوئی اثر نہ پڑا۔

چنانچہ میں یہی کہوں گا کہ برصغیر کی آزادی اور انگریز کو برصغیر سے نکالنے کے لیے نیز ہندوستان اور پاکستان کے قیام کے سلسلے میں قائد اعظمؒ کا سیاسی کردار ان تمام لیڈروں سے زیادہ مثبت، سائنٹفک، عوامی امنگوں اور خواہشات سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔

قائد اعظمؒ کی طویل زندگی کے مختلف دور ہیں۔ ایک دور قائد اعظمؒ کی انگلستان سے واپسی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو سے شروع ہوتا ہے جبکہ تنظیمِ نو کے اس پس منظر میں یہی بات تھی کہ اب برصغیر کی آزادی کے لیے تقسیم ہی ایک واحد حل رہ گیا تھا اور مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی کارروائی اسی مقصد سے کی جا رہی تھی۔

قائد اعظمؒ نے مجھے خود بتایا کہ وہ لندن میں علامہ اقبالؒ سے 1930ء میں بڑے طویل تبادلۂ خیال کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ برصغیر کے تحفظ کے لیے واحد قابلِ قبول حل یہی ہوگا کہ برصغیر کو تقسیم کیا جائے اور مسلمانوں کی علیحدہ مملکت قائم کی جائے۔ قائد اعظمؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اقبالؒ عملی سیاست دان نہیں تھے، وہ شاعر اور مفکر تھے۔ انہوں

نے برصغیر میں آتے ہی 1930ء میں مسلم لیگ الہ آباد کے اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں تقسیم کا تصور پیش کر دیا مگر بقول قائداعظمؒ میں چونکہ سیاست دان ہوں، یہاں آکر حالات اور عوامی رجحانات کا جائزہ لیے بغیر ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے لیے ہمیں عوام کے ذہنوں کو تیار کرنا تھا۔ چنانچہ انگلستان سے واپسی کے بعد 1940ء تک قائداعظمؒ مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں مسلمانوں کے ذہنوں میں آہستہ آہستہ یہی تاثر دیتے رہے کہ انہیں مستقبل کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ پھر ایک قدم آگے چل کر انہوں نے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے نظریہ کو مسلم لیگ کی وساطت سے عوام کو ذہن نشین کروایا۔

قراردادِ پاکستان

بالآخر 1940ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی مگر ان کی محتاط روش کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ خود قراردادِ پاکستان میں پاکستان کا کوئی ذکر نہیں تھا بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور کے اجلاس میں شمولیت کے لیے جب وہ دہلی سے روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے تو اس وقت بھی ان کا ذہن واضح نہیں تھا کہ اس اجلاس میں علیحدہ مسلم مملکت کی تجویز پیش کرنا مناسب ہوگا یا قبل از وقت ہوگا۔

چنانچہ قائداعظمؒ نے مجھ سے خود فرمایا کہ میں ابھی تک کوئی آخری فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ دہلی سے روانگی سے ایک روز قبل مجھے ایک چھوٹا سا پارسل ملا۔ لاہور کے ایک بچے نے رومال کا ایک تحفہ میرے لیے بھیجا تھا جس پر ہندوستان کا نقشہ بنایا گیا تھا اور اس میں سبز رنگ کے دھاگے سے پاکستان کے علاقے ظاہر کیے گئے تھے۔

ان کا فرمانا تھا کہ میں نے محسوس کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مسلمان بچوں کے ذہنوں میں بھی علیحدہ مملکت اور قومیت کا تصور آ چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علیحدہ ملک کے مطالبے کے لیے نفسیاتی اور سیاسی طور پر صحیح وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ لاہور میں یہ قرارداد پیش کر دینی چاہیے۔

جنگ عظیم کے اثرات

دوسری جنگِ عظیم کے ابتدائی ایام میں انگریزوں کو ناکامی اور ہٹلر کو متواتر کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اور یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ روس اور ہٹلر باہمی سمجھوتہ کر کے برطانوی سلطنت کے ٹکڑے کر دیں گے۔ اس لیے ایسے وقت میں برصغیر کے ہندو اور مسلمانوں کو آپس کے اختلافات ختم کر کے صورتِ حال کو مزید نہیں بگاڑنا چاہیے۔

مگر میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ قائد اعظمؒ اسی خطرے کے پیشِ نظر ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کو بلا تاخیر اپنے علیحدہ وطن کے قیام کے لیے تیار کرنے کی مہم کا آغاز کر دینا چاہیے۔

پٹنہ اجلاس کے بعد

بہر حال، ان محرکات کے علاوہ اور وجوہات بھی تھیں جن کے باعث آل انڈیا مسلم لیگ نے برطانوی حکومت، ہندوؤں اور برصغیر کی دیگر اقوام نیز تمام دنیا پر اپنے مؤقف کی واضح نشاندہی کرنا تھی۔ لیگ کی تنظیم نو کے اس دور میں 1938ء میں پٹنہ اجلاس کے بعد لیگ کے حق میں وسیع پیمانے پر عوامی رجحان شروع ہو گیا تھا۔ بالخصوص پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات خان، بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق اور وزیر اعظم بہار کی شمولیت سے ہندوستان کے باہر بھی لیگ کے وجود کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے قبول کیا گیا تھا اور اس کا نوٹس خاص طور پر برطانیہ میں بھی لیا گیا کیونکہ جنگ کے دوران پنجاب سے فوجی بھرتی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بنگال کی اہمیت کلکتہ کی بندرگاہ کی وجہ سے تھی جو کہ پوری برطانوی سلطنت میں لندن کے بعد دوسرے نمبر پر تھی، نیز جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی سلطنت کے مختلف علاقہ جات پر نگرانی اور ان کے فوجی منصوبوں کے لیے تھی، اس وجہ سے بھی پٹنہ اجلاس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ ایک طاقت کی حیثیت سے ابھری۔

پنڈت نہرو کو چیلنج

اس سال قائد اعظمؒ نے پنڈت نہرو کے اس بیان کو چیلنج کیا کہ برصغیر میں صرف دو طاقتیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ برصغیر میں تین طاقتیں ہیں۔ تیسری طاقت مسلمان ہیں جن کی قیادت مسلم لیگ کر رہی ہے۔ عوامی مقبولیت اور بین الاقوامی اہمیت حاصل کرنے کے بعد اب مسلم لیگ اس مرحلے میں داخل ہوگئی تھی جہاں اس کی واضح منزل کی نشاندہی ہر کوئی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ 1940ء میں لاہور کے اجلاس میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے کی باقاعدہ قرارداد منظور ہوئی۔

جنگِ عظیم کے بعد

1944ء میں بین الاقوامی صورتِ حال اور جنگ کی کیفیت بدل چکی تھی اور یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ برطانیہ اور اتحادی قوتیں جنگ جیت جائیں گی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ برطانوی حکومت اب برصغیر پر اپنا کنٹرول جاری نہیں رکھ سکے گی اور برصغیر کی آزادی کا مسئلہ فیصلہ کن مراحل میں داخل ہوجائے گا۔ جہاں تک مسلم لیگ کی تنظیم کا سوال تھا، اس وقت وہ زیادہ وسیع پیمانے پر عوامی امنگوں اور خواہشات کی ترجمان بن گئی تھی۔ اس وجہ سے قائد اعظمؒ نے ملک خضر حیات ٹوانہ کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا جس کے نتیجے میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹیاں الگ الگ ہوگئیں۔ مسلم لیگ نے اپوزیشن میں بیٹھ کر پنجاب میں اپنی تنظیم کو وسیع بنیادوں پر دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف کانگرس کی ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک بھی ختم ہو چکی تھی اور کانگرسی لیڈر برطانوی حکومت کے ساتھ گفت وشنید کے بہانے تراش رہے تھے۔ سر تیج بہادر سپرو اور بعض نام نہاد لبرل لیڈروں کی کوششوں سے وائسرائے اور کانگرسی لیڈروں کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا اور برطانوی حکومت نے مسٹر گاندھی کو جیل سے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علاوہ ازیں کانگرس کے اندر ایک ایسا گروپ بھی پیدا ہو گیا تھا جو ہندوستان چھوڑ دو کی

تحریک کی ناکامی کے بعد مسلم لیگ کے ساتھ رابطہ قائم کر کے انگریزوں کے خلاف مشترکہ طور پر جدوجہد تیز تر کرنا چاہتا تھا۔ اس خیال کے لوگوں میں کچھ عرصہ پہلے راج گوپال اچاریہ نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر کے مسلم لیگ کے ساتھ گفت وشنید کی تھی۔

ریاستِ کشمیر کی سیاست

1944ء میں قائداعظمؒ کی کشمیر آمد پر ریاست کے اندر مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے خیر خواہوں کی سیاست تھی۔ یہ لوگ اس وقت تک اپنی سابقہ پالیسی پر قائم تھے اور گوپال سوامی آئنگر نے کشمیر کے اندر کانگریس کے اثر ورسوخ کو بڑھانے کی جو کوششیں کی تھیں' ان کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس وقت کے نئے وزیراعظم سر بینگل نرسنگھ راؤ ایک غیر متنازعہ، آزاد خیال قانون دان کی حیثیت سے کسی قسم کا سیاسی رجحان نہیں رکھتے تھے اور اپنے پیشرو کنور مہاراج سنگھ سے مختلف تھے جنہوں نے 4 ماہ کی مختصر وزارت کے بعد استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں دور کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ چنانچہ بعد میں لاہور میں کنور مہاراج سنگھ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کے وزیراعظم ضرور تھے مگر اس کے مشوروں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈوگرہ حکمران خاندان گو کہ سر گوپال سوامی آئنگر کی کھلی کانگرس نواز پالیسی کو پسند نہیں کرتا تھا مگر ساتھ ہی وہ کنور سنگھ کی منصفانہ پالیسی اور تیز عملی اقدامات کا بھی حامی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسٹر راؤ کو وزیراعظم کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔

نیشنل کانفرنس نے قائداعظمؒ کو جو دعوت دی تھی' اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گوپال سوامی آئنگر کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کے بعد وہ سیاسی سہارا تلاش کرنا چاہتے تھے۔ خود مہاراجہ ہری سنگھ اس وقت ریاست سے باہر مشرق وسطیٰ میں ریاستی فوجیوں سے ملاقات کے لیے گیا ہوا تھا۔

ریاست کے مسلمان نوجوان عناصر میں تحریکِ پاکستان کی مقبولیت روز بروز بڑھ

رہی تھی۔ اس نوجوان طبقے میں صرف طلبا ہی نہیں بلکہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس دونوں میں کام کرنے والے نوجوان کارکنوں کی خاصی تعداد نیز علی گڑھ سے فارغ التحصیل مسلمان سرکاری ملازم، پنڈت پریم ناتھ بزاز اور ان کے حامیوں کے مختصر مگر سیاسی طور پر بیدار اور موثر گروپ کے نوجوان بھی شامل تھے۔

چودھری غلام عباس، شیخ عبداللہ

یہاں یہ تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ 1938ء میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس جو اس وقت مسلمانانِ کشمیر کی واحد سیاسی جماعت تھی اور جس کی قیادت شیخ عبداللہ، چودھری غلام عباس اور دیگر رہنماؤں کے ہاتھ تھی 'انڈین نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس کا فیصلہ مسلم کانفرنس کے کھلے اجلاس میں 1939ء کے اوائل میں کر چکی تھی۔ اس طرح سے مسلم کانفرنس ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے ختم ہوگئی تھی مگر اس میں شک نہیں کہ میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور کچھ کارکن اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھے۔ اس طرح جموں وکشمیر کے مسلمانوں کی اس بڑی اور نمائندہ جماعت کے کانگرس کی گود میں چلے جانے کے بعد کوئی منظم گروہ یا تنظیم مسلمانوں کی نہیں رہی تھی۔

یہ کیفیت جاری تھی کہ 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور میں قراردادِ پاکستان منظور کی جس سے ریاست کے مسلمان نوجوانوں اور سیاسی فکر و بصیرت رکھنے والے حلقوں میں ایک نیا ولولہ اور نیا انداز فکر پیدا ہوا۔

ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام ہر لحاظ سے صرف دلفریب اور حسین تصور ہی نہ تھا بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے خاتمے کے بعد سیاسی بے راہروی کے طویل عرصے کے بعد ایک شاندار' قابل عمل اور جمہوری انداز کے مطابق ایک منزل کی نشاندہی تھی۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن

میرا خیال ہے کہ اگر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کے فیصلے میں

جلد بازی نہ کی جاتی اور 1940ء میں ریاست کے اندر متحدہ مسلم کانفرنس کا وجود ہوتا تو ریاست کی مسلم سیاست کو زبردست تقویت پہنچتی مگر مسلمانوں کی اس تنظیم کے کانگرس کے زیر اثر آجانے سے کوئی پلیٹ فارم بھی باقی نہ رہا تھا جس سے مسلمانانِ ریاست برصغیر کے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اپنی سیاسی اور نظریاتی ہم آہنگی کا اظہار کرتے۔ چنانچہ ایس پی کالج سری نگر کے مسلمان طلبا کی اکثریت نے واضح طور پر تحریکِ پاکستان کو اپنا کر 1940ء میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی تھی۔

اس تنظیم کی بنیاد رکھنے والوں میں مسٹر احمد اللہ رانا مرحوم، خواجہ ثنا اللہ شمیم، خواجہ غلام محمد میر، شیخ عبد الرحمان مرحوم، خواجہ غلام احمد پرے (مرحوم)، خواجہ علی محمد اور میں شامل تھے۔ بعد میں میر عبد العزیز، خواجہ غلام نبی پنڈت، پیرزادہ محمد طیب شاہ، غلام نبی زرگر اور کافی سارے دوست بھی شامل ہوئے۔ اس یونین نے تیزی سے کام شروع کر دیا اور سابقہ مسلم کانفرنس کے وہ عناصر جو نیشنل کانفرنس بننے کی وجہ سے مایوس تھے اور تحریکِ پاکستان سے ہمدردی رکھتے تھے، انہوں نے بھی اس تنظیم کی ہر طرح سے اخلاقی اور عملی مدد کی۔

نامور مجاہد اور ہفت روزہ ’جہانِ نو‘ سرینگر

اس سلسلے میں بالخصوص محمد اسماعیل ساغر، مسٹر محمد یوسف قریشی، خواجہ غلام محی الدین رہبر، عبد السلام دلال، ایم۔ حفیظ ایڈووکیٹ شامل ہیں۔ ان سب میں بڑھ چڑھ کر جو مخلصانہ اور عقلمندی کے مشورے محمد اسماعیل ساغر نے دیئے‘ ان سے تحریکِ پاکستان اور مسلم سٹوڈنٹس یونین کو بے حد فائدہ پہنچا۔ ساغر صاحب اپنی کم مائیگی کے باوجود ایک ہفت روزہ اخبار ’جہانِ نو‘ سری نگر سے نکالا کرتے تھے۔ بعد ازاں پندرہ روزہ ’نوائے وقت‘ جو لاہور سے شائع ہوا، نیز اور ینٹ پریس آف انڈیا جو مسلمانوں کی نئی قائم کردہ واحد خبر رساں ایجنسی تھی، ان کے نمائندے کے طور پر بلا معاوضہ کام کرتے تھے۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے مہاراج بازار، زینہ کدل میں ایک دفتر قائم کیا۔ اس

سلسلے میں بھی محمد اسماعیل ساغر صاحب نے یونین کی مدد کی۔ مسٹر احمد اللہ رانا اس یونین کے صدر اور میں سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ ہم نے بعد میں میر واعظ محمد یوسف شاہ اور ان کے حلقے کے دیگر افراد سے بھی رابطہ قائم کیا۔ نہ صرف میر واعظ صاحب بلکہ مولوی فاروق کے والد محترم محمد امین مرحوم نے یونین کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔

یہ خودستائی یا داستان سازی نہیں ہے

اس میں قطعاً کوئی خودستائی یا کسی داستان سازی کا کوئی تاثر پیدا نہیں ہونا چاہیے اگر میں یہ کہوں کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن نے مسلمان نوجوانوں میں کافی وسیع حلقۂ اثر قائم کر لیا تھا اور اس کی شاخیں ایس پی کالج، امر سنگھ کالج، اسلامیہ ہائی سکول سری نگر اور دیگر سکولوں تک پھیل گئی تھیں۔ بعد میں بارہ مولہ میں بھی سینٹ جوزف کالج میں اس یونین کی تنظیم قائم کی گئی۔ اس کے بعد جموں میں بھی کالج کے طلبا سے رابطہ قائم کیا جہاں کچھ ہی عرصہ قبل یہ تنظیم قائم ہو چکی تھی جس کی تشکیل میں انور رہلی، محمد خان نقشبندی اور ہدایت اختر قابل ذکر ہیں۔

نیشنلسٹ لیڈروں کو تکالیف

مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے قیام سے سب سے زیادہ تکلیف گلگت کشمیر کے نیشنلسٹ حضرات اور لیڈروں کو ہوئی جن میں شیخ عبد اللہ، بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق شامل تھے۔ اتفاق سے کچھ عرصہ بعد ہی کانگرس نے 'ہندوستان چھوڑ دو' کی تحریک شروع کی۔ اگرچہ شیخ عبد اللہ اور ان کے ساتھیوں نے اس میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا لیکن ان کی سرپرستی میں قائم شدہ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈ ریشن نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کو کچلنے کے لیے اس تحریک کا سہارا لیا۔ اس میں بخشی غلام محمد کے چھوٹے بھائی بخشی عبد المجید پیش پیش تھے۔

نیشنل سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کی طرف سے ساون کی تعطیلات کے بعد عام ہڑتال اور کلاسوں کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ وہ یہ ہڑتال 'ہندوستان چھوڑ دو' کی تحریک کی

حمایت میں کرنا چاہتے تھے مگر مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب شیخ عبد اللہ اور ان کے ساتھیوں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے امر سنگھ کالج کی ناکہ بندی کی۔ ان کے کچھ والنٹیئر اور نیشنل سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے کارکن کالج کے بیرونی گیٹ اور دیگر راستوں پر ڈنڈوں سے مسلح ہو کر راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ مسلم سٹوڈنٹس یونین نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ سارے اکٹھے ہو کر کالج کی طرف جائیں گے تا کہ اگر انہیں زبردستی روکا گیا تو اس اجتماعی صورت میں مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ بعض ایسے طلبا جو سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے، ہماری امداد کے لیے تیار ہو گئے۔ اس طرح سے یونین کے سرکردہ طلبا کی اچھی خاصی تعداد کالج کے گیٹ تک پہنچی۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے کارکن طلبا کی اس اچھی خاصی تعداد کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کی تلاش میں گیٹ سے ہٹ گئے۔ بغیر کسی مزاحمت کے ہم لوگ گیٹ کھول کر کالج کے اندر داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر اور روزنامہ ڈان

اگرچہ کالج کے ہندو سٹاف کی ہمدردیاں ہڑتالی طلبا کے ساتھ تھیں اور ان کا اصرار تھا کہ کالج بند کیا جائے لیکن پرنسپل ایم ڈی تاثیر راضی نہ ہوئے اور جونہی مسلمان طلبا کالج میں داخل ہوئے انہوں نے گھنٹی بجا کر کلاسز کے شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ اس ندامت کا بدلہ لینے کے لیے چند روز بعد جب مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس کالج کے میدان میں ہو رہا تھا، بخشی عبد المجید اور ان کے چند ساتھیوں نے یونین کے عہدیداروں پر حملہ کیا۔ ہمارے چند دوستوں کو چوٹیں بھی آئیں اور ان کے والدین کو نیشنل کانفرنس لیڈروں کی طرف سے دھمکیاں بھی دی گئیں اور بعض اراکین کو تنہا چلتے وقت مار پیٹ کرتے رہے۔

جہاں تک اس وقت کی حکومت کا تعلق ہے، اس نے کئی بار یونین کی تحریک

پاکستان کے سلسلہ میں سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا کی۔ مسٹر احمد اللہ رانا صدر مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے خلاف بغاوت کے جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ 'ڈان' جب روزنامہ ہوا تو مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن نے کوشش کی کہ یہ اخبار دیگر اخباروں کی طرح کالج کی لائبریری میں منگوایا جائے۔ کالج کی انتظامیہ نے فنڈز کی کمی کا بہانہ تراش کر اس کو مسترد کر دیا چنانچہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن نے تجویز پیش کی کہ وہ اپنے وسائل سے 'ڈان' کالج لائبریری کومہیا کرے گی۔

ایک دن میں نے 'ڈان' کا ایک پرچہ ریڈنگ روم کی میز پر لا کر رکھ دیا۔ جائنٹ لائبریرین نے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ہم نے اس کے بعد وہی پرچہ دوبارہ لا کر میز پر رکھ دیا۔ جائنٹ لائبریرین نے پرنسپل سے شکایت کی اور انہوں نے اوپر کی ہدایات کا سہارا لیا۔ ہم لوگ بھی ہارنے والے نہ تھے۔ ہم نے ایک درخواست لکھ کر وزیر اعظم مہاراج سنگھ کو پیش کی۔ وہ کوٹھی کے برآمدے میں آئے اور ہم سے اس کے بارے میں پوچھا اور درخواست پر یہ حکم لکھا:۔

If the Students want 'Dawn', let them have the 'Dawn'.

وزیر اعظم کشمیر کا حکم نامہ کالج انتظامیہ کے حوالے کیا گیا مگر وہ ٹال مٹول کرتے رہے۔

پاکستان فنڈ اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن

مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن نے قائد اعظمؒ کی اپیل پر ان کے قائم کردہ پاکستان فنڈ کے لیے طلبا میں چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کر دی۔ اس زمانے میں ریاست کے اندر مسلمانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی مگر میں اپنے ان ساتھیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جنہوں نے ایک ایک دو دو آنے جمع کر کے اس میں اپنا کردار ادا کیا۔ پچاس روپیہ کی رقم جو ایس پی کالج کے طلبا کی طرف سے جمع کی گئی تھی، پاکستان فنڈ میں جمع کروا دی گئی اور اس

کے ساتھ ہی قائد اعظمؒ کو یونین کے خزانچی غلام نبی کی طرف سے ایک خط لکھا گیا جس کا جواب قائد اعظمؒ نے دیا۔ یہ خطوط 'ڈان' دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔

'ڈان' کو ہر دلعزیز بنانے کے لیے بعض مقامی متمول سیاسی ذہن رکھنے والوں کو اس کی خریداری پر آمادہ کیا گیا اور محمد صدیق نیوز ایجنٹ امیرا کدل کو اس کی ایجنسی دلوائی۔ تحریکِ پاکستان چونکہ بنیادی طور پر ایک مخصوص نظریہ پر مبنی تھی' اس لیے اس نظریہ کے فروغ کے لیے یونین نے مختلف ذرائع استعمال کیے اور یہاں میں پنڈت پریم ناتھ بزاز کے 'ہمدرد' اخبار کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے ہماری یونین کی سرگرمیوں کے لیے اپنے اخبار میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ 'ہمدرد' میں یونین کے عہدے داروں کے بیانات، تقریبات اور مراسلات شائع ہوتے رہے۔ ہم نے سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور علی گڑھ یونیورسٹی یونین سے بھی رابطہ قائم کیا اور نومبر 1942ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس منعقدہ جالندھر میں غلام رسول زرگر اور میں کشمیر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے مبصرین کی حیثیت سے شامل ہوئے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ قائد اعظمؒ سے میری پہلی ملاقات نومبر 1942ء میں جالندھر ہی میں ہوئی۔ گو ملاقات سرسری تھی اور ہاتھ ملانے اور السلام علیکم تک ہی رہی لیکن یادیں ابھی بھی تازہ ہیں۔ قائد اعظمؒ ان دنوں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں شرکت کے لیے جالندھر تشریف لائے تھے۔ میں نے بھی اس اجلاس میں کشمیر سٹوڈنٹس یونین کی طرف سے شرکت کی تھی۔ میرے ہمراہ غلام رسول زرگر' ہدایت اختر مرحوم (سابق ایڈیٹر نوائے وقت' راولپنڈی) اور محمد خان نقشبندی (ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان) تھے۔ شام کے اجلاس میں ہماری تنظیم کو سب سے زیادہ اراکین کی نمائندہ جماعت ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ہلالی پرچم دیا گیا جو قائد اعظمؒ نے اپنے ہاتھوں سے مجھے عطا کیا تھا۔ پرچم دیتے وقت انہوں نے مجھے مبارکباد دی اور کہا کہ آپ

نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ کشمیر سٹوڈنٹس فیڈ ریشن پہلی تنظیم تھی جس نے کشمیر میں پاکستان کی آواز بلند کی۔ اس موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ کے چوٹی کے رہنماؤں کے علاوہ چودھری غلام عباس بھی سٹیج پر موجود تھے کیونکہ اسی سال یعنی 1942ء میں چند ماہ قبل مسلم کانفرنس کا احیا ہو چکا تھا اور اس کی تنظیم نو جاری تھی۔ چودھری صاحب جموں سے جالندھر آئے تھے۔

جب میں نے قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس وقت پوری دنیا جنگِ عظیم کی وجہ سے ایک انقلاب انگیز دور سے گزر رہی تھی۔ اس جنگ کے نتیجے میں سامراجی قبضے میں پھنسی ہوئی محکوم قوموں میں سیاسی بیداری کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ برعظیم میں تحریک آزادی زوروں پر تھی اور تحریکِ پاکستان بھی جو تحریکِ آزادی کا حصہ تھی، زوروں پر تھی اور قائداعظمؒ کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ ڈرائینگ روم کی سیاست سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی تھی۔ قائداعظمؒ کی کشمیر آمد سے چند ہفتے قبل پنجاب میں سرخضر حیات خان ٹوانہ کی مسلم لیگ کی رکنیت ختم کر دی گئی تھی۔ پنجاب کے وزیراعظم کا لیگ سے اخراج تحریکِ پاکستان کے اہم موڑ اور عوامی عروج کا باعث بنا۔

جنگ عظیم قریب الاختتام نظر آ رہی تھی اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ ہٹلر کی شکست یقینی ہے۔ برطانیہ میں رجحان زور پکڑ گیا تھا کہ جنگِ عظیم کے بعد انگریزوں کو برعظیم سے نکل جانا چاہئے۔ انہی دنوں قائداعظمؒ کشمیر آئے اور انہی دنوں برطانوی حکومت نے اپنی پالیسی کے اظہار کے طور پر گاندھی کو جیل سے رہا کر دیا۔

میں نے اور میرے کچھ کشمیری رفقاء نے کشمیر مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کی بنیاد رکھی تھی جو برعظیم میں انگریز سامراج کے خلاف اور قیامِ پاکستان کی حمایت میں سرگرم عمل تھی۔ میں بنیادی طور پر صحافی ہوں۔ اس لیے میں ان دنوں بطور صحافی کام کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک صحافی اور سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے عہدے دار کی حیثیت سے میری اکثر قائداعظمؒ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

ان دنوں قائد اعظمؒ کو ان کے ڈاکٹروں نے خرابی صحت کی بنا پر آرام کرنے اور تبدیلیٔ آب وہوا کا مشورہ دیا تھا چنانچہ قائد اعظمؒ اڑھائی ماہ تک کشمیر میں رہے۔

1944ء کے موسم گرما میں جب میں قائد اعظمؒ کے ساتھ سیکرٹری کی حیثیت سے وابستہ ہوا' اس وقت ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں اور ان کا تمام تر وقت سیاسی مصروفیات' اخبار نویسوں' مصنفوں' خواتین اور طلباء سے ملاقاتوں' کانفرنسوں اور پھر برصغیر کے دوروں یا مرکزی اجلاسوں نیز خط وکتابت کے جوابات میں گزر جاتا تھا۔ کشمیر میں جہاں وہ آرام کی غرض سے آئے تھے' انہوں نے کچھ وقت آرام اور تفریح میں گزارا۔

1945ء میں بمبئی کے قریب ماتھران کے پہاڑی علاقے میں آپ دو ماہ آرام کی غرض سے مقیم رہے۔ صرف بمبئی میں ایک دو مرتبہ وہ مہالکشمی کی گھوڑ دوڑ دیکھنے گئے یا کوئٹہ میں قاضی محمد عیسیٰ نے اصرار سے انہیں ''ہمایوں'' فلم دکھائی تھی۔

1946ء میں لندن کانفرنس کے بعد کچھ روز ہم انگلستان میں رہے تو وہاں Moral Rearmament کے بانی ڈاکٹر بگ مین جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد انسانی اور اخلاقی اقدار کے محرک تھے' ان کی دعوت پر ان ہی کے گروپ کا ایک ڈرامہ ''تھرڈوے'' لندن میں دیکھا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی ایک شام کسی تھیٹر میں لے گئے تھے جو شیکسپیئر کا کوئی ڈرامہ تھا لیکن قائد اعظمؒ نے عملاً اپنی زندگی قیامِ پاکستان کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ تقریباً سوا تین سال کا وقت جو میں نے ان کے ساتھ گزارا' اس میں سوائے اپنے سیاسی مشن سے متعلقہ کام کے اور کوئی مصروفیات قطعاً نہیں تھیں۔ نہ وہ کسی کلب میں جاتے' نہ سینما دیکھتے اور نہ ہی کسی اور قسم کی تفریح میں حصہ لیتے۔ سوائے اس کے کبھی کبھی شام کے وقت' وہ بھی روزانہ نہیں' آدھے یا پون گھنٹے کے لئے موٹر میں ہوا خوری کے لئے چلے جاتے تھے۔

جالندھر سے واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد ہم لوگوں نے اگلے سال مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کو شایانِ شان طریق پر منانے کے لیے پروگرام بنانا شروع کر

دیا۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر نواب بہادر یار جنگ کو کشمیر آنے کی دعوت دی جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ فیڈ ریشن کے جلسے کی صدارت کریں۔

نواب بہادر یار جنگ اور کشمیر

ان کے علاوہ وہ سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے عنایت کبریا اور علی گڑھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے مسٹر مختار آزاد کو بھی دعوت دی گئی۔ 'ڈان' کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ اپنا نمائندہ بھیجیں چنانچہ مسٹر عزیز بیگ جو اس وقت ڈان کے سب ایڈیٹر تھے سری نگر پہنچے۔

نواب بہادر یار جنگ اپنی قابلیت، قائدانہ صلاحیتوں اور بے مثال خطابت کی وجہ سے برصغیر میں خصوصاً مسلمانوں میں نہایت ہی اہم مقام حاصل کر چکے تھے اور آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کی تنظیم قائم کر کے انہوں نے پہلی مرتبہ برصغیر کی ریاستوں کے مسلمانوں میں بھی ایک رابطہ اور تعلق پیدا کر لیا تھا۔ نیز ان کے حریت پسندانہ جذبات کی وجہ سے وہ قائد اعظمؒ کے بعد مسلم عوام میں کافی مقبول تھے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے اس اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی انہی تاریخوں میں سری نگر میں منعقد کیا جائے۔ اس سلسلے میں تمام تیاریاں مکمل کر لی گئی تھیں لیکن حکومتِ کشمیر نے اجلاس کی مقررہ تاریخوں سے غالباً دو روز قبل نواب بہادر یار جنگ کے ریاست میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ اس اچانک پابندی سے مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے اراکین میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ استقبالیہ کا پروگرام منسوخ کیا جائے اور مزید کارروائی کے لیے مسلم کانفرنس اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے نمائندوں نے ایک مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے ایک اجلاس کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میر واعظ منزل میں مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ ابھی بحث شروع ہی ہوئی تھی کہ ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ نواب بہادر یار جنگ سری نگر پہنچ چکے ہیں۔ امیر اکدال کے لاری اڈہ سے خود ہی انہوں

نے میر واعظ منزل پہنچنے کی اطلاع دی۔ یہ خبر سنتے ہی مسلم کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے بعض ارکان ان کو لانے کے لیے گئے۔ وہ جب میر واعظ منزل پہنچے تو انہیں کچھ غصہ بھی تھا اور حیرانگی بھی کہ ان کے استقبال کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔

انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا کہ ان کے ریاست میں داخل ہونے پر پابندی ہے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ سری نگر پہنچ سکتے ہیں ورنہ یقیناً شایانِ شان استقبال کیا جاتا۔

دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات

نواب بہادر یار جنگ کے ریاست میں داخلے کا معاملہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ ان کا اصل نام محمد بہادر خان تھا اور نواب بہادر یار جنگ انہیں نظام حیدر آباد کی طرف سے خطاب عطا ہوا تھا۔ کشمیر آنے سے سال بھر قبل نظام حیدر آباد سے اختلاف کی بنا پر یہ خطاب انہوں نے واپس کر دیا تھا مگر عوام میں انہیں نواب بہادر یار جنگ ہی پکارا جاتا مگر وہ خود کو محمد بہادر خان ہی کہتے تھے۔ چنانچہ میر واعظ منزل میں انہوں نے پس منظر بتاتے ہوئے بتایا کہ جب ان کی کار کوہالہ پہنچی تو وہاں ریاستی حکام نے ان کو روک کر ان کا نام پوچھا۔ انہوں نے محمد بہادر خان بتایا۔ اس پر انہیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس روز جمعہ تھا اور اجلاس قبل از جمعہ ہو رہا تھا۔ بعض جوشیلے کارکنوں کا یہ خیال تھا کہ حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا جائے اور پابندی کی مذمت کی جائے مگر انہوں نے کہا کہ اس وقت کوئی مظاہرہ یا قانون شکنی نہیں ہونی چاہیے۔

نواب بہادر یار جنگ کے اس قدر اچانک پہنچنے کی خبر آناً فاناً سری نگر میں پہلے ہی پھیل گئی۔ عوام میر واعظ منزل کی طرف آنے لگے۔ پولیس بھی پہنچ گئی۔ نواب بہادر یار جنگ نے نماز کی مہلت مانگی اور نماز کے بعد پولیس نے انہیں موٹر میں بٹھا کر راولپنڈی پہنچا دیا۔

نواب بہادر یار جنگ کے ریاست میں داخلے پر پابندی اور ریاست بدری کا واقعہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ جب سارے ہندوستان کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی

تو کچھ دیر کے لیے کشمیر ہندوستان کے پریس میں توجہ کا مرکز بنا اور نواب بہادر یار جنگ کے خطاب نہ کرنے سے جو کمی پیدا ہوئی تھی' وہ کافی حد تک ان کے ریاست بدر ہونے اور پابندی کے ردِعمل نے پوری کر دی۔ ریاست کے اندر نواب صاحب کی پابندی کے بعد پاکستان کے حامی عناصر کے حوصلے بلند ہونے لگے۔

مسلم کانفرنس اور تحریکِ پاکستان

مسلم کانفرنس کی تنظیمِ نو کے بعد یہ جماعت بھی اعلانیہ تحریکِ پاکستان کی حامی بن گئی۔ صوبہ جموں و کشمیر میں سیاسی صورتِ حال مختلف شکلیں اختیار کر چکی تھی۔ جموں میں مسلمانوں کے اندر نیشنل کانفرنس کا اثر و رسوخ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جموں کے ہندو زیادہ تر مہاراجہ کے وفادار اور کشمیر میں کسی بھی آئینی یا سیاسی اصلاحات کے نفاذ کے حق میں نہیں تھے۔ البتہ مجموعی طور پر ان کی ہمدردیاں انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ تھیں۔ جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ صوبہ جموں کے مسلم اکثریت والے علاقے ریاست میر پور اور بھدرواہ میں رسل و رسائل کی مشکلات کی وجہ سے نیز پسماندگی کے باعث سیاسی سرگرمیاں کم تھیں۔

اس کے مقابلے میں صوبہ کشمیر کے مسلمان دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروپ نیشنل کانفرنس کا حامی تھا اور دوسرا مسلم کانفرنس کا۔ اس گروپ میں ابتدا میں صرف چند نوجوان تھے۔ بعد میں میر واعظ یوسف شاہ کی باضابطہ مسلم کانفرنس میں شمولیت سے مسلم کانفرنس کو صوبہ کشمیر میں زبردست تقویت پہنچی۔ ان کے اثر و رسوخ سے اسلام آباد، سوپور اور وادی کے دوسرے حصوں میں کافی تعداد میں سیاسی کارکن مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے۔

مسلم کانفرنس اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے علاوہ ریاست میں مسلمانوں کا ایک اور اچھا خاصا طبقہ بھی تحریکِ پاکستان کا حامی تھا جن میں کچھ سرکاری ملازم، وکلاء اور کاروباری لوگ تھے جو عملی سیاست میں حصہ تو نہیں لیتے تھے مگر تحریکِ پاکستان بالخصوص

برصغیر میں ایک آزاد مسلم ریاست کے تخیل کے حامی تھے۔

میاں بشیر احمد ایڈیٹر 'ہمایوں' لاہور اور نواب زادہ رشید علی خان

کشمیر میں تحریکِ پاکستان کی تقویت کا باعث برصغیر کے وہ مسلمان لیڈر اور سیاح بھی تھے جو موسمِ گرما گزارنے یا سیر و تفریح کی غرض سے کشمیر جایا کرتے تھے۔ ان میں خاص طور پر میاں بشیر احمد مدیر 'ہمایوں' لاہور جو آل انڈیا مسلم لیگ مجلسِ عاملہ کے رکن تھے اور نوابزادہ رشید علی خان جو اس وقت سٹی مسلم لیگ لاہور کے صدر تھے، کشمیر آئے تھے اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ایک بار ان کے اعزاز میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے سری نگر میں استقبالیہ بھی دیا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ 1943ء کے آخر اور 1944ء کے شروع میں ریاست میں پاکستان کے حامی عناصر کافی تعداد میں سرگرمِ عمل تھے۔ یہاں تک کہ نیشنل کانفرنس بھی صوبہ کشمیر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور اس کو اپنی سیاسی ساکھ قائم رکھنے کے لیے گوپال سوامی آئنگر کی حکومت کا سہارا لینا پڑا۔ ان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے کے لیے حکومت نے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کو کافی اختیارات دیئے تاکہ عوام کو ان کا دستِ نگر ہونا پڑے۔

نیا کشمیر کا نعرہ

شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی سری نگر میں تحریکِ پاکستان کے رجحانات کو روکنے کی تدابیر سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بعض ترقی پسند اور سوشلسٹ عناصر کے زیرِ اثر 'نیا کشمیر' کا نعرہ لگایا اور ایک ایسا خاکہ پیش کیا گیا جو زیادہ تر سوشلسٹ اصولوں پر مبنی اقتصادی نظام سے مشابہ تھا کیونکہ کانگرسی لیڈروں کے جیل جانے کے بعد شیخ عبداللہ پنجاب کے چند ترقی پسند اور کمیونسٹ سیاسی کارکنوں اور سیاسی مفکروں کے زیرِ سایہ آ گئے تھے۔ اس سے قبل پنڈت پریم ناتھ بزاز اور جواہر لال نہرو کے زیرِ اثر بھی شیخ صاحب سوشلزم کی طرف تھوڑا بہت مائل ہو چکے تھے۔

روس نواز عنصر اور شیخ عبداللہ

نیشنل کانفرنس کے اندر اور شیخ عبداللہ کے حامیوں میں ایک گروہ ایسا تھا جو اگر چہ ریاست کے اندر شیخ عبداللہ کو ہی لیڈر اور نمائندہ تصور کرتا تھا مگر برصغیر کی سیاسی سطح پر وہ قائد اعظمؒ نیز مسلمانانِ ہند کی اپنی آزاد مملکت کے قیام کی تحریک کا حامی تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ شاید کسی مرحلہ پر شیخ عبداللہ بھی اپنے آپ کو تحریکِ پاکستان سے وابستہ کرے گا مگر جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ ان کی بھول تھی اور اسی طبقے کی اس پالیسی نے مسلمانوں کی پاکستان کی حامی تحریکوں کی کوئی امداد نہیں کی۔

صوبہ کشمیر میں مسلمان گروہوں کے علاوہ ایک اور عنصر پاکستان کا حامی تھا۔ یہ گروہ پنڈت پریم ناتھ بزاز کا تھا۔ یہ روس نواز ایم این رائے کے پیروکاروں پر مشتمل تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے برصغیر کی ریاست قدرتی طور پر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ روس نواز کمیونسٹ 1941ء تک جنگ عظیم کو سامراجی اور فسطائی قوتوں کے درمیان ایک ناگزیر تصادم سے تشبیہ دیتے رہے مگر جب 1941ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور جرمن فوج یوکرین پر قابض ہوگئی اور ماسکو تک جا پہنچی تو روس نواز عناصر نے دنیا بھر میں اس کو عوامی جنگ کا نام دے دیا۔

برصغیر میں اس عنصر نے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کو مخصوص مفادات کی محافظ جماعتیں قرار دیا۔ ان کا یہ اندازہ تھا کہ پاکستان کے قیام سے برصغیر کے عوام کی آزادی اور رجعت پسندانہ جاگیرداری اور زمینداری نظام کے خاتمہ میں مدد ملے گی۔ اس لیے انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی بلکہ جہاں تک پنڈت پریم ناتھ بزاز کا تعلق ہے اُس نے کشمیر میں پاکستان کے حامی عناصر کی حمایت کی۔ اگر چہ یہ گروہ مختصر تھا مگر اخبار ُہمدردُ کی وجہ سے جو اس وقت کشمیر میں سب سے موثر اخبار تصور کیا جاتا تھا' یہ گروہ بھی کافی بااثر تھا۔

جب نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے روسی کمیونسٹ پارٹی کے نشان

'درانتی' کی طرز پر ہل کا نشان اپنی پارٹی کے پرچم پر چسپاں کیا اور اس طرح سے سوشلسٹ مفکرین کے زیر اثر 'نیا کشمیر' کا منصوبہ پیش کر کے اپنی دانست میں ایک ترقی پسند قدم اٹھایا تھا مگر اس کے باوجود یہ عناصر ریاست میں مسلمانوں کی توجہ تحریکِ پاکستان سے نہیں ہٹا سکے۔

1944ء میں ہی کانگرس کے مشہور مفکر اور بزرگ رہنما راج گوپال اچاریہ نے پاکستان کے مطالبے کو اصولی طور پر منظور کر لیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ کانگرس کے اندر ایک ایسا مکتبِ فکر موجود ہے جو پاکستان کے مطالبے پر غور کرنے کے لئے تیار ہے۔ علاوہ ازیں اچھوتوں اور نیچی ذات کے لیڈروں نے بھی پاکستان کے مطالبے کی حمایت کی اور اس کے قیام کا مطالبہ کیا۔

مسلم لیگ کی حکومتیں بنگال' آسام' پنجاب' سرحد اور سندھ میں قائم ہو چکی تھیں اور روس نواز کمیونسٹ عناصر بھی پاکستان کی مخالفت ترک کر چکے تھے۔ ان تمام حالات نے شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انہیں کسی نہ کسی رنگ میں اپنے مقصد کے لئے اور اپنی ساکھ بچانے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ سے تعلق بالخصوص قائداعظمؒ کے متعلق اپنا رویہ بدلنا ہو گا۔ چنانچہ 1944ء کے اوائل میں نیشنل کانفرنس نے قائداعظمؒ کو کشمیر کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔

اس سے قبل مسلم کانفرنس کے قائدین قائداعظمؒ کو سری نگر آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ چنانچہ قائداعظمؒ نے دونوں کی دعوت قبول کرتے ہوئے اس سال گرمیوں میں کشمیر آنے کا فیصلہ کیا۔

جناح سکندر پیکٹ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ سری نگر آنے سے قبل قائداعظمؒ پنجاب میں صورت حال کو درست کرنا چاہتے تھے کیونکہ سکندر حیات کے بعد ملک خضر حیات ٹوانہ جو پنجاب کے وزیر اعظم تھے' مسلم لیگ کی تنظیم کے ساتھ برسر پیکار ہو گئے تھے۔ اگرچہ ملک خضر حیات خود کو مسلم لیگی ظاہر کرتے تھے مگر انہوں نے عملاً اپنی حکومت کو مسلم لیگ ہائی کمان

کی پالیسیوں سے الگ رکھا اور اس سلسلے میں اس نام نہاد جناح سکندر پیکٹ کا سہارا لیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

قائداعظمؒ جو مسلم لیگ کو صحیح معنوں میں عوامی جماعت بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے پنجاب میں صوبائی مسلم لیگ کانفرنس سے قبل حالات کو درست کرنا چاہتے تھے مگر خضر حیات انگریز گورنر کی شہ پر قائداعظمؒ کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو گئے اور مسلم لیگ کے فیصلوں پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اپریل 1944ء میں خضر حیات ٹوانہ اور ان کے ساتھیوں کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا اور اس کے بعد سیالکوٹ میں صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کی گئی اور اس کے بعد قائداعظمؒ کشمیر تشریف لے گئے۔

قائداعظمؒ کا جموں میں شاندار استقبال

قائداعظمؒ کے کشمیر میں داخلے سے کشمیر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ریاستی مسلمانوں کو زبردست تقویت پہنچی اور ان کی وسیع پیمانے پر حوصلہ افزائی ہوئی اور قائداعظمؒ کے اس دورے کے بعد برصغیر میں کشمیر کے بارے میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔

قائداعظمؒ سوچیت گڑھ سے جب ریاست کی حدود میں داخل ہوئے تو جموں تک 18 میل کے راستے پر جگہ جگہ انکا پر جوش استقبال کیا گیا اور مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی قائداعظمؒ کو دیکھنے آئے تھے۔ اس سے قبل کانگرسی لیڈر ریاست میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے مگر اب کے قائداعظمؒ 8 سال بعد کشمیر آئے تھے۔ اب ان کی حیثیت برصغیر کے ایک چوٹی کے مسلم مدبر اور ہر دلعزیز سیاسی لیڈر کی تھی۔ قائداعظمؒ کی شخصیت اور مطالبۂ پاکستان تمام سیاسی مباحث کا مرکزی نقطہ بنے ہوئے تھے اور اس لحاظ سے قائداعظمؒ کو ایک ایسا مقام حاصل تھا جو برصغیر میں کسی اور کو نصیب نہیں تھا۔

برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا تخیل، اس کا خاکہ اور اس کے لئے ایک عوامی تحریک اور حصول کے پروگرام کے بارے میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی

ان کے خیالات سننے کے مشتاق تھے۔ چنانچہ قائداعظمؒ کے اس دورہ نے کشمیر کے تمام مکاتب ہائے فکر کو متاثر کیا۔جموں میں ایک روز قیام کے بعد قائداعظمؒ براستہ بانہال سری نگر روانہ ہوئے۔

بانہال سے سری نگر تک قائداعظمؒ کا فقید المثال استقبال

درہ بانہال (Banihal) عبور کر کے جب قائداعظمؒ قاضی کنڈ کے مقام پر پہنچے تو صوبہ کشمیر میں ان کے استقبال کا آغاز ہوا۔ مسلم کانفرنس کی طرف سے میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ سری نگر سے ان کے استقبال کے لئے پہنچے ہوئے تھے۔جموں سے چوہدری غلام عباس اور مسٹر اے آر ساغر قائداعظمؒ کے ہمراہ تھے۔

قائداعظمؒ کو پہلے ہی مقام پر نیشنل کانفرنس کی پست ذہنیت کے مظاہرے کا پتہ چل گیا۔یعنی نیشنل کانفرنس والے اپنے سیاسی مخالفین کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے جس پر ہلکا سا تصادم بھی ہوا اور مسلم کانفرنس کے مخلص لوگوں نے قائداعظمؒ کو بتایا کہ یہ تصادم ان مشکلات کی نشاندہی کرتا ہے جن سے کشمیری مسلمان اور پاکستان کے حامی عناصر اس وقت گزر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سے قبل برصغیر کے کسی بھی لیڈر کا ایسا استقبال نہیں ہوا تھا۔ سری نگر میں قائداعظمؒ کے عظیم اور نا قابل فراموش استقبال کے وقت کچھ کشیدگی پیدا ہوگئی تھی مگر صورت حال پر کنٹرول کیا گیا تھا اور کوئی نا خوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ انتظامیہ نے حسب معمول نیشنل کانفرنس کی حمایت کرتے ہوئے انہیں پرتاب پارک میں استقبالیہ جلسہ کرنے کی اجازت دے دی جبکہ مسلم کانفرنس کو ڈل گیٹ پر جلسہ کرنے کا موقع دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نیشنل کانفرنس والے اپنے جلسے میں زیادہ حاضری کے بارے میں پُر امید نہ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کی طرف سے استقبالیہ دیا جائے تاکہ حاضری کے لحاظ سے جلسہ کامیاب ہو۔ قائداعظمؒ نے چونکہ نشاط باغ کے قریب قیام کرنا تھا' اس

لئے ڈل گیٹ ان کے راستے میں پڑتا تھا مگر نیشنل کانفرنس کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو سرکاری روٹ بنایا گیا' اس میں پہلے انہیں پرتاب پارک پہنچایا گیا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عوام جو قائد اعظمؒ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب تھے' پہلے پرتاب پارک کی طرف رجوع کریں گے اور اس طرح نیشنل کانفرنس کا جلسہ کامیاب ہوگا۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا استقبال' عقیدت اور احترام

قائد اعظمؒ کی شخصیت اور دوسری طرف عوام کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں لوگ بھاگتے دوڑتے پرتاب پارک پہنچ گئے اور اس کے بعد قائد اعظمؒ کی موٹر کے ساتھ ساتھ ڈل گیٹ پہنچے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے استقبال صفا کدل میں کیا گیا تھا مگر عوام کے ریلے نے یہاں قائد اعظمؒ کی کار کو رکنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ ان استقبالیہ جلسوں سے قائد اعظمؒ نے مختصر خطاب کئے جو کہ دراصل استقبال کے شکریہ پر ہی محدود تھے مگر پرتاب باغ میں ان کے ذہن اور انداز فکر کی ایک جھلک سامنے آئی جہاں انہوں نے شیخ عبداللہ کے سپاس نامے کے جواب میں فرمایا کہ ''میرا استقبال اس لئے کیا گیا ہے کہ مجھے برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہے''۔

اس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ نیشنل کانفرنس کے رہنما اس استقبال کو محض مہمان نوازی کا رنگ دینا چاہتے تھے حالانکہ اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی مگر وہ اس بات سے خائف تھے کہ مستقبل میں کانگرسی لیڈر جیل سے رہا ہو کر ان سے ضرور جواب طلب کریں گے۔ اس لئے پیش بندی کے طور پر یہ عذر لنگ تراشا گیا کہ ہم باہر سے آنے والے ہر مہمان کا استقبال کرتے ہیں مگر قائد اعظمؒ کے اس مختصر جواب نے ان پر واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ ان کی ذات کا نہیں تھا مگر مسلمانانِ ہند کے ایک نمائندہ رہنما کی حیثیت سے جو پوزیشن ان کو حاصل ہوگئی تھی' اس پر اب اس قسم کی باتوں سے پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

دو جلسے اور مختلف نظریات

ڈل گیٹ میں بھی انہوں نے مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام جلسہ سے مختصر خطاب کیا۔ اپنے موقف کی وضاحت کی اور سب سے زیادہ باہمی اتفاق پر زور دیا کیونکہ پہلے ہی وادیٔ کشمیر میں مسلمانوں کی باہمی تقسیم ان کے سامنے آ گئی تھی اور دو جلسوں میں دو کشمیری لیڈروں (چودھری غلام عباس۔ شیخ عبد اللہ) نے علیحدہ علیحدہ نظریات سے ان کا استقبال کیا تھا۔ اس کے برعکس جموں میں کوئی ایسی صورت پیش نہیں آئی تھی۔ ڈل گیٹ سے قائد اعظمؒ سیدھا اپنے جائے مقام ''کوشک'' روانہ ہوئے۔ یہ ایک خوشنما سا بنگلہ تھا جو سری نگر سے نشاط باغ جانے والی سڑک پر نشاط باغ اور چشمہ شاہی کے درمیان بلندی پر واقع تھا۔ یہ بنگلہ سر مراتب علی کی ملکیت تھی۔ قائد اعظمؒ نے چند روز یہاں قیام کیا اور اس عرصہ میں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان اختلافات ختم کروانے کی کوشش شروع کر دی۔

''کوشک'' میں قیام کے دوران قائد اعظمؒ نے شیخ عبد اللہ اور چوہدری غلام عباس سے الگ الگ ملاقات کی مگر یہ بات چیت ناکام ہوگئی۔ شیخ عبد اللہ اس بات چیت کو طول دینا چاہتے تھے کیونکہ اس وقت ان کی سیاست کا مقصد محض کشمیری عوام میں اپنی ساکھ کو مضبوط کرنا تھا۔ اس کے برعکس قائد اعظمؒ چاہتے تھے کہ مسلم کانفرنس کے ساتھ بات چیت سے پہلے ہی شیخ عبد اللہ کے ساتھ مذاکرات کا نتیجہ برآمد ہو جائے۔ چنانچہ شیخ عبد اللہ کو مجبوراً یہ بات چیت ختم کرنا پڑی اور اس نے قائد اعظمؒ کا مشورہ ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔

اس دوران گاندھی بھی جیل سے رہا ہو چکے تھے اور یہ توقع کی جانے لگی تھی کہ دیگر کانگرسی رہنما بھی جلد رہا ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس متوقع تبدیلی کے پیش نظر شیخ عبد اللہ نے اپنے پرانے موقف کی روش اختیار کی اور اس طرح ریاستی مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ہوگئی۔

قائداعظمؒ نے شیخ عبداللہ کو سمجھایا مگر؟

مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں قائداعظمؒ نے اپنے خطبے میں تفصیل کے ساتھ شیخ عبداللہ کے ساتھ بات چیت پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں شیخ عبداللہ کے موقف کا تجزیہ کر کے انہیں بے نقاب کیا۔ شیخ عبداللہ کی کوشش تھی کہ ریاست جموں و کشمیر کے اندر انہیں اور نیشنل کانفرنس کو ریاستی عوام کا نمائندہ تسلیم کرلیا جائے مگر قائداعظمؒ نے شیخ عبداللہ کو برصغیر کی سیاست کی بنیادی حقیقت کی طرف آمادہ کرنے کی کوشش کی اور اپنے تجربات کی بنا پر سمجھاتے رہے کہ برصغیر کے ہندو اور مسلمان الگ الگ قوم کی حیثیت سے ہی مستقبل میں آزاد رہ سکیں گے اور برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہوگی۔ انہوں نے شیخ عبداللہ کو یہ بھی بتایا کہ خود کانگرسی لیڈر اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر وہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے بل بوتے پر نیشنلزم کا ڈھونگ رچا کر مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں شیخ عبداللہ نے قائداعظمؒ کو بتایا کہ اگر ہم کشمیر میں نیشنلزم کو اپنا کر اور نیشنلزم کے نام پر اپنے سیاسی مقاصد کیلئے ہندو اقلیت کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے؟

مگر قائداعظمؒ نے ان کی یہ **دلیل** مسترد کر دی۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ جس اصول کو وہ برصغیر کی سیاست میں بنیادی طور پر اختیار کر چکے ہیں' کشمیر میں اس کے برعکس پوزیشن نہیں لے سکتے اور جو بات برصغیر میں ایک حقیقت ہے' وہ کشمیر میں بھی حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ قومیت کا مسئلہ کشمیر کے لئے الگ اور برصغیر کے لئے الگ نہیں ہو سکتا۔

قائداعظمؒ نے یہ بھی فرمایا کہ شیخ عبداللہ کا یہ خیال خام ہے کہ وہ ہندوؤں کو دھوکہ دے سکتے ہیں اور یہ کہ سیاست میں اس طرح دھوکہ دینا بذات خود ہی ایک غلط بات ہے اور ہندوؤں کو اپنی پوزیشن واضح طور پر بتا دینا چاہئے۔ بہرحال شیخ عبداللہ اس پر متفق نہ ہو سکے اور بات چیت ختم ہوگئی۔

سری نگر میں قائداعظمؒ کی مصروفیات

''کوشک'' میں کچھ عرصہ قیام کے بعد قائداعظمؒ سری نگر میں کوئین الزبتھ نامی ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو گئے۔ یہ ہاؤس بوٹ دریائے جہلم لال منڈی گھاٹ کے قریب تھا اور یہ جگہ چونکہ شہر سے نزدیک تھی' اس لئے یہاں آ کر قائداعظمؒ کو زیادہ لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان سے ملنے والوں میں سیاسی رہنما' اخبار نویس اور کاروباری حضرات' طلبا' قانون دان اور ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ قائداعظمؒ نے ریاست کے اندرونی' سیاسی' معاشی اور تجارتی معاملات میں کافی دلچسپی لی۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ کشمیر میں صحت کی وجہ سے آئے تھے' اس لئے انہوں نے زیادہ سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا اور کچھ عرصہ آرام کی غرض سے وادی کے مختلف حصوں کی سیر میں گزارا۔

قائداعظمؒ سری نگر میں

قائداعظمؒ 11 مئی' 1944ء کو سری نگر پہنچے۔ حکومت نے تصادم کے خطرے کے پیش نظر اور دھڑے بندی کو واضح کرنے کی نیت سے قائداعظمؒ کے استقبال کے لیے مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے لیے الگ الگ جگہیں مخصوص کیں۔ پرتاب پارک میں شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کی جانب سے سپاس نامہ پڑھا۔ قائداعظمؒ نے مختصر سا جواب دیا مگر ایک ایسی بات کہہ دی کہ نیشنلسٹ لیڈر چیخ اٹھے۔ قائداعظمؒ نے فرمایا: ''آپ نے میری ذات کا استقبال نہیں کیا بلکہ اس لیے کیا ہے کہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر ہوں''۔ نہر کے کنارے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے آپ کا استقبال کیا۔ مسلم کانفرنس نے ڈل گیٹ کے مقام پر استقبال کیا۔ مرحوم مولوی محمد امین (میر واعظ مولوی محمد فاروق کے والد) اور کشمیر اسمبلی کے رکن شیخ محمد امین استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ تھے۔ مسلم کانفرنس کے نمایاں رہنما چوہدری غلام عباس' میر واعظ مولوی محمد یوسف اور اے آر ساغر تھے۔ قائداعظمؒ نے یہاں بھی مختصر سی تقریر کی۔ کشمیری مسلمانوں کو

تاریخی پیغام دیا۔ ''ہمارا خدا ایک' ہمارا رسول ﷺ ایک' کتاب ایک اور دین ایک ہے تو ہماری تنظیم اور قائد بھی ایک ہی ہونا چاہیے''۔

شیخ عبداللہ کی ہٹ دھرمی

قائداعظمؒ چاہتے تھے کہ کشمیری مسلمانوں کو متحد کیا جائے۔ انہوں نے شیخ عبداللہ کو اس بات کا قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ متحدہ قومیت کا تصور برصغیر کے حالات اور تاریخی پس منظر میں مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کی غلامی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں شیخ عبداللہ کو یہاں تک کہا کہ جتنی تمہاری عمر ہے' اتنا عرصہ میں سیاست میں گزار چکا ہوں ۔تم ہندوؤں کے ذہن کو نہیں سمجھ سکتے ۔شیخ عبداللہ کا اصرار تھا کہ اگر کانگرس ہندوستان میں ہندو اکثریت کے بل پر نیشنلزم کے نام پر مسلم اقلیت کو دھوکہ دے رہی ہے تو ہم ریاست میں نیشنلزم کے نام پر ہندو اقلیت کو بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔

16 جون 1944ء کو جامع مسجد سری نگر سے متصل مسلم پارک میں قائداعظمؒ نے مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس سے خطاب کیا اور وہاں شیخ عبداللہ کے ارادوں کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ دھوکہ دہی کی سیاست نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے نہ ہندوؤں کے لیے۔ شیخ عبداللہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ہندوستان میں ایک اصول پر عمل کروں گا اور کشمیر میں کسی دوسرے پر۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہندو لیڈر جو برصغیر کے مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں' کیا وہ تمہیں دھوکہ نہیں دیں گے۔ کانگرس جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہے' میں اسے بے نقاب کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمان اپنی روایات اور اقدار کے مطابق ایک علیحدہ وطن قائم کریں۔

شیخ عبداللہ کے پاس ان دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے قائداعظمؒ کو کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ سپاس نامے میں قائد کو ہندوستان کے مسلمانوں کا رہنما کہا تھا۔

قائداعظمؒ نے اس کی دورنگی کو بے نقاب کیا تو شیخ عبداللہ نے تقریروں میں قائداعظمؒ کے خلاف بدزبانی شروع کردی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ جو باہر کے لوگ کشمیر میں آتے ہیں انہیں کشمیر کی سیاست میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ مسٹر جناح غیرملکی ہیں وہ کشمیر سے چلے جائیں۔ شیخ عبداللہ کے حامیوں نے بارہ مولہ کے مقام پر قائداعظمؒ کے جلسے میں پتھراؤ کرنے کی کوشش بھی کی۔

تحریک پاکستان کے ایک مخلص کارکن محمد اسماعیل ساغر میرے دوست تھے۔ مسلمانوں کی خبر رساں ایجنسی اوریئنٹ پریس آف انڈیا کے سری نگر میں اعزازی نمائندہ تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں ان کی جگہ کام کروں۔ کیونکہ قائداعظمؒ اکثر بیان انگریزی میں دیا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب قائداعظمؒ ہمارے گھر کے قریب کوئین الزبتھ ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ میں ہر روز قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا' بڑی شفقت سے پیش آتے۔ کچھ دیر مقامی حالات اور خبروں پر تبصرہ فرماتے۔ ایک دن میں نے اصرار کیا کہ حالاتِ حاضرہ پر کوئی بیان عطا فرمائیں۔ کہنے لگے جب بھی ایسا موقع آیا' سب سے پہلے تمہیں بیان دوں گا۔

26 جون کو آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر نواب بہادر یار جنگ حیدرآباد میں انتقال کر گئے۔ 27 جون کی صبح آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی۔ یہ خبر سن کر میں معمول سے پہلے ہی قائداعظمؒ کی ہاؤس بوٹ میں پہنچ گیا۔ ابھی وہ ڈرائنگ روم میں نہیں آئے تھے۔ تھوڑا انتظار کے بعد وہ تشریف لائے تو میں نے یہ خبر سنائی۔ اتفاق سے اس دن انہوں نے خبریں نہیں سنی تھیں۔ قائداعظمؒ کے شگفتہ چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ خاصی دیر خاموش رہے۔ پھر سکوت توڑا تو فرمایا مجھے اس پر یقین نہیں آتا۔ میں نے کہا یہ آل انڈیا ریڈیو کی خبر ہے' غلط نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے فرمایا میرے بارے میں بھی ایک مرتبہ ایسی خبر نشر ہو چکی ہے' سندھ اسمبلی میں تعزیتی قرارداد بھی پیش ہو گئی تھی۔ اتنے میں محترمہ فاطمہ

جناحؒ بھی تشریف لے آئیں۔ میں نے انہیں یہ خبر سنائی تو وہ بھی پریشان ہوگئیں۔ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ کیا وقت تھا۔ کہاں تھے۔ کیوں گئے تھے؟ کس نے اطلاع دی؟ کیا بیاری تھی؟ میں انہیں مطمئن نہیں کر سکا۔ قائداعظمؒ نے کہا جب تک خبر کی تصدیق نہیں ہو جاتی' کوئی بیان نہیں دوں گا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد دوبارہ قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چودھری غلام عباس اور ساغر صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ اتفاق سے انہوں نے بھی یہ خبر نہیں سنی تھی۔ اس دوران قائداعظمؒ کے پاس کچھ تار آ چکے تھے۔ ایک بیگم نواب بہادریار جنگ کا' دوسرا مسٹر محمود الحسن سیکرٹری آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کا اور ایک ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کا۔ قائداعظمؒ نے سیکرٹری کو بیان لکھوادیا اور ٹائپ کرنے کو کہا۔ اس وقت قائداعظمؒ کے سیکرٹری مسٹر لوبو تھے۔ گوا کے عیسائی تھے اور اردو سے نابلد تھے۔

اس موقعہ پر قائداعظمؒ نے میرے خاندان کے حالات دریافت کئے اور پھر فرمایا میرے ساتھ بمبئی کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں نے کہا' سوچوں گا جناب' قائداعظمؒ نے فرمایا' ہاں سوچیں'۔

ان دنوں جنگ عظیم کی وجہ سے کمبلوں کی بڑی مانگ تھی۔ میرے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ ہم مل کر کمبلوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ایک دن قائداعظمؒ نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں کمبلوں کا کاروبار کرنے کے متعلق بھی سوچ رہا ہوں۔ انہوں نے فرمایا'' ہاں ہاں مسلمانوں کو کاروبار میں بھی آنا چاہیے''۔ کوئی پانچ منٹ اس پر ہدایات دیتے رہے' پھر فرمایا' جب کام شروع کرو تو مجھے بھی کمبل بھیجنا۔ میں تمہارا کارخانہ دیکھنے بھی جاؤں گا۔ میں نے انہیں بتایا' ہمارا کارخانہ نہیں۔ محض پروگرام ہے۔ دراصل قائداعظمؒ مسلمان تاجروں کی کافی سرپرستی کرتے تھے۔ سری نگر میں ضرورت کی اشیا مسلمان دکانداروں سے خریدتے۔ اس طرح ان دکانوں کی خوب مشہوری ہوتی۔

عارضی پرائیویٹ سیکرٹری

قائداعظمؒ یکم جولائی کو ریاستی وزیراعظم کی دعوت پر سرکاری مہمان کے طور پر سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں منتقل ہو گئے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں عارضی طور پر ان کے سیکرٹری کی خدمات انجام دوں۔ ہم لوگ تحریک پاکستان کے لیے کام کرنا خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ میں نے یکم جولائی سے کام شروع کر دیا۔ اس وقت میری عمر اکیس سال تھی۔ بی اے کا امتحان دے چکا تھا۔ چونکہ ان دنوں وہ ڈاکٹروں کے مشورہ سے مکمل آرام کی غرض سے آئے تھے' اس لیے ان کے معمولات عام زندگی کی مصروفیات سے ہٹ کر تھے لیکن عموماً ناشتہ کے بعد وہ اپنی ڈاک دیکھتے اور اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔ صبح کے وقت چہل قدمی کرتے پھر کشتی کے ذریعے دریائی سیر کرتے۔ کبھی کبھی سہ پہر کو دریا کے بند پر بھی سیر کرتے۔ کشمیر میں قیام کے دوران وہ نشاط باغ کے قریب سر مراتب علی کی کوٹھی میں مقیم رہے۔ بعد ازاں وہ ایک ہاؤس بوٹ میں رہے۔ پندرہ روز کے لیے انہوں نے حکومتِ کشمیر کے مہمان کے طور پر سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا اور اس کے بعد آپ دوبارہ ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو گئے اور پھر یہاں سے لاہور آ گئے۔ میں صبح 10 بجے قائداعظمؒ کے پاس جاتا۔ پہلے پانچ منٹ وہ کشمیر اور ہندوستان کے متعلق باتیں کرتے' پھر مجھے اردو کے خط دیتے۔ میں انہیں پڑھ کر سناتا یعنی خطوں کا انگریزی ترجمہ کرنے کو کہتے۔ پہلا خط جس کا ترجمہ میں نے کیا' وہ گاندھی نے قائداعظمؒ کو لکھا تھا۔ اس وقت کانگرسی رہنما جیل میں تھے' صرف گاندھی تازہ تازہ رہا ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے خط میں قائداعظمؒ سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ اس خط کے نتیجے میں بمبئی میں مشہور زمانہ گاندھی جناح مذاکرات ہوئے تھے۔ اخبارات کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کرتے۔ اہم خبروں پر اپنے قلم سے نشان لگاتے۔ بعد میں ہم انہیں کاٹ کر فائل میں لگا دیتے۔ وفود اور مہمانوں سے صبح کے وقت ملاقات کرتے۔ دوپہر کو آرام فرماتے' شام کو دریا کے کنارے سیر کرتے۔ کشمیری مسلمان انہیں دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ ان ہی دنوں لیاقت

علی خان، قاضی عیسیٰ، ہاشم گز در اور لیگ کے کچھ اور مرکزی رہنما چند دن کے لیے کشمیر آئے۔ ان کی آمد بھی کشمیر میں پاکستان کے حامیوں کے لئے تقویت کا باعث بنی۔ نجی اجتماعات اور استقبالیوں میں لوگ قائداعظمؒ کے نظریات سے فیض یاب ہوتے رہے۔ میر واعظ محمد یوسف نے میر واعظ منزل میں قائداعظم کو دعوتِ طعام دی تھی۔

قائداعظمؒ کی زندگی میں ڈسپلن اور نظم بہت تھا۔ اس طرح جب ایک شخص کو اپنے باس (Boss) کے طریق کار کا علم ہو جائے تو اس کے لیے کام کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ اگر چہ قائداعظمؒ کا ایک منظم ضابطہ تھا مگر سیاست میں عام طور پر وقت کی پابندی نہیں کی جا سکتی چنانچہ کئی بار متواتر ایسے کئی ہفتے آئے جب ہم صبح 7 بجے سے رات 2 بجے تک کام کرتے رہے، خاص طور پر جب لیگ کا سیشن ہو رہا ہوتا۔ ان دنوں جب وائسرائے سے بات چیت چل رہی ہوتی یا کابینہ مشن آیا ہوتا تو قائداعظمؒ کے معمولات اس طرح کے ہوتے کہ صبح نو بجے دفتر پہنچ جاتے اور اگر کسی ملاقاتی سے وقت طے نہیں ہوتا تھا تو اپنی ڈاک دیکھتے۔ اس کے بعد ملاقاتیوں سے ملتے یا کہیں جانا ہوتا تو وہاں چلے جاتے۔ اس کے بعد ایک ڈیڑھ بجے لنچ پر آتے۔ آدھ پون گھنٹہ آرام کرتے اور سوٹ ہی میں سو جاتے۔ دراصل وہ سوتے نہیں تھے بلکہ ایک طرح کی Relaxation ہوتی تھی۔ پھر ساڑھے چار بجے دوسری سٹڈی (Study) میں آ جاتے۔ بمبئی میں ان کی دو سٹڈی تھیں۔ شام کو وہ اوپر والی سٹڈی میں بیٹھتے تھے۔ 1944ء میں ان کی گاندھی سے ملاقاتیں اور مذاکرات اسی اوپر والی سٹڈی میں ہوئے تھے۔

ان کی تمام زندگی میں ڈسپلن تھا۔ ان کی دوسری صفت یہ تھی کہ وہ بہت صاف گو آدمی تھے۔ مثال کے طور پر ایک روز کہنے لگے کہ کام بڑھ گیا ہے، سٹاف کم ہے، اس لیے تمہاری معاونت کے لیے ایک دو آدمی اور ہونے چاہئیں۔ پشاور میں انہوں نے کسی سے بات کی وہاں سعد اللہ خان نے ایک صاحب علی احمد کو ان کے پاس بھیجا۔ یہ علی احمد وہاں

صاحبزادہ عبدالقیوم کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے پاس آ کر کہا کہ یہ عجیب قسم کا سیاسی دفتر ہے۔ وہاں ہم پشاور میں تو کبھی فون پر آواز بدل کر بات کرتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ میں فلاں ہندو بول رہا ہوں' کبھی کہتے تھے فلاں سکھ بول رہا ہوں۔ یہاں آپ سیدھی بات کرتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قائد اعظمؒ کے دفتر میں ایسی کوئی ہیر اپھیری والی بات نہیں ہوتی تھی نہ ایسی چالاکیاں کی جاتی تھیں۔ وہ کھرے اور صاف ستھرے انسان تھے اور ان کے مخالفوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

مہاراجہ کی بزدلی

ان دنوں دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ مہاراجہ کشمیر نے اپنی دو بٹالین فوج برطانیہ کو دی تھی جو اس وقت مشرق وسطیٰ کے محاذوں پر تھی۔ قائد اعظمؒ کے دورۂ کشمیر سے پہلے ہی مہاراجہ اپنے فوجیوں سے ملنے مشرق وسطیٰ جا چکے تھے۔ وہ واپس آئے تو قائد اعظمؒ واپس لاہور جانے والے تھے۔ خیال تھا قائد اعظمؒ اور مہاراجہ کی ملاقات ہو جائے گی۔ مہاراجہ نے اخلاقی فرض کے باوجود قائد اعظمؒ کو دعوتِ ملاقات نہ دی تو قائد اعظمؒ نے باہر سے آئے ہوئے ایک سیاح کی حیثیت سے مہاراجہ سے ملنا چاہا لیکن مہاراجہ نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اس خیال سے کہ کانگرسی عناصر اس ملاقات سے بگڑ نہ جائیں' وقت کی کمی کا سہارا لیا۔ ملاقات نہ ہو سکی۔ دراصل مہاراجہ کے محل میں بالخصوص مہارانی تارادیوی کے گرد کانگرس نواز عناصر کا ایک حلقہ قائم ہو چکا تھا جنہوں نے مہاراجہ کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اس وقت اکثر غیر مسلموں کا تاثر یہی تھا کہ پاکستان کا قیام ناممکن ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ قائد اعظمؒ اور مہاراجہ کی ملاقات ہو جاتی تو مستقبل پر اس کا بہت خوشگوار اثر مرتب ہوتا۔ مہاراجہ کو اندازہ ہوتا کہ پاکستان کا وجود ممکن ہے تو وہ قائد اعظمؒ سے ملاقات کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اس طرح بعد میں ریاست میں تلخی پیدا نہ ہوتی اور جموں کے مسلمان اتنی تعداد میں شہید نہ ہوتے۔

مسئلہ کشمیر کے تین عوامل

قائداعظمؒ کے دورے سے کشمیری مسلمانوں کی سیاست پر گہرا اثر پڑا۔ پاکستان کے حامی عناصر کو زبردست تقویت پہنچی۔ صوبہ کشمیر جہاں شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کی بنیادیں بڑی مضبوط تھیں، وہاں مسلم کانفرنس میں جان پڑ گئی۔ زیادہ خوشگوار اثر یہ ہوا کہ پنڈت پریم ناتھ بزاز کی رہنمائی میں کشمیری ہندوؤں کا ایک ترقی پسند گروہ مطالبۂ پاکستان کا ہمنوا بن گیا۔ پاکستان بننے پر جب بزاز صاحب کو گرفتار کیا گیا تو پولیس وین میں سوار ہونے سے پہلے انہوں نے 'پاکستان زندہ باد' کا نعرہ لگایا تھا۔ قائداعظمؒ نے مسلم کانفرنس کے رہنماؤں چوہدری غلام عباس اور میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ کو مسلم کانفرنس کی تنظیم نو کے بارے میں ہدایات اور مشورے دیئے مگر بدقسمتی سے کچھ مقامی مجبوریوں اور کچھ بے سروسامانی کی وجہ سے ان مشوروں پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا۔

قائداعظمؒ کے اس دورے سے ریاست کے تمام سیاسی عناصر کا رویہ ظاہر ہو گیا۔ مسلم کانفرنس کی تنظیم کی کمزوریاں نمایاں ہو گئیں۔ نیشنل کانفرنس کا دوغلہ پن بے نقاب ہو گیا اور ریاستی حکومت کی گومگو کی پالیسی بھی سامنے آ گئی۔ یہی وہ تین عوامل تھے جن کی وجہ سے کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوا، پیچیدہ بنا اور ابھی تک حل طلب ہے۔

میں بادشاہ نہیں ہوں

قائداعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناحؒ سری نگر سے بارہ مولہ اور مظفر آباد ہوتے ہوئے پنڈی کے راستے لاہور پہنچے۔ مسٹر لوبو اور میں براستہ بانہال جموں سیالکوٹ سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ ہم مدوٹ ولا میں ٹھہرے تھے۔ قائداعظمؒ نے لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا جس میں خضر کے اخراج، گاندھی سے ملاقات اور دیگر اہم معاملات پر غور کیا جانا تھا۔

واپس آ کر قائداعظمؒ بڑے خوش، ہشاش بشاش اور مطمئن تھے۔ کار سے اترتے ہی

کہا ''پنجاب جاگ اٹھا ہے''۔ جرنیلی سڑک سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ مسلم لیگی کارکنوں' طلبا اور عام مسلمانوں نے قائداعظمؒ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس برکت علی محمڈن ہال میں ہوا۔ قائداعظمؒ بالعموم بغیر نوٹس تیار کیے تقریر کرتے تھے۔ اس اجلاس میں پہلے سے تیار ایک تقریر پڑھ کر سنائی۔ اس کا مسودہ لیاقت علی خان اور ایڈیٹر ڈان ''مسٹر پوتھن جوزف'' کو بھی دکھایا۔ جوزف بطور خاص دہلی سے لاہور آئے تھے۔ ان ہی دنوں ایک بوڑھا دیہاتی قائداعظمؒ سے ملنے ملتان سے ممدوٹ ولا پہنچا۔ قائداعظمؒ اس سے پورچ میں ملے۔ ہاتھ ملایا تو اس آدمی نے پانچ سو روپے کا نوٹ بطور نذرانہ پیش کیا' قائداعظمؒ نے منع کیا تو وہ بولا ''سائیں توں ساڈا بادشاہ ایں''۔ قائداعظمؒ نے اسے سمجھایا کہ میں بادشاہ نہیں ہوں۔ دیہاتی وفورِ جذبات میں کوئی بات سنتا ہی نہ تھا۔ اس قسم کا ایک واقعہ دلّی میں بھی پیش آیا تھا۔ قائداعظمؒ مسلم لیگ کے سیشن کے لیے امپیریل ہوٹل میں داخل ہونے لگے تو کسی نے ''شہنشاہ پاکستان'' کا نعرہ لگایا۔ قائداعظمؒ رک گئے اور نعرہ لگانے والے کو سختی سے ٹوکتے ہوئے بولے ''پاکستان میں شہنشاہیت نہیں' جمہوریت ہوگی''۔

یادگار اجلاس

مسلم لیگ کے اس اجلاس اور بعد میں میری موجودگی میں جتنے اجلاس ہوئے' ماحول میں سنجیدگی اور وقار نمایاں ہوتے۔ قائداعظمؒ کے دبدبے کی وجہ سے کوئی بے ضابطگی یا کوئی غیر سنجیدہ بات دیکھنے میں نہ آتی۔ قائداعظمؒ کے بعض نقاد کہتے ہیں کہ وہ ڈکٹیٹر تھے۔ اس بات کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ ڈسپلن کے پابند ضرور تھے مگر انہوں نے کبھی کسی فرد کی رائے کو دبانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر و بیشتر اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔ قائداعظمؒ سے مسلم لیگ کے رہنماؤں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کی رائے کو اپنی رائے سے بے حد مقدم سمجھتے۔ خود سوچیے اگر قائداعظمؒ چاہتے تو خضر کے اخراج یا گاندھی سے ملاقات کے مسئلے پر اجلاس بلانے کی ضرورت محسوس

نہ ہوتی۔لیکن ان کی خواہش تھی کہ مسلم لیگی رہنماؤں سے مکمل تائید حاصل کریں۔

میری موجودگی میں مسلم لیگ کونسل کے جو اجلاس ہوئے' ان میں یادگار اور تاریخی اجلاس دہلی میں جون 1947 ءمیں ہوا۔ اس میں ماؤنٹ بیٹن کا فارمولا پیش کیا گیا تھا۔ اجلاس میں مولانا حسرت موہانی اور بعض دوسرے بزرگوں نے اس فارمولے کی جی کھول کر مخالفت کی اور شاید بعض لوگوں کو یہ بات یاد نہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ماؤنٹ بیٹن فارمولا متفقہ طور پر منظور نہیں کیا تھا۔

تیس کے قریب ووٹ مخالفت میں بھی آئے تھے۔مسلم لیگ کونسل کی منظور کردہ قرارداد کی شکل یہ تھی کہ ہم ماؤنٹ بیٹن فارمولے کو اپنے مطالبے کی تکمیل نہیں سمجھتے بلکہ اسے Compromise کے طور پر قبول کرتے ہیں۔

اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں تمام مسائل پر بڑی تفصیل سے گفتگو ہوتی تھی۔ارکان کی تعداد اکیس تھی چوہدری خلیق الزمان' نواب اسمٰعیل خان' نواب زادہ لیاقت علی خان' سردار عبدالرب نشتر' خواجہ ناظم الدین اور مسٹر اصفہانی وغیرہ مدلل گفتگو کے ذریعے بھرپور انداز میں بحث کرتے' بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اختلاف رائے کی وجہ سے کمیٹی کا اجلاس طول پکڑتا گیا تاکہ کسی فیصلے یا نتیجے پر پہنچ سکے۔

میرے ذہن میں ایسا کوئی واقعہ نہیں جس سے مفاد پرست عناصر کے پھیلائے ہوئے اس تاثر کو تقویت ملتی ہو کہ قائداعظمؒ اپنی پارٹی میں ڈکٹیٹر تھے۔ایک مرتبہ کسی رکن نے یہ تجویز پیش کی کہ قائداعظمؒ کو مسلم لیگ کا تاحیات صدر بنادیا جائے۔قائداعظمؒ نے سختی سے اس تجویز کو مسترد کردیا۔

اہم تبدیلی آگئی

بات جولائی' اگست 1944 ءکی ہورہی ہے۔اس وقت برصغیر کی سیاسی پوزیشن میں واقعی تبدیلیاں آچکی تھیں۔جنگِ عظیم میں اتحادیوں کی پوزیشن کافی مضبوط تھی۔صاف

نظر آ رہا تھا کہ وہ عنقریب جیت جائیں گے اور اس کے بعد برصغیر کی آزادی کا مسئلہ برطانیہ کے لئے بڑی آزمائش کا باعث ہوگا۔ ان حالات کے پیش نظر انگریز معاملات کو سنبھالنے کی فکر میں تھے کیونکہ ہندوستان کی فوج میں ملک کی آزادی کے لئے جو جذبہ پایا جاتا تھا' اس سے انگریز بے خبر نہیں تھے۔ برطانیہ کو احساس تھا کہ فوج باغی ہو جائے تو ملک پر تسلط باقی نہیں رہ سکتا۔ جنگ کا خطرہ ٹل جانے کی وجہ سے کانگرسی رہنماؤں کی نظر بندی بھی اب ضروری نہیں تھی۔ کانگرسی لیڈروں کی رہائی کے لیے عوامی مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ گاندھی نے خود رہا ہونے کے بعد وائسرائے سے مطالبہ کیا تھا کہ بقیہ کانگرسی لیڈروں کو بھی رہا کر دیا جائے۔

ملکی سطح پر ایک اور خوشگوار تاثر کانگرسی لیڈر اور گاندھی کے سمدھی شری راج گوپال اچاریہ نے پیدا کیا تھا' انہوں نے کانگرس پر زور دیا تھا کہ مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لیا جائے۔ ترقی پسند حلقے بھی مسلم لیگ کی تحریک یعنی تحریک پاکستان کو اب اتنا رجعت پسند نہ سمجھتے تھے۔ جرمنی کے روس پر حملے کے بعد سے ہی کمیونسٹوں کی پالیسی میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی۔ ادھر مسلم لیگ کی یہ پوزیشن تھی کہ فضل الحق اور خضر حیات کو نکالنے کے بعد وہ صحیح معنوں میں عوامی تحریک بنتی جا رہی تھی۔ بنگال کے بعد دوسرے بڑے مسلم صوبے پنجاب میں بھی مسلم لیگ ہر طبقے میں اپنا اثر قائم کر رہی تھی۔

ان حالات میں برصغیر کی سیاست میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ انگریز کے تو چل چلاؤ کے دن آ گئے ہیں' اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان ایک رہتا ہے یا اس کی تقسیم ہو جائے گی اور اس پس منظر میں قائداعظمؒ کی شخصیت اور سیاسی کردار سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

بھوپال میں

ہندوستان کی سیاست میں والیانِ ریاست کا بھی مخصوص اور منفرد کردار رہا ہے۔ ان دنوں انہیں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں سخت پریشانی لاحق تھی۔ والی بھوپال نواب حمید

اللہ خان کے قائداعظمؒ سے گہرے مراسم تھے۔ انہوں نے قائداعظمؒ کو بمبئی جاتے ہوئے راستے میں بھوپال ٹھہرنے کی دعوت دی۔ لاہور میں کونسل کے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد قائداعظمؒ نے بمبئی کا سفر اختیار کیا تو راستے میں دو روز کے لئے بھوپال بھی ٹھہرے۔

نواب حمید اللہ خان تعلیم یافتہ' ذہین اور ایک زیرک انسان تھے۔ بھوپال ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ انہوں نے اپنی عقلمندی سے والیانِ ریاست کی تنظیم چیمبر آف پرنسز میں اچھا خاصا مقام حاصل کرلیا تھا۔ وہ ایک عرصے تک چیمبر کے چانسلر بھی رہے۔ ان کے گاندھی سے بھی گہرے مراسم تھے۔ اگر کشمیر اور حیدرآباد جیسی بڑی ریاستوں کو نواب حمید اللہ خان جیسے رہنما نصیب ہوتے تو یہاں کے عوام کی تقدیر بدل جاتی۔

بھوپال میں دو روز قیام کے بعد ہم بمبئی پہنچے تو جناح گاندھی متوقع ملاقات اور خضر حیات کے مسلم لیگ سے اخراج کے باعث مسلم لیگ ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ مسلمانانِ بمبئی نے وکٹوریہ سٹیشن پر قائداعظمؒ کا شاندار استقبال کیا۔ بہت بڑے جلوس کی صورت میں انہیں مختلف علاقوں اور بازاروں سے گزار کر مالابار ہل پر واقع ان کی رہائش گاہ تک پہنچایا گیا۔ تمام راستے میں پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ بمبئی میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور تعداد میں بھی کم ہیں' اس قدر جوش' ولولے اور عقیدت سے لوگ قائداعظمؒ پر نچھاور ہوں گے۔

جناح-گاندھی ملاقات

قائداعظمؒ سے گاندھی کی ملاقات پہلے اگست کے آخری ہفتے میں اور پھر دو ستمبر کو مقرر ہوئی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ملاقات ملتوی کرنا پڑی اور 9 ستمبر کو ہوئی۔ گاندھی برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بمبئی انتظامیہ نے برلا ہاؤس سے قائداعظمؒ کی کوٹھی مالابار ہل جانے کے سارے راستوں پر ٹریفک بند کردی۔ اخبار نویسوں اور اس علاقے میں رہنے والوں کے لیے خصوصی پاس جاری کئے گئے۔ گاندھی وقتِ مقررہ پر ٹھیک 11 بجے قائداعظمؒ

کی کوٹھی پر پہنچے۔ قائد اعظمؒ نے پورچ میں ان کا استقبال کیا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ بھی وہیں تھیں۔ مسٹر گاندھی کو لفٹ کے ذریعے اوپر کی منزل میں لے گئے' روز یہی معمول ہوتا۔ قائد اعظمؒ گاندھی کا استقبال کرتے۔ وہ واپس جاتے تو قائد اعظمؒ انہیں خدا حافظ کہنے آتے۔ بات چیت پندرہ روز جاری رہی۔ کئی دفعہ دن میں دو بار بھی ملاقاتیں ہوتیں۔ گاندھی کے پرائیویٹ سیکرٹری ان کا کھانا لے کر آتے۔ پہلے روز فیصلہ ہو گیا تھا کہ جو بات چیت ہوگی' اس کا خلاصہ خط کے ذریعے ضابطہ تحریر میں لا کر محفوظ کر لیا جائے گا۔

دوسری جنگِ عظیم کے سلسلے میں لاتعداد غیر ملکی اخبار نویس اور فوٹو گرافر ہندوستان میں موجود تھے۔ یہ غیر ملکی اور ہندوستان بھر کے اخبار نویس جناح گاندھی مذاکرات شروع ہوتے ہی بمبئی چلے آئے۔ وہ سارا سارا دن قائد اعظمؒ کی کوٹھی کے سامنے والے لان میں بیٹھے ''خبر'' کی تلاش اور انتظار میں رہتے۔ بات چیت کے دوران قائد اعظمؒ اور گاندھی کے درمیان کبھی کبھی ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی ہوتی۔ مجھے یاد ہے گاندھی نے ایک دفعہ قائد اعظمؒ سے کہا ''جناح! تم نے مسلمانوں کو مسمریزم کر دیا ہے۔'' قائد اعظمؒ جھٹ بولے ''گاندھی تم نے ہندوؤں پر ہپناٹزم کر دیا ہے''۔ 23 ستمبر کو آخری روز بات چیت ناکام ہو گئی۔ پہلے کے فیصلے کے مطابق جناح گاندھی خط و کتابت اخبارات میں شائع کر دی گئی۔ قائد اعظمؒ نے بڑی تفصیل سے مطالبۂ پاکستان اور مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے تصور کی وضاحت کی اور گاندھی کے ارادوں کو بے نقاب کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے گاندھی اس بات چیت سے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے کہ اگر کانگرس کے لیڈروں کو رہا نہ کیا گیا تو میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوں۔ اس کے برعکس قائد اعظمؒ کی کوشش تھی کہ گاندھی کو مطالبۂ پاکستان کے بارے میں قائل کیا جائے۔ ہندوؤں کے اعتراضات کا ٹھوس جواب دیا جائے۔ اس وقت ہندوؤں کے حلقوں میں بھی یہ تاثر تھا کہ قائد اعظمؒ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ گاندھی کا منصوبہ

ناکام ہوگیا۔

1944ء میں ''گاندھی - جناح'' ملاقات تحریکِ آزادی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ خورشید نے اس سلسلے میں ایک بار بتایا کہ بحیثیت قائداعظمؒ کے سیکرٹری میرے لیے بھی ایک بڑا اہم موقع تھا۔ قائداعظمؒ وقت کے بے حد پابند تھے۔ مسٹر گاندھی کے آنے سے پہلے اپنے کریم رنگ کے سِلک کے سوٹ میں وہ تیار ہوگئے تھے اور ان کے منتظر تھے۔ میں بھی مسٹر گاندھی کے انتظار میں انہیں قائداعظمؒ کے پاس لانے کے لیے کھڑا تھا۔ مسٹر گاندھی وقت پر پہنچے۔ دھوتی اور چھوٹے سے کرتے میں ملبوس، ٹانگیں اور بازو ننگے اور جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کی مہک تھی۔ قائداعظمؒ انہیں ملنے کے لیے کھڑے تھے۔ گاندھی آتے ہی قائداعظمؒ کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ ان کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ تیل کی بو اور قائداعظمؒ کے ساتھ اس طرح ملنا ان کی نفیس خوش پوشی کے لیے انہیں گراں گزرا۔ وہ لمحوں میں معذرت کر کے اپنی خواب گاہ میں گئے اور اپنا ویسا ہی دوسرے سلک کا سوٹ پہن کر آ گئے۔ گاندھی کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ چند منٹوں کے لیے صرف سوٹ بدلنے کے لیے اندر گئے تھے۔ قائداعظمؒ نہایت خوش پوش اور نفیس آرام دہ زندگی گزارتے تھے۔ تیل کی ذرا سی مہک بھی انہیں ناگوار لگی ہوگی۔ قائداعظمؒ کے پاس کریم رنگ کے سلک کے کئی سوٹ تھے جو وہ گرمی کے موسم میں پہنا کرتے تھے۔ ویسے ہی دو سوٹ انہوں نے خورشید کو بھی دیئے تھے جو انہوں نے بعد میں کئی خاص موقعوں پر پہنے۔ ان کے المناک حادثے کے بعد میں نے وہ سوٹ اور ایک اوورکوٹ جو قائداعظمؒ نے 1946ء میں لندن کانفرنس کے موقع پر انہیں دیا تھا، قائداعظم کی سوسالہ تقریب کے موقع پر ڈاکٹر زوار زیدی کو قائداعظمؒ مزار کے میوزیم کے لیے دے دیے تھے۔ ڈاکٹر زوار زیدی اس وقت قائداعظمؒ پیپرز کے انچارج تھے۔

ایک اور بات جو ''گاندھی - جناح ملاقات'' کے سلسلے میں اہم ہے یہ ہے کہ ملاقات دو دن کے لیے مخصوص تھی۔ پہلے دن کی ملاقات کے بعد قائداعظمؒ نے فرمایا کہ

دوسرے دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کا دن ہے۔ اس لیے اس روز وہ ملاقات نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہ ملاقات اگلے روز پر ملتوی کروا دی۔ یہ رمضان کی 26 تاریخ تھی۔خورشید نے بتایا کہ مسٹر گاندھی کی آمد سے چند منٹ پہلے انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو کہا کہ 27 رمضان شب قدر کی رات ہے جو مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ قائداعظم نے انہیں بلایا اور کہا کہ وہ مسٹر گاندھی کو شب قدر کی اہمیت کے متعلق بتائیں کہ یہ رات مسلمانوں کے لیے کتنی مقدس ہے۔خورشید نے مسٹر گاندھی کو اس کی قدر و منزلت اور دینی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کے بارے میں بتایا لیکن مسٹر گاندھی نے سرسری طریقے سے سنا۔ گویا سننا نہ چاہتے ہوں! شاید انہیں اگلے روز تک ملتوی ہونے والی یہ اہم میٹنگ ناگوار لگ رہی تھی۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ایک دلنواز شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ایک سچے انسان اور پکے مسلمان تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک مخلص اور با اصول سیاسی رہنما تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اسلامیانِ ہند ان کی قیادت میں متحد ہو گئے وہاں انگریز اور ہندو بھی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے پائے ثبات میں لرزش پیدا نہ کر سکے۔ قائداعظمؒ کی خوبیوں کا اعتراف اپنوں کے علاوہ دشمنوں نے بھی کیا ہے۔

تحریک آزادی کے دوران مشہور امریکی رسالے "Time" کے نمائندوں نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ انہوں نے قائداعظمؒ کی اصول پسندی اور ولولہ انگیز قیادت کا مشاہدہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی ان سے والہانہ عقیدت کے مظاہرے بھی دیکھے۔ انگریزوں اور کانگرسی رہنماؤں کے مذاکرات کے دوران قائداعظمؒ کی مدلل گفتگو بھی سنی اور ان تمام مشاہدات اور تجربات پر مبنی ایک طویل رپورٹ 22 اپریل 1946ء کے شمارے میں ٹائٹل سٹوری کے طور پر شائع ہوئی جو قائداعظمؒ کی ہمہ گیر شخصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ ٹائم نے یہ رپورٹ یوں شائع کی:

''یہ 1946ء ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ دہلی میں گرمی عروج پر ہے۔ یہاں انگریز سڑکوں پر پسینے میں شرابور نظر آتے ہیں اور چاندنی چوک پر کئی انگریزوں نے گرمی سے بوکھلا کر اپنی قمیض تک اتار دی ہے۔ دلی میں اس وقت حبس کی فضا طاری ہے۔ عوامی حلقوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا ہے کہ برطانوی راج کا خاتمہ کب ہوگا؟ وکیلوں میں اس بات کی بحث جاری ہے کہ برطانوی راج کے خاتمے کی خبر آیا حقیقت کا روپ دھار سکے گی۔ کیا برطانوی حکمران ہندوستان کو آزادی دینے میں مخلص ہیں اور اگر اس خبر میں صداقت ہے تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ ہندوستان کو آزادی کا سورج دیکھنا کب نصیب ہوگا؟ غرض یہ کہ پورا شہر خدشوں اور وسوسوں کی زد میں ہے۔ لگتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت آزادی کی تحریک اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے اور تمام ہندوستان کی توقعات اب یہی ہیں کہ بہت جلد ان کے غیر ملکی آقا ان کی سرزمین کو خیرباد کہہ دیں گے''۔

''ابھی پچھلے ہفتے برطانوی کابینہ مشن کے تین ارکان نے ہندوستانیوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ آزادی کے حصول کے لیے حتمی قدم اٹھائیں گویا یہ برطانوی حکومت کی طرف سے ایک آزاد مملکت کے قیام پر رضامندی کا اظہار تھا۔ برطانوی وزراء لارڈ پیتھک لارنس' اے اے الیگزنڈر اور سرسٹیفر ڈ کرپس نے کشمیر کے ٹھنڈے موسم میں ہندوستان کی آزادی کے منصوبے کو حتمی شکل دی۔ انہیں یہ یقین ہے کہ وہ ایک قابلِ عمل منصوبے کے ساتھ واپس جائیں گے ایک ایسا منصوبہ جس پر تمام کا اتفاق رائے ہوگا''۔

اب تمام منصوبہ ساز قریب قریب اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ ہندوستان کو آزادی ملنے والی ہے۔ لیکن اس آزادی کی شکل کیا ہوگی اس بارے میں کوئی واضح بات ابھی نہیں کہی جاسکتی۔ اب اس مسئلہ کا رخ صرف ایک شخص کی ذات تک محدود ہے۔ اور وہ محمد علی جناح ہے۔ قراقلی ٹوپی پہننے والا یہ شخص جو ہندوستانی مسلمانوں کا مسلمہ رہنما ہے اور جو

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کو ناگزیر سمجھتا ہے اب جبکہ کابینہ مشن کے ارکان اینگلو عربیک کالج میں ہندوستانی رہنماؤں سے مذاکرات کر رہے تھے عین اس وقت سبز اور سرخ جھنڈے ہاتھ میں لیے لوگوں کا ایک ہجوم باہر نعرے لگا رہا تھا:۔

''ہمیں پاکستان چاہئے۔
پاکستان لیں گے یا مر جائیں گے''۔

سخت تقریر

بعض حلقے جو قائداعظمؒ پر تنقید کے کسی نہ کسی موضوع کی تلاش میں رہتے تھے' کہتے کہ قائداعظمؒ کو گاندھی کے پاس چلے جانا چاہئے تھا۔ قائداعظمؒ تک بھی یہ باتیں پہنچیں۔ ان کا موقف تھا کہ میرا رویہ قاعدے اور ضابطے کے عین مطابق ہے۔ گاندھی نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی ہے' میں نے نہیں۔ اس لئے ان کو ہی میرے پاس آنا چاہئے۔ قائداعظمؒ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ گاندھی کسی معقول نتیجے پر نہیں پہنچیں گے۔ اس لئے ان کے پاس جانا فضول ہے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ گاندھی معقولیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارا مطالبہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں تو میں ان کے پاس چل کر جانے کو تیار ہوں۔ گاندھی کے بارے میں قائداعظمؒ کا یہ تجزیہ اور رویہ بار بار کے تجربات کا نتیجہ تھا۔ گاندھی کوئی بات کر کے بچنا چاہتے تو کہتے'' کہ میں کیا کروں' میں تو کانگرس کا دو آنے والا رکن بھی نہیں ہوں'' حالانکہ کون نہیں جانتا کہ کانگرس گاندھی کی جیب کی گھڑی اور ہاتھ کی چھڑی تھی۔

یہ بحث دراصل اس لئے چھڑی کہ گاندھی نے اپنے ایامِ اسیری میں قائداعظمؒ کو ایک خط لکھا۔ اس میں مشروط قسم کی پیش کش تھی اور اس خط کا قصہ بھی سن لیجئے۔ ہوا یوں کہ قائداعظمؒ نے ایک روز بڑی سخت تقریر کی اور کہا کہ گاندھی ہر تیسرے روز وائسرائے کو خط لکھتے ہیں۔ آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں آزادی انگریز سے مانگے نہیں ملے

گی ۔آ زادی لینی ہےتو گاندھی آ ئیں اور میرے ساتھ بات کریں ۔ یہ انگریزوں کا مسئلہ نہیں ہے ۔مسٹر گاندھی ہمارا مطالبہ تسلیم کرلیں تو ہم خود فیصلہ کریں گے ۔ وائسرائے کو خط لکھنے کی ضرورت نہیں ۔ بہت سخت تقریر تھی ۔ قائداعظمؒ نے زور دے کر کہا کہ اگر کانگرس کو زعم ہے کہ وہ برطانیہ کے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہےتو ہم کہتے ہیں کہ ہم کانگرس سے 500 گنا زیادہ خار پیدا کرسکتے ہیں ۔اس ضمن میں قائداعظمؒ نے انگریزوں کو بھی دھمکی دی تھی کہ گاندھی مجھے خط لکھیں ۔ میں دیکھوں گا کون اس خط کو مجھ تک پہنچنے سے روک سکتا ہے ۔گاندھی نے جیل میں یہ تقریر پڑھی تو قائداعظمؒ کو ایک گول مول سا خط لکھ دیا کہ آپ نے بات چیت کے لئے شرط رکھی ہے ۔ ہم اسے بعد میں طے کرسکتے ہیں وغیرہ ۔ انگریزوں نے شرارت کی' وائسرائے کے سیکرٹری نے قائداعظمؒ کو خط لکھا کہ مسٹر گاندھی نے جیل سے آپ کو خط لکھا ۔ کیونکہ وہ جیل میں رہ کر خط و کتابت نہیں کرسکتے' اس لئے وہ خط آپ تک نہیں پہنچایا جا سکا تاہم انہوں نے اپنے خط میں یہ لکھا ۔آگے خط کی ساری عبارت نقل کردی گئی تھی ۔

شملہ کانفرنس

برطانوی حکومت' جناح گاندھی مذاکرات کو سیاسی بیرومیٹر کا درجہ دے رہی تھی کہ اس سے حالات اور واقعات کی سمت جاننے اور متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی تھی ۔ مذاکرات ناکام ہوئے تو برطانوی حکومت نے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی عوام کے تاثرات معلوم کرنے اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے کی کارروائی شروع کر دی ۔ کانگرس کو اپنا یہ مطالبہ ترک کرنا پڑا کہ انگریز ایک ہی بار ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں ۔قائداعظمؒ کی تجویز کہ پہلے بات چیت ہو پھر انگریز جائیں' تسلیم کرلی گئی ۔کانگرسی رہنماؤں پنڈت نہرو' ابوالکلام آزاد' سردار پٹیل اور دیگر لیڈران کو رہا کر دیا گیا ۔ وائسرائے لارڈ ویول نے شملے میں ہندوستانی لیڈروں کی پہلی کانفرنس طلب کی ۔ اس کانفرنس میں کانگرس اور مسلم لیگ کے علاوہ اکالی دل' عیسائیوں اور اچھوتوں کے لیڈروں

کو بھی دعوت دی گئی ۔ قائد اعظمؒ کے ساتھ لیاقت علی خان بھی شملہ گئے مگر کانفرنس میں اکیلے قائد اعظمؒ نے شرکت کی ۔

لارڈ ویول نے تجویز پیش کی کہ وائسرائے کے ماتحت ایک عارضی حکومت قائم کی جائے جو برصغیر کا نظم ونسق چلائے ۔ اس کے بعد ہی برصغیر کی آزادی کے سوال پر غور کیا جائے گا ۔ کانگرس ہائی کمان اس پر راضی تھی مگر مسلم لیگ نے یہ تجویز مشروط طور پر قبول کی ۔ قائد اعظمؒ کا کہنا تھا کہ وہ عارضی حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ :۔

1- کانگرس اور مسلم لیگ کو برابر نشستیں دی جائیں ۔
2- مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے ۔

کانگرس اس پر راضی نہ ہوئی ۔ وائسرائے پر زور دینے لگی کہ اگر مسلم لیگ شامل نہیں ہوتی تو نہ ہو' کانگرس اکیلے ہی حکومت بنانے کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے ۔ وائسرائے نے اس پر اتفاق نہ کیا اور شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی ۔

انتخابات کا چیلنج

کانفرنس کی ناکامی کے بعد تو ہندوستان کے ہندو پریس میں قائد اعظمؒ کے خلاف طوفان کھڑا ہو گیا ۔ قائد اعظمؒ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے ۔ ایسی باتوں کی پروا تک نہ کرتے ۔ انہوں نے عام انتخابات کا مطالبہ کر دیا ۔ دلیل یہ تھی کہ کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے پر تیار نہیں تو انتخابات کروالو فیصلہ ہو جائے گا ۔ کانگرس اس وقت انتخابات سے گریز کر رہی تھی ۔ عام انتخابات کا اعلان ہوا تو مسلم لیگ نے زوردار انتخابی مہم چلائی ۔

انتخابی مہم' آج اور کل

اس انتخابی مہم کی یاد ذہن میں لائیں اور آج کل پاکستان کی انتخابی مہم کا جائزہ لیں تو زمین اور آسمان کا فرق نظر آئے گا ۔ انتخابات کی گہما گہمی میں مسلم لیگ کے حامیوں'

رضا کاروں اور نوجوانوں کی ٹولیاں مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتیں مگر کسی بھی ذمہ دار سنجیدہ لیڈر سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی جسے طفلانہ کہا جائے۔ پوری مہم میں کہیں ناچ گانے یا مزاحیہ گروپوں کا بندوبست نظر نہ آیا۔ مسلم لیگ نے انتخابات کے لئے کمیٹی آف ایکشن اور پارلیمانی بورڈ بنائے۔ اس کے ارکان دورے کرتے رہے۔ تقریروں میں مسلمانوں میں قومی شعور پیدا کرنے اور اپنے لئے ایک علیحدہ وطن قائم کرنے کے مطالبے اور اس کی ذمہ داری کا احساس دلایا جاتا۔ بحث ایک نکتے کے گرد گھومتی رہتی' ہندوستان ایک رہے گا یا بٹے گا۔ مسلمانوں کے اقتصادی' معاشرتی اور دیگر مسائل ظاہر ہے کہ اس بڑے مطالبے کے تابع تھے۔ مسلم لیگ نے واضح کر دیا تھا کہ پاکستان میں حکومت اور نظامِ حکومت اسلامی روایات اور اصولوں کے مطابق ہوں گے۔

کانگرس نے بھی اپنی پالیسی کے مطابق مہم چلائی۔ بعض کانگرسی اور احراری لیڈروں نے انتخابی مہم میں قائداعظمؒ کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی۔ ان کی شادی کا قصہ اچھالا کہ مسلمانوں کے قائد نے غیر مسلم خاتون سے شادی کی ہے مگر ساری باتیں بے بنیاد ثابت ہوئیں کیونکہ 1918ء کے وہ تراشے موجود تھے جن میں قائداعظمؒ کی اہلیہ محترمہ رتن بائی کے شادی سے قبل اسلام قبول کرنے اور اسلامی طریقے سے نکاح کی خبریں تھیں۔

انتخابات میں قائداعظمؒ نے سرحد' بنگال اور آسام کا دورہ کیا۔ بیماری کی وجہ سے میں سرحد کے دورے پر قائداعظمؒ کے ساتھ نہ جا سکا لیکن سردار عبدالرب نشتر نے مجھے بتایا کہ مسلمانوں کا جوش و خروش دیکھ کر قائداعظمؒ کہتے تھے کہ اب میں مر بھی جاؤں تو پاکستان کے قیام کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ بنگال اور آسام کا دورہ تو آج تک نظروں میں گھومتا ہے۔ قائداعظمؒ کافی عرصے سے وہاں نہیں جا سکے تھے۔ پھر ان دنوں وہاں انتخابات کی گہما گہمی تھی۔ بے پناہ جوش و خروش تھا۔ کلکتہ کے ریلوے سٹیشن سے جو سپیشل ٹرین قائداعظمؒ کو لے کر سلہٹ گئی' وہ منزل مقصود پر 72 گھنٹے لیٹ پہنچی۔ جگہ جگہ بنگالی مسلمان

پٹڑی پر لیٹ کر قائداعظمؒ کی تقریر سننے کے لئے گاڑی رکوا لیتے۔ قائداعظمؒ نے دو دن اور دو راتیں جاگ کر گزاریں۔ تقریباً ہر 10 منٹ کے بعد کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنا پڑتا۔ اس کمپارٹمنٹ میں ہمارے ساتھ حسن اصفہانی اور حسین شہید سہروردی بھی تھے۔ ہم لوگ باری باری ایک کوچ پر تھوڑی دیر کے لئے سو بھی جاتے مگر قائداعظمؒ کو سونے کا موقع نہ مل سکا۔ پوری ٹرین پھولوں اور سنگتروں سے بھری ہوئی تھی جو ہر سٹیشن پر استقبال کے لئے آنے والا پر جوش ہجوم قائداعظمؒ پر نچھاور کرتا۔

یہ جوش وخروش دیکھنے کے بعد کسی شک کی گنجائش نہ تھی کہ انتخابات کا نتیجہ کیا ہوگا اگر کسی کو شک تھا تو دورے کے آخر میں کلکتہ کے جلسہ عام کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا جلسہ عام نہیں دیکھا۔ کلکتہ کے میدان میں چار ٹرک جوڑ کر ایک پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ چاروں طرف حدِ نظر تک لوگ ہی لوگ تھے۔ ہمیں اس پنڈال میں پہنچنے میں 25 منٹ لگ گئے۔ کسی بھی صورت میں 10 لاکھ سے کم انسان نہیں تھے۔ جوش وخروش دلوں اور جذبوں کا عالم بیان سے باہر ہے۔

قائداعظمؒ سلہٹ سے آگے بھی گئے یہ سفر کار میں طے ہوا۔ کار میں ہمارے ساتھ سر محمد سعد اللہ (سابق وزیراعظم آسام) بھی تھے۔ جونہی کار کسی بستی کے قریب پہنچتی سر سعد اللہ بتاتے اس گاؤں کا نام یہ ہے آبادی اتنی ہے ہندو اور مسلم آبادی کا تناسب یہ ہے سرکردہ افراد یہ ہیں یہ مسائل ہیں اور یہ ضروریات۔ سر سعد اللہ عوام کی نمائندگی اور قیادت کے سچے دعوے دار تھے۔ عوام کے شب و روز اور مسائل سے اتنی تفصیل سے آگاہ تھے۔ ہم چراپونجی کے پاس سے بھی گزرے۔ یہاں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔

شاندار کامیابی

یہ حد اگانہ انتخابات تھے۔ مسلم لیگ نے مرکزی آمبلی میں سو فیصد کامیابی حاصل کی۔ کانگرس کا ایک بھی مسلم امیدوار کامیاب نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ نے صوبہ سرحد کے سوا

تمام صوبوں میں مسلم سیٹوں کی بھاری اکثریت حاصل کر لی۔ یونینسٹ پارٹی بڑی مشکل سے پنجاب میں 4 نشستیں جیت سکی۔ بنگال کی 120 میں سے 112 نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں۔ تین نشستیں فضل الحق صاحب اور ان کے دوساتھیوں کی تھیں۔ یہ سب بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ قائداعظمؒ بمبئی کے حلقے سے امیدوار تھے۔ کانگرس کے حسین بھائی لال جی کے 126 ووٹوں کے مقابلے میں انہیں 3 ہزار 6 سو ووٹ ملے۔ تاہم ذکر بات یہ ہے کہ پوری انتخابی مہم کے دوران قائداعظمؒ ایک بار بھی اپنے حلقۂ انتخاب میں نہ جا سکے۔ بہرحال برصغیر کے مسلمانوں نے قائداعظمؒ کے اس مطالبے کی توثیق کر دی کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔

جلسہ لٹنے کی کہانی

مسلم لیگ کی شاندار کامیابی پر قائداعظمؒ نے قوم کو مبارک دی۔ 11 جنوری 1946ء کو یومِ فتح منانے کا اعلان کیا۔ اس روز پورے برصغیر میں یومِ فتح منایا گیا۔ انتخابی مہم کے دوران قائداعظمؒ پنجاب تشریف نہ لا سکے تھے۔ 16 جنوری 1946ء کو پنجاب مسلم لیگ نے انتخابات جیتنے کی خوشی میں اسلامیہ کالج میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ قائداعظمؒ بھی اس میں شریک تھے۔ ایک دلچسپ بات اب بھی یاد ہے۔ کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ قائداعظمؒ خطاب فرما رہے تھے۔ ایک لاکھ کے لگ بھگ افراد ہمہ تن گوش تھے۔ قریبی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ لوگ 11 بجے کی اذان پر حیران ہو گئے۔ قائداعظمؒ نے تقریر روک دی اور فرمایا کہ اذان ہو رہی ہے ختم ہو گی تو تقریر جاری کروں گا۔ اذان ختم ہوئی تو قائداعظمؒ نے تقریر جاری کر دی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی بیس خاکسار سر پر کفن نما رومال باندھے آئے۔ جلسہ گاہ کے کناروں پر بکھر کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں علامہ مشرقی آئے۔ قائداعظمؒ تقریر کرتے رہے۔ نواب ممدوٹ نے سامنے کی رو میں کرسی خالی کروا کر علامہ کو وہاں بٹھا دیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد علامہ مشرقی کھڑے ہو گئے اور کہا کہ مسٹر جناح

مجھے موقع دیں۔ میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ قائداعظمؒ نے کہا کوئی بات کرنی ہو تو مجھ سے بعد میں کرلیں۔ میں اس وقت تقریر کر رہا ہوں۔ علامہ مشرقی بولے میں تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ قائداعظمؒ بولے یہ مسلم لیگ کا پلیٹ فارم ہے۔ آپ مسلم لیگ کے ابتدائی رکن بھی نہیں ہیں۔ آپ کو اس پلیٹ فارم سے تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ علامہ مشرقی بیٹھ گئے۔ قائداعظمؒ نے کچھ دیر کے بعد تقریر ختم کی۔ جلسہ برخاست ہوگیا۔ قائداعظمؒ جلسہ گاہ سے آ گئے بعد میں معلوم ہوا کہ خاکساروں نے پنڈال پر حملہ کر دیا۔ مسلم لیگ کے رضا کاروں نے بھی موقع پر گرہ لگائی حسب توفیق خاکساروں کی تواضع کی۔ اس واقعہ سے خاکساروں کا تاثر خاصا خراب ہوا۔ جلسے کے دوران بے وقت اذان دینا، دوسروں کے پلیٹ فارم سے تقریر کرنے کی کوشش کرنا اور پینتیس افراد کی مدد سے ایک لاکھ کے جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرنا بھلا کس بات کی علامت ہیں۔

کامیابیوں کا سال 1946ء

تحریکِ پاکستان کے آخری 7 سال بڑے ہنگامہ خیز اور انقلاب پرور تھے۔ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد جب عوام سیاسی جماعتوں اور برطانوی حکومت کی تمام تر توجہ برصغیر کی سیاسی صورت حال کی جانب مبذول کر دی گئی تو تحریک کو پے در پے تاریخ ساز واقعات سے گزرنا پڑا۔ میرے اندازے کے مطابق 1946ء کا سال ہر پہلو اور ہر اعتبار سے مسلم لیگ کی تنظیم، پاکستان کی تحریک اور قائداعظمؒ کی قیادت کے انتہائی عروج اور کامیابی کا سال تھا۔ اس سال جو واقعات ہوئے، جو اقدامات کیے گئے ان کا نتیجہ اگلے نو ماہ میں پاکستان کی صورت میں دنیا کے سامنے آ گیا۔

یہ بڑا اہم نکتہ ہے کہ جنگِ عظیم کے خاتمے تک بہت سے مدبر برطانوی سیاست دانوں کی اکثریت اور کسی حد تک برطانوی حکومت کے مؤثر حلقے مطالبۂ پاکستان کو Political Bargaining Counter یعنی سیاسی سودے بازی کا ذریعہ سمجھتے

رہے۔خود مسلم لیگ میں بھی بعض عناصر کا خیال تھا کہ اس مطالبے کا مقصد بالآخر ایک علیحدہ سلطنت کا قیام نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے مزید مراعات اور تحفظ حاصل کرنا ہی ہوگا۔کئی سادہ لوح لوگ انگریزوں کے سلسلۂ تدریس کی وجہ سے برصغیر کو ایک ملک اور ایک قوم سمجھتے ہوئے اس تخیل کی نظریاتی طور پر مخالفت کرتے رہے۔ان کا خیال تھا کہ مسٹر جناح جیسا کٹر نیشنلسٹ کسی بھی ملک کے توڑنے کے مطالبے کو آخری مراحل تک نہیں لے جائے گا۔یہ سب قیافے اور اندازے غلط ثابت ہوئے۔

امریکی دباؤ

پہلی شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد جب انتخابات کا فیصلہ ہوا تو قائداعظمؒ نے واضح طور پر کہہ دیا کہ انتخابات کا مقصد یہ ثابت کر دینا ہے کہ مسلمان برصغیر کو تقسیم کر کے یہاں اپنی علیحدہ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔انتخابات میں مسلمانوں نے قائداعظمؒ کے دعوے کو سچا ثابت کر دکھایا۔اس کے بعد سے ہی مختلف سیاسی عناصر حتیٰ کہ برطانوی حکومت کے نمائندوں نے اس مسئلے کو پوری سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش شروع کی۔

اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ امریکہ میں گاندھی اور نہرو کا بہت بڑا امیج تھا۔امریکی عوام اور امریکہ کی حکومتیں ہندوستان کی آزادی کے مطالبے میں ہندوستانی عوام کی ہمنوا تھیں۔وہ ہندوستان کی تحریک کو برطانوی سامراج سے امریکی جدوجہد کے متوازی ایک تحریک سمجھتے تھے مگر جنگِ عظیم کے دوران جب امریکہ نے اپنی فوجیں ہندوستان بھیجیں اور امریکی افسر،اخبار نویس،مصنف اور سفارت کار برصغیر میں آنا شروع ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت مطالبۂ پاکستان کی ہمنوا ہے۔بالخصوص برطانوی فوج میں تقریباً تمام مسلمان سپاہی اور افسر قائداعظمؒ کو اپنا لیڈر سمجھتے تھے۔

جنگِ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی برطانوی حکومت پر امریکہ کا دباؤ بھی بڑھتا گیا کہ اسے ہندوستان میں سیاسی تصفیہ کرنا چاہیے۔اس طرح جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ

اور برطانیہ کے بااثر حلقوں اور ان ملکوں کے سفارت خانوں میں تحریک پاکستان کا مطالبہ سنجیدگی کے ساتھ شروع ہوا۔

کیبنٹ مشن

مسلم لیگ نے انتخابات جیتنے کے بعد 16 اپریل 1946ء کو دلّی میں لیجسلیٹرز کنونشن منعقد کیا۔ جس میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں لیگ کے منتخب نمائندوں نے شرکت کی۔ اس طرح عوام کے منتخب نمائندوں اور قانون ساز اداروں کے ارکان نے واضح طور پر قیام پاکستان کا مطالبہ کیا۔

مسٹر ایٹلی برطانیہ کی نئی حکومت کے سربراہ تھے۔ انہوں نے لارڈ پیتھک لارنس کی سربراہی میں ایک کیبنٹ مشن دلّی بھیجا۔ کمیشن نے تمام فریقوں سے طویل مذاکرات کیے۔ کیبنٹ ڈیلی گیشن کا رویہ یہ تھا کہ باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو وہ اپنا فیصلہ صادر کر دیں گے۔ دلّی اور شملے میں باہمی گفتگو اور سمجھوتے کی کوشش جاری رہی۔ پنڈت نہرو اور قائداعظمؒ کے درمیان دو ملاقاتیں ہوئیں۔

کانگریسی لیڈرشپ سمجھ رہی تھی کہ اسے جو کچھ لینا ہے وہ برطانیہ سے لینا ہے۔ اس لیے اس نے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائیدار اور مستقل سمجھوتے کی خاطر کوئی مخلصانہ کوشش نہ کی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ نے ایک ایسے فارمولے پر رضامندی ظاہر کر دی جس کا مقصد ایک پاکستان فیڈریشن اور ایک ہندوستان فیڈریشن بنا کر دونوں کی کنفیڈریشن بنانا تھا مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ وائسرائے نے 16 مئی 1946ء کو اپنا اعلان جاری کر دیا۔

وائسرائے کے اعلان میں بھی برطانوی حکومت نے آزاد اور خودمختار مملکت کی حیثیت سے پاکستان کا مطالبہ مسترد کر دیا مگر مسلم اکثریت کے دو گروپ اور ہندو اکثریت کے صوبوں کا ایک گروپ بنانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے اوپر ایک کمزور مرکز قائم کیا جانا تھا۔

قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے لیے یہ بہت نازک وقت تھا۔ وائسرائے کے اعلان میں واضح طور پر پاکستان کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا تھا کہ اگر کوئی جماعت اس فارمولے کو قبول نہیں کرتی تو پھر اسے آئندہ حکومت سازی میں حصہ نہیں دیا جائے گا۔ تجویز یہ تھی کہ جو جماعتیں اس فارمولے کو تسلیم کریں گی' ان کے نمائندوں پر مشتمل ایک عارضی حکومت قائم کر دی جائے گی اور انتقالِ اقتدار کا مسئلہ بعد میں طے کیا جائے گا۔ یوں عارضی حکومت میں شامل ہونا خاصی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

وائسرائے کا انحراف

وائسرائے کے اعلان کے بعد کانگرسی حلقے شروع میں بہت خوش ہوئے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ برطانوی حکومت نے ہمیشہ کے لیے مطالبۂ پاکستان مسترد کر دیا ہے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ قائداعظمؒ اس اعلان کو کسی صورت قبول نہیں کریں گے۔ اس کے بعد برطانوی حکومت کے لیے جواز پیدا ہو گا کہ پورا اور مکمل اقتدار کانگرس کے حوالے کر دے۔ اس انتظار میں کئی روز تک کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوتا رہا۔ وہ مسلم لیگ کے ردِعمل کے منتظر تھے۔ قائداعظمؒ نے جون میں ورکنگ کمیٹی اور کونسل کا اجلاس طلب کر لیا۔ اجلاس نے اس منصوبے کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ مسلم لیگ کا یہ فیصلہ کانگرس کے لیے اس قدر غیر متوقع تھا کہ کچھ روز تک تو وہ سنبھل ہی نہ پائی۔ کانگرس نے بھی مجبور ہو کر یہ تجویز قبول کر لی۔ تاہم صوبوں کے گروپوں کے ضمن میں کچھ شرائط عائد کر دیں۔

مسئلہ ایک بار پھر کھٹائی میں پڑ گیا

قائداعظمؒ اس سیاسی جنگ میں سرخرو نکلے۔ انہوں نے برطانوی نمائندوں کو بھی بے نقاب کر دیا۔ برطانوی حکومت اپنے وعدے کے مطابق مرکز کی حکومت مسلم لیگ کے حوالے کرنے کی پابند تھی مگر اس وعدے سے انحراف کرتے ہوئے وائسرائے عارضی حکومت کے مختلف فارمولے پیش کرتا رہا۔

عارضی حکومت کے سلسلے میں قائداعظمؒ کا اصرار تھا کہ صدق دل سے سمجھوتہ کرنا ہے تو انتخابات کے بعد کانگرس کو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور وائسرائے کی کونسل میں مسلم وزیروں کی نامزدگی مسلم لیگ کا حق ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر گاندھی کے لیے یہ بات قابلِ قبول نہ تھی۔

کرپس کا رویہ

دراصل کیبنٹ مشن میں سرسٹیفورڈ کرپس ضرورت سے زیادہ کانگرس کے ہمنوا تھے اور اس جوش میں وہ ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئے تھے۔ جب کانگرس نے کیبنٹ مشن سکیم پر اپنی شرطیں عائد کیں، اسے مشروط طور پر قبول کیا تو سر کرپس فوراً پینترا بدل گئے۔ الفاظ کو توڑ مروڑ کر کانگرس کے حق میں مطلب تلاش کرنے لگے۔ اس پر وائسرائے ہاؤس میں ایک ملاقات کے دوران قائداعظمؒ اور کرپس میں تیز کلامی تک نوبت پہنچی۔ قائداعظمؒ غصے میں میٹنگ سے اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ڈیلی گیشن کے ایک اور رکن مسٹر اے۔ بی۔ الیگزنڈر قائداعظمؒ کی کوٹھی 10 اورنگزیب روڈ آئے اور پوری ٹیم کی طرف سے معذرت کی۔

اب یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ برطانوی حکومت کانگرس کی مشروط منظوری کے بعد ڈانواڈول ہورہی ہے۔ اس کے عزم میں وہ پختگی نہ رہی تھی جو برطانوی حکومت کا خاص شیوہ رہا ہے۔ بہر حال اس سفارتی لڑائی میں بھی قائداعظمؒ سرخرو نکلے۔ کانگرس اور برطانوی نمائندوں کی سرگرمیاں منظر عام پر آگئیں۔ بلاشبہ 1946ء قائداعظمؒ کی کامیابی کا سال تھا۔

ڈائریکٹ ایکشن

مذاکرات کی ناکامی کے بعد قائداعظمؒ نے آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لیے 29-30 جولائی کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کا اجلاس طلب کیا۔

مسلمانوں کے لیے یہ بڑا پُرخطر وقت تھا۔ برطانوی حکومت کا رویہ واضح کر چکا تھا کہ وہ کانگرس کے ناز نخرے اٹھانے کے لیے بھی تیار ہے مگر مسلم لیگ سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کی روادار نہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ برطانوی حکومت تنہا اقتدار کانگرس کو دینے پر تو آمادہ تھی' تنہا مسلم لیگ کو ہرگز نہیں۔

ملک میں کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کو دو محاذوں پر جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بہرحال کمزور جماعت ہے اور مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں کم تعداد میں ہیں مگر قائداعظمؒ عزم وہمت کا پہاڑ بنے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ نے اس سازشی ماحول میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جو ولولہ اور جوش وخروش اس اجلاس میں دیکھنے میں آیا' وہ اپنی مثال آپ ہے۔ قائداعظمؒ نے اپنی سیاست کو اخلاقی اصولوں پر استوار کرنے اور چلانے کا جو نمونہ اس اجلاس میں پیش کیا' اس کی مثال سیاست اور سیاست دانوں میں شاید ہی ملے۔ قائداعظمؒ نے ایک طرف برطانوی حکومت کو للکارا۔ اس کی دھوکہ دہی، وعدہ خلافی اور چالبازی کا پردہ چاک کیا تو دوسری طرف کانگرس کی جھوٹی سیاست اور روایتی تنگ نظری کا بھی پول کھولا۔

اجلاس نے کیبنٹ مشن کی منظوری کا فیصلہ واپس لے لیا۔ تحریکِ پاکستان کو آگے بڑھانے کے لیے راست اقدام کا اعلان کر دیا۔ برطانوی خطابات واپس کر دیئے۔ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد پر قائداعظمؒ نے اجلاس میں بڑی طویل اور زوردار تقریر کی۔ وائسرائے سے گفتگو کا تجزیہ کیا اور کانگرس کی ہٹ دھرمی کا پوسٹ مارٹم۔ تقریر انگریزی میں تھی۔ قائداعظمؒ نے فردوسی کے مشہور شعر:

اگر صلح خواہی نہ خواہیم جنگ
وگر جنگ خواہی نہ دارم درنگ

کا حوالہ دیا اور اس کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ فیصلے پر اسی وقت عمل کرتے ہوئے اجلاس میں موجود خطاب یافتہ ارکان کو خطابات واپس کرنے کو کہا گیا۔ ملک فیروز خان نون جنہیں چار بار نائٹ ہڈ کا خطاب مل چکا تھا' نے خطابات واپس کر دیئے۔ آسام کے سابق وزیر اعظم سر محمد سعد اللہ' سندھ کے وزیر اعظم سر غلام حسین ہدایت اللہ اور نواب سر یا مین نے اجلاس میں بیٹھے ہی اپنے خطابات کی واپسی کا اعلان کر دیا۔

مسلم لیگ کے اس فیصلے نے قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کو بہت بلند مقام پر پہنچا دیا۔ بمبئی کا کانگرسی اخبار نفری پریس جرنل' جو مسلم لیگ اور قائد اعظمؒ پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا: ''کاش! کانگرسی لیڈر بھی اتنے با اصول اور جرأت مند ہوتے۔ اخبار نے مسلم لیگ کی طرف سے خطابات کی واپسی کے اقدام کا موازنہ کانگرس سے کیا اور کہا کہ کانگرس نے ایسی ہی اپیل کی تھی تو سوائے ایک دو کے کوئی شخص سامنے نہ آیا تھا۔

مسلم لیگ کے اس انقلاب آفریں اور تاریخ ساز فیصلے کے ساتھ ہی پورے برصغیر کے مسلمان آنے والے خطرات اور آئندہ جدوجہد کی تیاری کے بارے میں سوچنے لگے۔ راست اقدام کے لیے 16 اگست کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اسے ڈائریکٹ ایکشن ڈے کا نام دیا گیا۔

قتلِ عام کا منصوبہ

16 اگست کو ہندوؤں نے اپنی آخری چال چلی۔ ان کا خیال تھا کہ 16 اگست کو مسلمانوں کو نیچا دکھایا جائے تو ڈائریکٹ ایکشن اپنی موت آپ مر جائے گا اور اس طرح تحریکِ پاکستان کا نشان مٹ جائے گا۔ کانگرسی ہندوؤں اور مہا سبھائیوں نے مل کر کلکتہ میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنایا۔ 15-16 اگست کی درمیانی رات ہی مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے گئے۔ 16 اگست کو سینکڑوں زخمی مسلمان کلکتہ کے ہسپتالوں میں لائے گئے۔

مسلم لیگی رہنما حسین شہید سہروردی نے سارا منصوبہ بھانپ لیا۔ انہیں احساس تھا کہ 16 اگست کو مسلمانوں کے دب جانے کا نتیجہ نفسیاتی طور پر بہت خطرناک ہوگا۔ ان کی ہدایت پر 16 اگست کو ہی مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی۔ دشمن کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا کہ وہاں جو ہسپتال جو مسلمان زخمیوں سے بھرے ہوئے تھے، شام کو غیر مسلموں سے بھر گئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر کانگرس اور برطانوی حکومت کو یقین ہوگیا کہ مسلمان اب پاکستان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

کانگرس کی ضد

وائسرائے نے اپنی کونسل کی تشکیل کے سلسلے میں اپنی کوشش ابھی تک بند نہیں کی تھی۔ قائداعظمؒ نے اس کی آخری تجویز بھی مسترد کر دی تو وائسرائے نے مسلم لیگ کی پانچ نشستیں چھوڑ کر پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور مولانا آزاد سمیت کانگرسی ارکان کو حلف دلوادیا۔ اس کونسل کی تشکیل کے سلسلے میں مَیں بتا چکا ہوں کہ قائداعظمؒ کا موقف تھا کہ مسلمان نمائندے نامزد کرنے کا اختیار صرف مسلم لیگ کو ہے۔ وائسرائے کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کانگرس کو اپنا کوئی بھی ممبر نامزد کرنے کا اختیار رہے، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

پنڈت نہرو نے سر شفاعت احمد اور سید علی ظہیر کو بھی نامزد کیا۔ اس نامزدگی سے مسلمانوں میں اس قدر اشتعال پھیلا کہ اس رات شملہ میں سر شفاعت احمد کو ایک نوجوان مسلمان نے چھرا گھونپ دیا۔ وہ شدید زخمی ہوئے اور کچھ دن بعد ہسپتال میں چل بسے۔

مسلم لیگ کا جواب

یہ سارے واقعات کانگرس کی بے اصولی اور برطانوی حکومت کی کانگرس نوازی کو ظاہر کر رہے تھے۔ مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کا فیصلہ منسوخ ہونے پر کیا تھا۔ مسلم لیگ اب اس وعدے کی پابند نہیں رہی تھی۔ قائداعظمؒ نے وائسرائے سے وضاحت طلب کی کہ آیا وہ مسلم لیگ کے نامزد کردہ ہر رکن کو قبول کرلیں

گے؟وائسرائے نے ہامی بھر لی۔قائداعظمؒ نے کانگرس کی بددیانتی کومزید بے نقاب کرنے کے لیے مسلم لیگ کے کوٹے میں سے ایک بنگالی ہندومسٹر جوگندرناتھ منڈل کو وائسرائے کونسل کا رکن نامزد کیا۔

اس پر کانگرسی حلقے سخت پریشان ہوئے۔انہوں نے مسلم لیگ کوکڑی تنقید کانشانہ بنایا۔حقیقت یہ ہے کہ قائداعظمؒ نے جوگندرناتھ منڈل کونامزد کر کے دوشاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ایک یہ کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندگی سے باز نہ آرہی تھی۔قائداعظمؒ نے کانگرس کواس کی ضد کا جواب دیا۔دوسری طرف وہ اقلیتوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ مستقبل کے پاکستان میں انہیں بھی اعلیٰ ایوانوں میں رسائی اور نمائندگی کا حق حاصل ہوگا۔

لندن کانفرنس

قائداعظمؒ نے ان ہی دنوں ایک برطانوی اخبارنویس کوانٹرویو دیتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ وائسرائے سے مزید گفت وشنید بیکار ہوگی۔بہتر یہ ہوگا کہ خود برطانوی حکومت اس گتھی کوسلجھانے کے لیےلندن میں کانفرنس طلب کرے۔برطانوی حکومت کے جوکارندے ہندوستان میں موجود ہیں ان سے بات چیت کاقطعاً کوئی فائدہ نہیں۔

نومبر 1946ء میں برطانوی حکومت نے مسلم لیگ اور کانگرس کے لیڈروں کو برطانیہ آنے کی دعوت دی تا کہ کیبنٹ مشن کے اصل مقصد اورگروپنگ سکیم کی وضاحت کی جائے اورکانگرس کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا ازالہ کردیا جائے۔

یہاں خورشید ''تخلص'' کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔میں نے شاعری تو نہیں کی۔یہ تخلص تو پاسپورٹ والوں کی مہربانی ہے۔جب ہم کراچی سےلندن کے لیے روانگی کاپروگرام بنا رہے تھےتو وائسرائے نے ہمارے پاسپورٹ جاری کرنے کی ہدایت جاری کردی۔محمود ہارون نے کہا کہ میں تمہاراپاسپورٹ بنوالاتا ہوں۔پاسپورٹ والوں

نے نام پوچھاتو محمود ہارون نے خورشید حسن بتایا۔انہوں نے کہا ُسر نام محمود ہارون نے کہہ دیا خورشید تو یوں پاسپورٹ والوں نے خورشید حسن خورشید بنا دیا جواب تک چل رہا ہے۔

دسمبر 1946ء میں جو وفد گیا تھا'مسلم لیگ اور کانگرس کے ساتھ ہی وائسرائے اور سردار بلدیو سنگھ بھی مدعو تھے۔ گویا پورے ہندوستان کی نمائندگی تھی۔لندن میں ہندوستان کی حکومت یعنی وائسرائے لارڈ ویول' کانگرس یعنی پنڈت نہرو اور سکھ یعنی بلدیو سنگھ اور مسلم لیگ یعنی قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان۔اس وقت سوال یہ تھا کہ 1946ء میں جو فارمولا پیش ہوا تھا یعنی کیبنٹ مشن اسے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ نے پہلے منظور کیا تھا۔ کانگرس نے بھی قبول کیا لیکن کانگرس یہ سمجھتی تھی کہ مسلم لیگ اس فارمولے کو قبول نہیں کرے گی کیونکہ اس میں ایک پیراگراف میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہم پاکستان کا مطالبہ مسترد کرتے ہیں' اس لیے کانگرس کا خیال تھا کہ قائداعظمؒ غصے میں آ کر اس کو قبول نہیں کریں گے لیکن اس سکیم کے اندر ایسی گنجائش موجود تھی کہ جس میں یہ تھا کہ مسلمان صوبے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ ان کی گروپنگ ہو سکتی ہے مگر اختیارات کافی تھے۔قائداعظمؒ نے یہ دیکھ کر کہ اب فیصلہ کن مرحلہ آ چکا ہے' انہوں نے اس سکیم کو قبول کر لیا۔قائداعظمؒ کا اس کو قبول کرنا کانگرس کے لئے انتہائی غیر متوقع تھا بلکہ قائداعظمؒ نے اس وقت کہا بھی کہ آج میں نے اپنا پانسہ پھینک دیا ہے۔میں اپنی چال چل چکا ہوں۔اس منظوری کے بعد بجائے اس کے کہ کانگرس خوش ہوتی اور یہ محسوس کرتی کہ اب مسلم لیگ نے بھی متحدہ ہندوستان کا فارمولا مان لیا ہے' آپس میں دوستی کر لینا چاہیے' وہ الٹی ناراض ہو گئی اور کہنا شروع کیا کہ اس کے پیچھے کوئی چال ہے لہٰذا نہرو نے پہلے آسام کے وزیراعظم کو اکسایا۔اس نے کہا کہ میں اس سکیم کو نہیں مانتا۔اس کے بعد انہوں نے کچھ اور بیانات دلوانے شروع کر دیئے۔قائداعظمؒ نے کہا کہ پہلے یہ بات واضح کریں کہ کانگرس اس سکیم کو مانتی ہے یا نہیں۔ادھر سے کانگرس کی ہائی کمان اور مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ ہم اس سکیم کو مان لیتے ہیں۔بڑا اچھا ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ ختم ہو

گیا۔ اب ادھر دوسری طرف سے وہ اس فارمولے کو نہیں مانتے۔ وائسرائے نے کچھ گومگو کی پالیسی اختیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر 29 جولائی 1946ء کو مسلم لیگ نے اس سکیم کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس سکیم کو کانگرس اپنے انداز میں پیش کر رہی ہے۔ اگر کانگرس خوش نہیں تو ہم اس سکیم کو مسترد کرتے ہیں اور ہم اپنا پاکستان کا مطالبہ دوبارہ بحال کرتے ہیں۔ اس سے جو بحران پیدا ہوا' اس بحران کو ختم کرنے کے لئے برطانوی حکومت کی یہ آخری کوشش تھی کہ اس سکیم پر دونوں کو متحد کیا جائے۔ قائداعظمؒ کا یہ مطالبہ تھا کہ یہ بات طے ہونا چاہئے کہ صوبے گروپ میں شامل رہیں گے۔ دس برس بعد صوبوں کو اختیار ہوگا کہ اگر وہ اس گروپ سے باہر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں نہرو اور وزیراعظم آسام کا یہ موقف تھا کہ صوبوں کا شامل ہونا ضروری نہیں بلکہ صوبے اگر چاہیں تو پہلے دن ہی اپنے گروپ میں شامل نہ ہوں۔ اس میں یہ تھا کہ شرقی صوبہ کا جو گروپ تھا جسے سی گروپ کہتے ہیں جس میں بنگال اور آسام تھے' آسام میں ہندوؤں کی اکثریت تھی' اس وجہ سے کانگرس یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ آسام کا پورا صوبہ پاکستان میں چلا جائے یعنی پاکستان کے گروپ سی میں چلا جائے۔ اس اختلاف کو حل کرنے کیلئے برطانیہ میں کانفرنس بلائی گئی اور اس کانفرنس میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کرپس' لارڈ لارنس اور ایٹلی نے صاف طور پر نہرو کو بتا دیا کہ آپ جو بات کر رہے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس سکیم کو مسترد کر رہے ہیں اور اگر یہ ہوا تو ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ ہم کوئی دوسرا راستہ سوچیں۔ اس وقت دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اس وقت جو وزیر ہند تھے جنہیں سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کہا جاتا تھا' اس کے ساتھ ایک ڈنر پارٹی میں ہماری ملاقات ہوئی تو لیاقت علی خان نے یہ نکتہ اٹھایا اور نہایت ہی اہم نکتہ تھا۔ اس وقت سر انتھونی ایڈن جو سابق وزیر خارجہ اور ڈپٹی لیڈر آف اپوزیشن تھے اور میں بھی موجود تھا' مختصر سی پارٹی تھی۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ قائداعظمؒ کہتے ہیں کہ جب آپ نے

ہندوستان چھوڑنا ہی ہے تو آپ کو کیا فرق پڑتا ہے کہ ایک حکومت بنتی ہے یا دو بنتی ہیں یا تین بنتی ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خوش کریں اور اختیار جو ہے وہ کچھ پاکستان کے حوالے کریں اور کچھ ہندوستان کے حوالے کریں اور آپ خوش اسلوبی سے ہندوستان سے نکل جائیں۔ بہرحال بات یہ ہے کہ سکیم طے نہیں ہوئی تھی۔

یکم دسمبر کو برطانوی فوج کے چار انجنوں والے پارک ہوائی جہاز میں قائداعظمؒ، نوابزادہ لیاقت علی خان، پنڈت نہرو، سردار بلدیو سنگھ اور لارڈ ویول کراچی سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ لیاقت علی خان کے سیکرٹری ممتاز حسن، پنڈت نہرو کے سیکرٹری مسٹر متھائی، وائسرائے کے ملٹری سیکرٹری کرنل میکنزی، سیکرٹری سرجارج ایبل اور میں اسی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔

اس زمانے کے جہاز آج کل کی طرح پریشرائز نہیں ہوتے تھے نہ ہی ان میں ساؤنڈ کنٹرول سسٹم ہوتا تھا۔ جہاز میں انجن کا اس قدر شور ہوتا کہ بات چیت کرنا خاصا مشکل تھا۔ مسافروں کو شور سے بچانے کے لیے جہاز کا عملہ کانوں میں ٹھونسنے کے لیے روئی فراہم کرتا۔ جہاز میں کوئی مائیکروفون سسٹم بھی نہیں تھا۔ راستے میں کوئی تاریخی یا اہم مقام آتا تو پائلٹ ایک چٹ پر اس کے متعلق لکھ دیتا۔ عملے کا کوئی آدمی سارے مسافروں کو باری باری وہ چٹ دکھاتا۔ ہر تین چار گھنٹے کے بعد پائلٹ ایک چٹ پر جہاز کی رفتار، آنے والے ایئر پورٹ پر اترنے کا اندازاً وقت وغیرہ لکھ کر اسی طرح ہر مسافر کو پڑھنے کے لیے بھیجتا۔ ظاہر ہے ان حالات میں جہاز میں تمام فریقوں کی موجودگی کے باوجود کوئی گفتگو نہ ہوسکی۔

قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ قائداعظمؒ بیشتر وقت اخبار پڑھتے رہے۔ پنڈت نہرو پہلے اخبار پڑھتے رہے پھر ایک کتاب نکال لی۔ اس کے مطالعے میں مصروف رہے۔ وائسرائے اور ان کا سٹاف بھی خاموش رہا۔ البتہ بلدیو سنگھ صاحب نے اپنے ساتھیوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی جو زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوسکی۔

بصرہ اور قاہرہ میں رکتے ہوئے لندن کی طرف روانہ ہوئے تو ہوائی جہاز کے چار میں سے ایک انجن خراب ہوگیا۔ پائلٹ کو جزیرہ مالٹا کے لوکا ائیرپورٹ پر اترنا پڑا۔ پہلے تو خیال تھا کہ شام تک اور جہاز آجائے گا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ جہاز کی آمد میں تاخیر ہے۔ ہمیں گورنر کے مہمان کی حیثیت میں گورنر کے محل میں پہنچا دیا گیا۔ رات وہاں بسر کی۔ ادھر لندن میں کانفرنس چوبیس گھنٹے دیر سے شروع ہونے کا اعلان ہوگیا۔

مجھے پہلا کمرہ ملا۔ اس میں فرش نہیں تھا۔ کھڑکیوں میں پردے نہیں تھے، نہ ہی کوئی خاص فرنیچر تھا۔ بس ایک چارپائی، ایک کرسی اور چھوٹی سی میز۔ کمرے میں دو تین الماریاں تھیں۔ گورنر کے اے ڈی سی نے بتایا کہ جنگ کے زمانے میں یہ کمرہ وزیر اعظم چرچل کے لیے مخصوص تھا۔ یہ سن کر میں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ سوائے اس کے کہ یہ محل کے ایک ونگ کے آخری سرے پر تھا جس کی دونوں طرف کی کھڑکیوں سے سامنے باغ پر نظر پڑتی تھی اور روشن کمرہ تھا۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ میں نے ان الماریوں کا جائزہ لیا کہ شائد چرچل کی کوئی نشانی مل جائے۔ ایک الماری کے اوپر کے خانے میں ایک چھوٹی سی کتاب گرد میں دبی ہوئی پڑی تھی۔ یہ لینن کی زندگی کے متعلق تھی۔

میرے ساتھ والے کمرے میں پنڈت نہرو تھے۔ وہ جہاز میں سردی لگنے کی شکایت کر رہے تھے۔ اس لیے دوپہر کو سوئے رہے۔ 4 بجے کے قریب مجھے محل کے ایک بیرے نے بنی ہوئی چائے کی پیالی پیش کی۔ گورنر کے محل میں اور گورنر بھی جو انگریز ہوں اور چائے کے شوقین ہوں، یہ طریقہ کار کچھ غیر متوقع سا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ پنڈت نہرو میرے کمرے میں تشریف لائے۔ چائے کی پیالی پر نظر پڑی تو کہنے لگے ''بھئی یہاں چائے ایسے ہی دیتے ہیں؟ ''میں نے کہا ''جی ہاں۔ مجھے تو ایسے ہی دے گئے ہیں''۔ میں نے ان کے لیے بھی چائے کا بندوبست کر دیا کیونکہ ان کا سیکرٹری مسٹر متھائی اس وقت غائب تھا۔ ان متھائی صاحب کی بھی سن لیجئے۔ یہ حضرت آج کل پنڈت نہرو کے خلاف

مضامین لکھ رہے ہیں۔ نہرو کے کردار اور سیاست پر خوب کیچڑ اچھالتے ہیں۔ ذکر چائے کا ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ دورانِ جنگ چائے، دودھ اور ملازموں کی کمی کی وجہ سے اس طرح کی چائے کا طریقہ رائج کیا گیا تھا جو بچت کی خاطر اب تک جاری تھا۔

قائداعظمؒ نے دوپہر اور سہ پہر کو بھی اپنے کمرے میں آرام کیا۔ رات کو کھانے کی میز پر سب جمع ہوئے۔ یہاں بھی گفتگو محدود ہی رہی کیونکہ لندن روانہ ہونا تھا۔ اس لیے یہ نشست طویل نہ ہوسکی۔

دوسرے دن ہم لندن پہنچے۔ طیارہ لندن ائیرپورٹ پر نچلی پرواز کر رہا تھا کہ ہم نے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے سنے۔ وائسرائے کے سیکرٹری سرابیل نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "سن لیں۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے سنئیے"۔ دراصل لندن ائیرپورٹ پر مسلمان بڑی تعداد میں قائداعظمؒ کا استقبال کرنے آئے ہوئے تھے۔ ائیرپورٹ سے ہمیں ہوٹلوں میں پہنچا دیا گیا۔ قائداعظمؒ، لیاقت علی خان، ممتاز حسن اور میں ہوٹل کلیرج میں ٹھہرے۔ پنڈت نہرو، ہوٹل ڈارچیسٹر میں۔ قائداعظمؒ کو ہوٹل رائل سویٹ میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل کے ایک اہلکار نے مجھے بتایا کہ دورانِ جنگ ان ہی کمروں میں ناروے، یونان اور یوگوسلاویہ کے بادشاہ ٹھہرے تھے۔

باردولائی کا قصہ

لندن کانفرنس میں اہم موضوع بحث کیبنٹ مشن پلان کا گروپنگ کے متعلق حصہ تھا۔ اس میں تجویز کیا گیا تھا کہ کوئی بھی صوبہ 10 برس کے بعد گروپ کو چھوڑ سکتا ہے۔ کانگرس اس فارمولے کو اپنی شکست سمجھتی تھی کیونکہ اس کے تحت پورا صوبہ بنگال اور پورا صوبہ آسام گروپ 'سی' میں آئے تھے۔ اگر چہ گروپ 'سی' میں آسام کا معاملہ یوں تھا کہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر آسام اور بنگال کو ملا کر مجموعی طور پر اس گروپ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔

کانگرس اکھنڈ بھارت اور ہندوستان کی وحدت کی علمبر دار تھی۔ خود کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا نمائندہ بھی قرار دیتی لیکن اس بات پر تیار نہ تھی کہ متحدہ ہندوستان کے گروپ 'سی' میں ہندو اکثریت کا ایک صوبہ (آسام) مسلم اکثریت والے بڑے صوبے بنگال کے ساتھ شامل رہے۔ کانگرس کو مسلمانوں سے توقع تھی کہ وہ ہندوستانی قومیت اور ہندوستان کے ایکے کی خاطر مسلم اکثریت کے پانچوں صوبوں کو مرکز کی ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں گے۔ کانگرس کی تنگ نظری ایک بار پھر رنگ دکھا رہی تھی۔

آسام کو 'سی' گروپ سے نکالنے کے لیے پنڈت نہرو اور ان کے ساتھیوں نے اس وقت کے وزیر اعظم آسام مسٹر گوپی ناتھ باردولائی کو اکسایا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ آسام 'سی' گروپ میں شامل نہیں ہوگا۔ پنڈت نہرو کیبنٹ مشن پلان کو تسلیم کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس سارے منصوبے کی جان گروپنگ سکیم تھی کیونکہ یہی ایک سکیم تھی جو مسلمانوں کے لیے پاکستان سے کم تاہم قبول ہوسکتی تھی۔ پھر یہ کہ پنڈت نہرو وائسرائے سے گفتگو کے دوران اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ گروپنگ سکیم کے تحت صوبے ابتدائی طور پر دس برس کے لیے اپنے گروپ میں رہیں گے۔ بعد میں الگ ہوسکیں گے۔ اس سب کچھ کے باوجود انہوں نے باردولائی کو اکسایا کہ وہ ہر لحاظ سے غلط موقف کا اعلان کر دے۔ ادھر کانگرس ہائی کمان نے بھی اس کی تائید شروع کر دی۔ بہت ہی اہم اور پرخطر موڑ تھا۔

باردولائی اور کانگرس ہائی کمان کے اس موقف کو مان لیا جاتا تو گروپنگ سکیم ہی نہیں، پورے کیبنٹ مشن پلان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ آسام کو یہ حق مل جاتا تو کوئی بھی صوبہ مطالبہ کرسکتا تھا۔ اس وقت کانگرس کو خیال تھا کہ سرحد بھی یہی مطالبہ کرے گا کیونکہ وہاں عبدالجبار خان (ڈاکٹر خان صاحب) کی سرکردگی میں کانگریسی حکومت تھی۔ مسلم لیگ نے اس پر سخت موقف اختیار کر لیا اور اسی نقطے کی وضاحت سے لندن کانفرنس کا عمل شروع ہوا۔

برطانیہ کو احساس ہو گیا

دسمبر سے پہلے کے واقعات خصوصاً مسلمانوں کا خطابات واپس کرنا، ڈائریکٹ ایکشن ڈے پر کلکتہ کے فسادات اور سر شفاعت احمد خان پر قاتلانہ حملے نے برطانوی عوام اور حکومت کو مسلمانوں کے جذبات اور موڈ سے اچھی طرح واقف کر دیا تھا۔ برطانیہ کو یقین تھا کہ الفاظ کی ہیر اپھیری سے مسلمان مطمئن نہیں ہوں گے اور جب تک مسلمان مطمئن نہ ہوں گے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ برطانیہ کا وقار بڑھے گا نہیں' گھٹے گا۔

اس دوران کانگرس نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ایک انتہائی خطرناک قدم اٹھایا۔ پنڈت نہرو نے یکطرفہ طور پر 9 دسمبر کو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا۔ قائداعظمؒ کے 1946ء کے اہم فیصلہ کن اور جرأت مندانہ فیصلوں میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے اسمبلی کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ تمام مسلمان اراکین اسمبلی کو ہدایت کر دی گئی کہ آئین ساز اسمبلی میں شریک نہ ہوں۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں برطانوی حکومت لفاظی اور آئینی موشگافی کا سہارا لے کر کانگرس کے مطالبہ کی تائید نہ کر دے۔ ایسے میں مسلمانوں کو اپنی علیحدہ آئین ساز اسمبلی بلانا پڑتی یا مجبوراً ہندو آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونا پڑتا مگر قائداعظمؒ نے سر سٹیفورڈ کرپس کی سیاسی بددیانتی کو جس سختی سے بے نقاب کیا تھا اس کے بعد انگریز مدبّروں کو اس کی جرأت نہ ہوئی۔ سر کرپس نے لندن میں قائداعظمؒ سے ہوٹل میں ملاقات کی اور اپنے رویے کی وضاحت کی۔

لندن کانفرنس کے خاتمے پر جو اعلان کیا گیا' وہ بالکل واضح تھا۔ اس میں صاف طور پر کہا گیا کہ گروپنگ سکیم کا منشا ہرگز یہ نہیں کہ کسی گروپ کا کوئی صوبہ شروع میں ہی گروپ میں شامل ہونے سے انکار کر دے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ابتدائی گروپنگ دونوں فریقوں نے قبول کی ہے' اس کی پابندی لازمی ہوگی۔

ایک نیا رجحان

پنڈت نہرو اس مسئلے پر غیر سنجیدہ ہو گئے یا جذباتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہرو کو یقین ہو گیا تھا کہ انگریز جا رہے ہیں۔ اقتدار کانگرس کو ملنے والا ہے۔ وہ اپنے خوابوں کے بھارت کی تصویر سامنے رکھ کر اس زمانے کے حالات و مسائل اور واقعات کی رفتار سے بے پروا ہو گئے تھے۔ وہ تھوڑی فراخدلی اور کنٹرول کا مظاہرہ کرتے تو گروپنگ سکیم کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر مفاہمت ہو سکتی تھی اور اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

کچھ کانگرسی رہنماؤں کا شروع سے خیال تھا کہ پاکستان قائم نہیں رہ سکتا۔ اقتصادی لحاظ سے اس کا وجود ناممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال بھی نہرو کے لاشعور میں موجود ہو۔ اس لیے وہ اندھا دھند اپنی انا کی تسکین کے راستے پر چل نکلے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں آبرومندانہ سمجھوتے اور اس کی آئینی شکل کا آخری موقع ضائع کر دیا۔

آزادی کے اتنے سال گزرنے کے بعد اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بھارت میں بھی بعض حقیقت پسند، غیر متعصب سیاسی مبصروں اور مؤرخوں نے تحریکِ آزادی کے اس اہم گوشے کا ازسرِ نو جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا ہے کہ پنڈت نہرو کو تقسیم ہند کی ذمہ داری سے مبرّا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

'ٹائمز آف انڈیا' کے ایڈیٹر خشونت سنگھ قائداعظمؒ کے صد سالہ یومِ پیدائش کی تقریبات میں شرکت کے لیے اسلام آباد کی بین الاقوامی کانگرس میں آئے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کہا ''آج بھارت میں قائداعظمؒ کے بارے میں نیا اندازِ فکر جنم لے رہا ہے۔ ہندوستان کے بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ قائداعظمؒ کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ قائداعظمؒ کو صحیح نہیں سمجھا گیا اور یہ بھی کہ قائداعظمؒ کے کردار اور آزادی کی تحریک میں ان کی سیاسی زندگی کا مطالعہ ازسرِ نو نئے زاویوں سے کرنا پڑے گا''۔

اس قیام کے دوران قائداعظمؒ نے برطانیہ مسلم لیگ کے سلسلے میں مقامی نمائندوں کو ہدایات دیں۔لندن میں مسلم لیگ کا ایک پبلسٹی آفس کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین صاحب کانفرنس کے دوران بطور خاص لندن پہنچے تھے۔ قائداعظمؒ نے انہیں یہ ذمہ داری سونپی کہ یہ دفتر قائم کریں۔ الطاف صاحب دفتر قائم کرنے کے بعد ہندوستان پلٹ آئے۔

مصر کا دورہ

لندن سے واپسی پر مصر کے شاہ فاروق کی دعوت پر 16 سے 19 دسمبر تک قائداعظمؒ قاہرہ میں مصری حکومت کے مہمان رہے۔ اس دوران مصر کے مختلف رہنماؤں کے علاوہ یمن کی تحریکِ آزادی کے لیڈروں، فلسطین کے عظیم مسلم رہنما الحاج مفتی امین الحسینی اور اخوان المسلمین کے رہنما سید حسن البنا سے ملاقاتیں کیں۔

مصر کی سیاسی تحریکیں کانگرس کی تحریکِ آزادی سے بہت متاثر تھیں۔کانگرس کی ہندوستان چھوڑدو تحریک نے مصر کے حریت پسند اور برطانیہ دشمن عناصر کو بڑی حد تک اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔مصر کی سب سے بڑی سیاسی جماعت وفد پارٹی کے قائد مصطفیٰ نحاس پاشا کانگرس سے بے حد متاثر تھے۔انہوں نے کانگرس کے ایک دوسالانہ اجلاسوں میں مبصرین کی حیثیت سے اپنے نمائندے بھی بھیجے تھے۔کانگرسی پراپیگنڈہ کی وجہ سے مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کو متعصب اور تنگ نظر مسلمانوں یا انگریزوں کے ایجنٹوں کی تحریک کے حوالے سے یاد کیا جاتا تھا۔

قائداعظمؒ کے دورے کا یہ اثر ہوا کہ برصغیر کے متعلق ٹھوس حقائق پہلی بار مصری عوام تک پہنچے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے جب مصری اخبار نویسوں کو بتایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد 10 کروڑ ہے تو وہ یقین نہیں کرتے تھے۔جب انہیں وضاحت سے بتایا گیا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے صوبے مصر کے برابر رقبے پر مشتمل ہوں گے تو تب

انہیں مطالبۂ پاکستان کی واقعاتی نوعیت سے آگاہی ہوئی۔

کانگرس کے پس منظر اور ہندو مسلم اختلافات کی مفصل وضاحت سے ماحول میں تبدیلی آ گئی۔ مصطفیٰ نحاس پاشا اور میڈم نحاس پاشا نے قائداعظمؒ کو اپنے ہاں دعوت دی۔ اس تقریب میں وفد پارٹی کے ممتاز رہنما احمد حمزہ پاشا اور مصطفیٰ اغنام بے بھی موجود تھے۔ اس طرح قائداعظمؒ نے اس وقت کے وزیراعظم نقراشی پاشا اور وہوکی آبازہ پاشا ایسے رہنماؤں سے تفصیلی ملاقاتیں کیں جن کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ کانگرسی پروپیگنڈے کے بادل چھٹ گئے۔ سیاست دانوں کے حلقے سے ہٹ کر قائداعظمؒ نے بطور خاص جامع الازہر کے شیخ مصطفیٰ المراغی سے بھی ملاقات کی۔

ان دنوں کے ایک واقعہ کی تصویر آج بھی آنکھوں میں گھوم رہی ہے۔ الفاظ کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ ایک شام قائداعظمؒ، لیاقت علی خان، ممتاز حسن اور میں ہوٹل شیفرڈ میں قائداعظمؒ کے کمرے کے سامنے لان میں بیٹھے تو ممتاز حسن نے قائداعظمؒ سے پوچھا پاکستان کے آئین کا کیا ہوگا؟ قائداعظمؒ نے فرمایا مجھے اس کے بارے میں کوئی فکر نہیں کیونکہ ہمارے پاس قرآن حکیم موجود ہے۔ اس کے اصولوں سے ہم رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ 31 دسمبر 1946ء کو قائداعظمؒ کراچی واپس پہنچ گئے۔

سب کی آزادی کی حمایت

سفر کی تکان کی وجہ سے واپسی پر قائداعظمؒ کی طبیعت کچھ ناساز رہی۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر چند روز کراچی میں آرام کیا اور پھر سمندری جہاز 'امورا' کے ذریعے بمبئی روانہ ہوئے۔

قیامِ کراچی کے دوران برما کی Anti-Fascist People's کے قائد اور برما کی تحریکِ آزادی Freedom League کے سب سے بڑے رہنما نے کراچی میں قائداعظمؒ سے ملاقات کی جو برطانوی حکومت کے ساتھ گفت وشنید کے لیے برطانیہ جا رہے تھے۔

قائداعظمؒ نے 'اوآ نگ سان' کو مشورہ دیا کہ مکمل خودمختاری سے کم کسی قیمت پر ہرگز راضی نہ ہوں۔ دراصل اس زمانے میں برطانوی مدبرین کی کوشش یہی تھی کہ جن ممالک کو آزاد ہونے سے نہیں روکا جاسکتا، انہیں کسی نہ کسی طریقے سے دولت مشترکہ میں ایک ڈومینین کی حیثیت سے ہی رکھا جائے تاکہ برطانیہ کی بظاہر عملداری رہے۔

برما کے سیاست دانوں میں بھی ایسے گروپ موجود تھے جو برطانوی راج کے تحت ڈومینین سٹیٹس قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ اوآ نگ سان کی مشکل یہ تھی کہ ان کی اپنی پارٹی ایک قسم کا قومی اتحاد تھی جس میں دس بارہ جماعتیں شامل تھیں۔ ان کے نظریات میں کافی اختلاف تھا۔ قائداعظمؒ کی ماہرانہ اور مدبرانہ نصیحت نے اوآ نگ سان کی بڑی ہمت بندھائی۔ انہوں نے قائداعظمؒ سے وعدہ کیا کہ وہ لندن میں یہی پالیسی اختیار کریں گے۔ برطانوی حکومت بالآخر اوآ نگ سان کا مطالبہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ باہمی رضامندی سے برما کو مکمل خودمختاری دینے کا فیصلہ ہوگیا۔ یہ بات اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ نہرو کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی' ان کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ بین الاقوامی مسائل میں ان کی نظر اتنی ہی گہری ہوتی تھی جتنی ہندوستان کے مسائل پر۔ اس کے برعکس قائداعظمؒ جس انداز سے بین الاقوامی امور دیکھتے، محسوس کرتے، سوچتے' اس کی تشہیر نہیں ہوتی تھی' نہ ہی قائداعظمؒ نے کبھی خود کو بین الاقوامی شخصیت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ثبوت میں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً جب پنڈت نہرو چین میں چیانگ کائی شیک سے دوستی کے راگ الاپ رہے تھے تو قائداعظمؒ نے اس وقت واضح کر دیا تھا کہ چیانگ کائی شیک کو نہ صرف برصغیر کے حالات کے بارے میں واقفیت نہیں بلکہ چین پر بھی مکمل کنٹرول نہیں۔ صرف چار پانچ سال میں چیانگ کائی شیک کی قلعی کھل گئی۔

اسی طرح قائداعظمؒ نے ویت نام کے عوام کی جدوجہدِ آزادی اور فرانسیسی

سامراج کے خلاف ان کی بغاوت میں سب سے زیادہ امداد کی حالانکہ اس وقت مشرق بعید کے اس غیر مانوس علاقے کی طرف برصغیر کے کسی اور سیاسی رہنما کی نظر اور توجہ نہیں تھی۔ فلسطین کے مسئلے میں قائداعظمؒ نے اعلانِ بالفور سے قیامِ پاکستان تک جس پُرزور انداز میں برطانوی حکومت کے عزائم بے نقاب کیے اور فلسطینیوں کی آزادی کی حمایت کی' شاید ہی کسی دوسرے سیاسی رہنما نے کی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جذباتی لحاظ سے مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں عربوں کے ساتھ تھیں مگر برطانوی حکومت کو مجبور کر کے اس سے فلسطین کے بارے میں آزادی کا اعلان کرانا قائداعظمؒ کا ہی کام تھا۔

مغربی افریقہ میں فرانسیسیوں نے سینی گالی سپاہیوں کی مدد سے افریقی مسلمانوں کی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی تو اس وقت بھی برصغیر سے اس ظلم کے خلاف قائداعظمؒ کی آواز بلند ہوئی۔

جونا گڑھ الحاق کا راز

کراچی سے بمبئی جاتے ہوئے جہاز کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ منگرول کے باہر لنگر انداز ہوا۔ قائداعظمؒ ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر شیخ صاحب آف منگرول سے ملنے گئے۔ منگرول جونا گڑھ کے ساتھ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ شیخ صاحب نے قائداعظمؒ کو ملاقات کی دعوت دی تھی۔ ملاقات بڑی مختصر تھی مگر جونا گڑھ اور منگرول ریاستوں کا الحاق غالباً اسی ملاقات کا نتیجہ تھا۔

ماؤنٹ بیٹن آ گیا

برطانوی حکومت نے 20 جنوری کو واضح طور پر برصغیر میں انتقال اقتدار کے فیصلے کا اعلان کیا۔ اس امر کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ اگر اقتدار ایک مرکزی حکومت کو نہیں سونپا جا سکتا تو پھر ایک سے زائد حکومتوں کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے۔ برطانوی حکومت اب اپنے کسی اعلان میں کوئی لگی لپٹی رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد لارڈ ویول کو

واپس بلانے کا فیصلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس ذمہ داری کے ساتھ بھیجا گیا کہ انتقالِ اقتدار کے لیے منصوبہ بنا کر اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ عجیب اتفاق ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن 23 مارچ کو کراچی پہنچا۔ مسلم لیگ اس دن 'یومِ پاکستان' منارہی تھی۔

ویول کیوں گئے

کانگرسی طبقوں نے تاثر دیا کہ لارڈ ویول کو کانگرس کے اصرار پر واپس بلایا جارہا ہے۔ یہ محض نفسیاتی جنگ کا ایک حصہ تھا۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لارڈ ویول نے وزیراعظم چرچل کے خصوصی اصرار پر وائسرائے ہند بننا قبول کیا تھا۔ چرچل حکومت کے ختم ہوتے ہی یہ توقع کی جارہی تھی کہ ہندوستان کا وائسرائے کسی بھی لمحے تبدیل ہوسکتا ہے۔ لارڈ ویول ایک سادہ، صاف گو اور انسانی ہمدردی رکھنے والے سپاہی تھے۔ میں ذاتی طور پر ویول کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں۔ ان کا لباس سادہ ہوتا تھا۔ گفتگو میں حلیمی اور لہجے میں نرمی تھی۔ ہم لندن جاتے ہوئے دوپہر کے کھانے کے لیے بصرہ میں اترے تھے تو مجھے لارڈ ویول سے چند منٹ گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرا تعلق کشمیر سے ہے تو میں نے انہیں کشمیر کے عام حالات کے بارے میں معلومات دیں۔ اس دوران انہوں نے اپنی لاعلمیت کو چھپانے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ کشمیر میں کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ اس پر انہیں بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے صاف صاف اقرار کیا کہ وہ اس بات سے لاعلم تھے حالانکہ میرا خیال تھا کہ وائسرائے ہند کو برصغیر کی ایک بڑی ریاست کے بارے میں اتنا ناواقف نہیں ہونا چاہیے تھا۔

سادگی اور صاف گوئی کے علاوہ ویول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کسی سے غیر ضروری رعایت نہ برتتے۔ کانگرس کے حلقوں میں ہوسکتا ہے پٹیل اور نہرو انہیں ذاتی طور پر ناپسند کرتے ہوں کیونکہ ویول کانگرسی لیڈروں میں سے مولانا آزاد کا بہت احترام کرتے تھے۔ پنڈت نہرو نے خود کو ہندوستان کا وزیراعظم سمجھنا شروع کردیا تھا۔

جب کہ درحقیقت نہ تو وزیر اعظم کا کوئی عہدہ موجود تھا اور نہ ہی کابینہ کا تصور، اس لیے عارضی حکومت میں اکثر اختلافات پیدا ہوتے جس کا آخری فیصلہ وائسرائے کو کرنا پڑتا۔ نہرو کو یہ بات ناگوار گزرتی۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ویول کی واپسی کی اصل وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت نے جب ان سے انتقال اقتدار کے متعلق استفسار کیا تو ویول کا اصرار تھا کہ انتقال اقتدار مختلف مراحل میں ہونا چاہیے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ جلد بازی کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑیں گے اور ان کی اطلاعات کے مطابق فریقین نے وسیع پیمانے پر تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک سپاہی کی حیثیت سے ان کے نزدیک انسانی جان بہت قیمتی ہے۔ اس لیے انہیں کم از کم دو سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ برطانوی حکومت بعض وجوہات کی بنا پر اس معاملے میں جلد بازی کرنا چاہتی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن کی خوفناک سازش

اس جلد بازی کی کیا وجہ تھی؟ میں نے اس پر بہت غور کیا اور صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچ سکا ہوں کہ برطانیہ کی سوشلسٹ حکومت جلد بازی میں اقتدار منتقل کر کے یہ سمجھتی تھی کہ اس افراتفری میں پاکستان کو استحکام نصیب نہیں ہوگا اور نوزائیدہ ملک چھ سات ماہ کے اندر ختم ہو جائے گا۔

ظاہر ہے ایک ذمہ دار وائسرائے کی قطعی اور حتمی رائے نیز برطانیہ کے اندر کنزرویٹو پارٹی کی مخالفت کے باوجود جلدی میں انتقال اقتدار کوئی بے معنی تو نہیں تھا۔ جلد بازی میں انتقال اقتدار کی کوئی معقول دلیل اور وجہ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے بھی پیش نہ کی گئی۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن کے کئی اقدامات نے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ نوزائیدہ مملکت کو قیام کے ساتھ ہی مسائل میں الجھا کر ختم کر دینے کے منصوبے تھے۔ ہندو ماہرین اقتصادیات کافی عرصے سے پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک

کی حیثیت سے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلے میں کانگرس نے ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ کمیٹی کے رکن دو ماہرینِ اقتصادیات ڈاکٹر سر جان متھائی اور سر سومی پی موڈی نے کانگرس کمیٹی کی رائے سے اختلاف کیا اور یہ واضح کر دیا کہ پاکستان ایک علیحدہ مملکت کی حیثیت میں اقتصادی لحاظ سے مضبوط بنیادوں پر قائم رہ سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہندو پراپیگنڈے کی آندھی تھمنے میں نہ آتی تھی۔ لگتا ہے ماؤنٹ بیٹن پر بھی اس کا خاصا اثر تھا کہ اس نے ہر وہ اقدام کیا جس سے پاکستان کی مشکلات میں اضافہ ہو۔

پاکستان کی حکومت قائم ہوئی تو عارضی طور پر کراچی کو دارالحکومت منتخب کیا گیا۔ حکومتِ سندھ نے بیرک نما عمارتیں تعمیر کروا کے مرکزی حکومت کے دفاتر کے لیے جگہ فراہم کی۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ سردار عبدالرب نشتر جو مواصلات کے وزیر تھے، پہلے روز اپنے دفتر میں گئے تو ان کے پی اے کے کمرے میں کرسی نہیں تھی۔ اکثر دفتروں میں ٹائپ رائٹر نہیں تھے۔

اس وقت تک بیشتر ہندوستانی فوجی جنگ عظیم کے سلسلے میں برصغیر سے باہر تھے۔ کلکتہ، دہلی وغیرہ میں کروڑوں روپیہ کا وہ فوجی سامان پڑا ہوا تھا جو غیر ملکی خصوصاً امریکن فوجیں چھوڑ گئی تھیں۔ اس کی تقسیم میں جان بوجھ کر تاخیر کی گئی۔ نتیجہ یہ کہ پاکستان کو نہ تو حصے کے پورے سپاہی ملے نہ اسلحہ اور فوجی سامان۔ لارڈ ویول کی تجویز مان لینے کی صورت میں ہندوستانی فوجیں بیرون ملک سے واپس آجاتیں اور جنگ کے زمانے میں جمع شدہ فوجی سامان کی تسلی بخش تقسیم بھی عمل میں آجاتی۔

ماؤنٹ بیٹن نے ایک اور قابلِ مذمت حرکت یہ کی کہ دیدہ ودانستہ آزاد ہند فوج کے نام نہاد جرنیل موہن سنگھ کو کھلی چھٹی دے دی۔ اول تو یہ کہ نام نہاد آزاد فوج سرے سے ہی خلافِ قانون تھی اور بار بار توجہ دلانے کے باوجود بھی ماؤنٹ بیٹن نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ دوم یہ کہ اس فوج میں آزاد ہند فوج کے کچھ خودساختہ جرنیلوں کے علاوہ

ریاست پٹیالہ، نابھہ، جیند اور فرید کوٹ کی سکھ افواج کے سپاہی اسلحہ سمیت شامل تھے۔

ماؤنٹ بیٹن چاہتا تو ان سکھ ریاستوں کے سکھ حکمرانوں کو خون کی ہولی کھیلنے سے باز رکھ سکتا تھا۔ لیاقت علی خان نے وزارتی کونسل میں یہ مسئلہ بڑی شدت سے اٹھایا۔ ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ کیا کہ نہ صرف اس فوج کے خلاف کارروائی ہوگی بلکہ تارا سنگھ کو گرفتار کیا جائے گا۔ تاہم کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ تارا سنگھ نے 4 اپریل 1947ء کو لاہور میں پنجاب اسمبلی کے سامنے اپنی کرپان میان سے نکال کر پاکستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ تارا سنگھ اپنے ہتھیار بند اکالی سکھوں کے ہمراہ جنرل موہن سنگھ کی فوج کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ پورے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

بھارتی حکومت اخلاقی اور قانونی طور پر بٹوارے کے اصول کے مطابق پاکستان کے حصے میں آنے والے 55 کروڑ روپے پاکستان کو دینے کی پابند تھی لیکن اس نے پاکستان کو مفلوج کرنے کے لیے ادائیگی روک دی۔ کم ازکم اس ضمن میں کا رویہ قابلِ تعریف تھا۔ انہوں نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دے کر نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کو ادائیگی پر مجبور کر دیا۔

ماؤنٹ بیٹن کا سب سے زیادہ ہولناک اور خونی وار ریڈکلف ایوارڈ کی صورت میں سامنے آیا۔ بدنیتی کے ساتھ سرحدوں میں تبدیلی کر دی گئی۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں ہیجان اور اضطراب پیدا کرنا، پاکستان کے خلاف جذبات کو ابھارنا اور سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ کشمیر کے مسئلے کو ایسا رنگ دے دیا گیا کہ بھارت کو کشمیر تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ ان اقدامات اور جلد بازی میں انتقالِ اقتدار سے ماؤنٹ بیٹن جلد از جلد اپنی خواہش (پاکستان کا خاتمہ) پوری ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔

لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ اگر لارڈ ویول کا منصوبہ مان لیا جاتا اور انتقالِ اقتدار 1947ء کی بجائے 1949ء میں عمل میں آتا تو قائداعظمؒ اس وقت دنیا میں موجود نہ

ہوتے تو پھر نہ جانے کیا نقشہ ہوتا۔

ماؤنٹ بیٹن کے اقدامات سے پاکستان کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ پنجاب میں فیروز پور اور گورداسپور کے علاقے پاکستان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ کشمیر کے مسئلے میں بھارت کو تقویت ملی کیونکہ اسے گورداسپور سے کشمیر کا زمینی راستہ اور رابطہ میسر آگیا۔ نا انصافیوں، مشکلات اور نقصانات کے باوجود ماؤنٹ بیٹن کی خواہش خاک میں مل گئی۔

ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظمؒ، گاندھی اور نہرو سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سیاسی اور آئینی لحاظ سے اب مسلم لیگ کی پوزیشن مضبوط ہو چکی تھی۔ لندن کانفرنس کی وضاحت کے بعد یہ بات عیاں ہو گئی کہ متحدہ ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت صرف گروپنگ سکیم کی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔ کانگرس اس گروپنگ سکیم کو ماننے سے انکاری تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے مجبوراً برصغیر کی تقسیم میں دو آزاد خودمختار ملکوں کے قیام کے لیے اقدامات شروع کر دیئے۔

دلچسپ واقعہ

اس سے کچھ عرصہ قبل ایک دلچسپ واقعہ پیش آ چکا تھا۔ والئ بھوپال نواب سر حمید اللہ خان نے مسلم لیگ اور کانگرس کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ان کے اختلافات ختم کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ قائداعظمؒ نے نواب حمید اللہ خان کو نہایت ہی مخلصانہ انداز میں سمجھایا کہ 1946ء کے انتخابات کے نتیجے کے بعد بھی کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں مانتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائیدار سمجھوتے کے بارے میں مخلص نہیں۔ اگر کانگرس اور گاندھی ایسا کر لیتے تو یقیناً اس بنیاد پر باہمی بات چیت شروع کی جا سکتی ہے۔ نواب حمید اللہ خان بھی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں مسٹر گاندھی اور قائداعظمؒ سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ گاندھی کے پاس قائد کے دلائل کو کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے زبانی طور

پر ہاں کہہ دی۔

قائداعظمؒ گاندھی کو ربع صدی سے زیادہ عرصے سے بڑی اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے۔ انہوں نے نواب صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ کوئی فارمولا ضبطِ تحریر میں لایا جائے تو اس کے بعد ہی ملاقات مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ گاندھی کی رضامندی اور نواب حمید اللہ کی کوششوں سے ایک فارمولا طے پایا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ ہندوستان کے گذشتہ انتخابات کے نتیجے میں یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے 10 کروڑ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور اس جماعت کو ان کی طرف سے نمائندگی کرنے اور ان کی طرف سے بات چیت کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ مختصر سا فارمولا سیدھا سادا تھا۔ فارمولا شائع ہو گیا تو کانگرسی اخبارات اور لیڈر بہت سٹپٹائے۔ کھلم کھلا یہاں تک کہہ دیا کہ باپو سٹھیا گئے ہیں۔ کانگرسی حلقے پریشان تھے کہ اس فارمولے کے بعد کانگرس صرف ہندوؤں کی جماعت بن کر رہ گئی تھی اور اب اگر قائداعظمؒ سے بات کرنے گئی تو صرف ہندوؤں کی نمائندہ تصور ہوگی۔ یہ بات کانگرس کے موقف کے خلاف تھی کیونکہ اسے صرف قومی جماعت کہلوانے پر اصرار تھا۔

دلچسپی کا سامان پیدا ہو گیا۔ دیکھا جانے لگا کہ گاندھی اس پر قائم رہتے ہیں یا پرانی عادت اور روایت پر۔ قائداعظمؒ نے تو پہلے ہی نواب حمید اللہ خان سے کہہ دیا تھا کہ گاندھی اپنے موقف پر قائم نہیں رہیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ گاندھی دستخط کرنے کے باوجود مکر گئے۔ انحراف کی بدنامی سے بچنے کے لیے انتہائی دلچسپ راہ نکالی۔ ایک روز شام کو اپنی پرارتھنا میٹنگ میں اعلان کیا کہ اب وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ان کا دماغ اب صحیح کام نہیں کر رہا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ 125 سال تک وہ زندہ نہیں رہیں گے۔ مسٹر گاندھی کئی سالوں سے دعویٰ کرتے آئے تھے کہ وہ 125 سال کی عمر تک زندہ رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے جس فارمولے پر دستخط کیے' ذہنی کمزوری کی وجہ سے اس

کے مطالب اور معانی کو نہ سمجھ سکا اور اس کا مطلب ہے کہ اب میں 125 سال تک زندہ نہیں رہوں گا۔

آخری کوشش

ماؤنٹ بیٹن کی آمد کے بعد آخری کوشش اس وقت ہوئی جب 4 مئی کو مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ سے ملاقات کی۔ یہ قائداعظمؒ اور مسٹر گاندھی کی آخری ملاقات تھی۔ وہ قائداعظمؒ کی کوٹھی 10 اورنگ زیب روڈ پر آئے تھے۔ مسٹر گاندھی قائداعظمؒ کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچے تو اتفاق سے قائداعظمؒ چند سیکنڈ بعد وہاں آئے۔ میں نے مسٹر گاندھی کا خیر مقدم کیا۔ کانگرسی حلقوں نے اس کا بہت برا منایا۔ اسے مسٹر گاندھی کی توہین سمجھا گیا۔ اعتراض کیا گیا کہ قائداعظمؒ نے گاندھی کا خود استقبال کیوں نہ کیا۔

یہ ملاقات انتہائی مختصر تھی۔ مسٹر گاندھی سر جھکائے خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھے رہے۔ قائداعظمؒ نے انہیں دعوت دی کہ اس امر کو تسلیم کریں کہ تقسیم ہی برصغیر کے مسائل کا واحد حل ہے۔ مسٹر گاندھی نے ہامی نہ بھری۔ ایک مختصر سے بیان کے بعد ملاقات ختم ہوگئی۔

پرچم لہرایا گیا

اب برصغیر کی تقسیم کا راستہ بالکل صاف تھا۔ وائسرائے، اس کے ساتھی اور اہل کار تقسیم کے مختلف فارمولے بنانے میں مصروف تھے۔ 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے تقسیم کے فارمولے کا اعلان ہوگیا۔ اس اعلان کے بعد پہلی بار 10 اورنگ زیب روڈ پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا گیا۔ اگلے روز مسلم لیگ کے کارکن، عام شہری اور اقلیتوں کے نمائندے بڑی تعداد میں قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں مبارکباد دی۔

ایک صاحب ایک کیک بنا کر لائے تھے جس پر ہندوستان کے نقشے پر پاکستان بنا ہوا تھا۔ میں نے قائداعظمؒ کے ساتھ ساڑھے تین سال گزارے۔ یہ پہلا دن تھا کہ ہم نے دن کے گیارہ بجے چائے پی اور ساتھ کیک کا ٹکڑا بھی کھایا۔

انٹیلی جینس کی اطلاع

ماسٹر تارا سنگھ کے تلوار لہرانے کے بعد سے فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، انتقالِ اقتدار کی تاریخ مقرر ہونے سے اس میں شدت آ گئی۔ حکومتِ ہند کی انٹیلی جنس نے ہمیں اطلاع دی کہ 10 اورنگ زیب روڈ پر حفاظتی انتظامات کرنے ضروری ہیں کیونکہ ان کی اطلاع کے مطابق بعض لوگ خدانخواستہ قائداعظمؒ پر حملہ کر کے انہیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ان دنوں اورنگ زیب روڈ پر ایک پٹھان زری گل محمد کے سوا کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ یہ نوجوان ضلع ہزارہ کا رہنے والا تھا۔ 1943ء میں جب قائداعظمؒ پر رفیق صابر نامی ایک نوجوان نے قاتلانہ حملہ کیا تھا تو یہ لان میں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ 25 سالہ رفیق صابر نے جب چاقو سے قائداعظمؒ پر حملہ کیا تو قائداعظمؒ نے اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے نوجوانوں کی سی پھرتی سے رفیق صابر کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا، وار روکا مگر حملہ آور نوجوان تھا' اس لیے چاقو کی دھار قائداعظمؒ کو لگی جس سے ہلکا سا زخم آیا تھا۔ جب تک ملازم وہاں پہنچ نہ گئے قائداعظمؒ نے رفیق صابر کو پکڑے رکھا۔ قائداعظمؒ کا جسم دبلا پتلا تھا مگر ان کے ہاتھ بڑے مضبوط تھے۔ ہاتھ ملاتے وقت گرفت بہت مضبوط ہوتی تھی۔

گل محمد کے علاوہ گھر میں ایک ڈرائیور، خانساماں اور دوسرے ملازم ہوتے۔ بمبئی میں تو مالی ہندو تھا اور گھر میں جھاڑ پونچھ کرنے والا عیسائی لیکن قائداعظمؒ نے کبھی کسی پر شک نہیں کیا' نہ ہی کوئی گنجائش تھی۔ تاہم حکومت کے اصرار پر سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی کی ڈیوٹی 10 اورنگ زیب روڈ پر لگا دی گئی۔ ہز ہائی نس میر احمد یار خان والی آف قلات نے قائداعظمؒ کی حفاظت کے لیے اپنے ذاتی محافظوں کا ایک دستہ بھیج دیا۔ خدا کے فضل سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔

ریاستوں کا مسئلہ

3 جون کے اعلان کے بعد جہاں ایک طرف پاکستان اور ہندوستان کی باہمی

حدود کا تعین ایک اہم مسئلے کی شکل اختیار کر گیا' وہاں ریاستوں کا مسئلہ بھی نئی شدت اور اہمیت کے ساتھ سامنے آیا۔ راجپوتانہ کی بعض ریاستیں جن میں جیسلمیر اور بیکانیر شامل تھیں، پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگیں۔ مشرقی پنجاب سے پٹیالہ کے مہاراجہ یدوندر سنگھ نے جو سر بھوپندر سنگھ کے بعد تخت نشین ہوئے، قائد اعظمؒ کے ساتھ پٹیالہ کے مستقبل کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔

والئ گوالیار اور مہاراجہ سندھیا نے بھی ایک روز اچانک قائد اعظمؒ سے ملاقات کی۔ ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ مہاراجہ نے اتفاق سے صبح سویرے قائد اعظمؒ کو فون کیا۔ انہوں نے خود ریسیو کیا اور مہاراجہ کو نو بجے کا وقت دے دیا۔ نو بجے جب میں اپنے دفتر میں آیا تو گھنٹی بجی۔ مجھے باہر کوئی چوکیدار نظر نہ آیا۔ میں نے جا کر خود دروازہ کھولا۔ میرے سامنے ایک درمیانے قد کا خوش شکل اور خوش پوش شخص کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔ 'ہز ہائی نس گوالیار' میں نے کہا 'تشریف لایئے'۔ اتنے میں محترمہ فاطمہ جناحؒ بھی پورچ میں پہنچ گئیں اور انہیں قائد اعظمؒ سے ملانے ڈرائینگ روم میں لے گئیں۔

جموں و کشمیر کی تصویر

اس دوران جموں و کشمیر کے وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک بھی دلّی آئے اور قائد اعظمؒ سے ملاقات کی۔ ان کی ملاقات خاصی تفصیلی تھی۔ یوں لگا مسٹر رام چندر مطمئن ہو کر لوٹے ہیں۔ اس وقت کشمیر میں صورتِ حال یہ تھی کہ کانگرس نواز لیڈر یعنی شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی جیل میں تھے۔ ان کے ساتھ ہی پاکستان کی ہمنوا جماعت مسلم کانفرنس کے لیڈر چوہدری غلام عباس، مسٹر اے آر ساغر، آغا شوکت وغیرہ نظر بند تھے۔ رام چندر کاک نے ایک نئی سیاسی جماعت تشکیل دے کر انتخابات کرائے تھے۔ رام چندر کی اس غلطی کی وجہ سے دونوں فریق انہیں اپنا مخالف سمجھنے لگے۔ ادھر مہاراجہ کے محل میں مہارانی، راج گرو اور دیگر کانگرس کے حلقے پہلے ہی کاک کے خلاف تھے۔

رام چندر کاک کا نظریہ اور اس کے محرکات خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں، نہ صرف یہ کہ بے وزن نہیں تھا میرے خیال کے مطابق اس وقت بحران کی کیفیت سے بچنے کی ایک صورت اس میں مضمر تھی لیکن رام چندر نے اس کوشش میں صرف اپنی وزارتِ عظمیٰ کا سہارا لیا۔ وہ عوامی عناصر کو نظر انداز کرتے رہے۔ ظاہر ہے وہ تنہا رہ گئے۔ وہ عوامی عناصر کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو کشمیر میں بعد میں پیش آنے والے ایسے المیے میں شاید کسی حد تک کمی واقع ہو جاتی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں رام چندر کاک کا خیال یہ تھا کہ ریاست کی جغرافیائی پوزیشن اور مسلم اکثریت کے پیش نظر جموں و کشمیر کو ہر صورت میں پاکستان سے خوشگوار تعلقات استوار کرنا اور قائم رکھنا پڑیں گے مگر اس کے ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ریاست کے جنوبی اضلاع میں ہندوؤں کی اکثریت نیز حکمران ہندو عناصر کی کانگرس نوازی مہاراجہ کو ہندوستان سے الحاق پر مجبور کرے گی۔ مہاراجہ بھارت سے الحاق کے حق میں نہ تھا مگر پاکستان سے الحاق کا بھی خواہش مند نہ تھا۔

اس طرح رام چندر کاک کا خیال تھا کہ اگر کچھ عرصے کے لیے جموں و کشمیر میں جوں کی توں پوزیشن برقرار رہے اور کشمیر کا دونوں میں سے کسی مملکت کے ساتھ الحاق نہ ہو تو اچھا ہے۔ جذبات ٹھنڈے ہونے اور بحران گزر جانے کے بعد پورے غور و خوض کے بعد الحاق کے مسئلے کا فیصلہ کیا جائے۔ یہ بات ویسے تو بڑی ٹھوس اور وزن دار تھی مگر واقعات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ معاملات کو قابو میں رکھنا کسی بھی حکومت کے بس میں نہیں تھا۔

قائد کے پیڈ پر خط

ان دنوں گاندھی، اچاریہ کرپلانی اور دیگر راہنماؤں نے کشمیر کے دورے کیے تھے۔ میری ذاتی رائے یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ کشمیر ان دوروں سے متاثر ہو کر بھارت سے الحاق کرے، وقتی طور پر کسی سے الحاق نہ کرے۔ اس ضمن میں بعض عناصر مجھ پر یہ الزام

لگاتے ہیں کہ میں نے قائد کے پیڈ پر یہ تجویز لکھ کر کشمیری لیڈروں کو بھیجی کہ کشمیر کو خودمختار رکھا جائے۔ یہ سراسر لغو اور بے بنیاد بات ہے۔ میں نے اس زمانے میں بعض دوستوں کو خط لکھے۔ ان میں کشمیر کے حالات پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے اس ذاتی رائے کا اظہار کیا تھا کہ فسادات کو روکنے اور ریاست کی تقسیم سے بچنے کے لیے اگر الحاق کا فیصلہ کچھ دیر التوا میں رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ حکومتِ پاکستان کا موقف اس سے ملتا جلتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتِ پاکستان نے مہاراجہ سے Standstill Agreement یعنی حالات کو جوں کا توں رکھنے کا وعدہ کیا۔ جو لوگ قائداعظمؒ سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جو بات کہنا یا لکھنا چاہتے' خود کہہ دیتے یا لکھ دیتے۔ یوں ان کے پیڈ پر ان کی طرف سے میرے خط لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ الزام بار بار دہرانے کے باوجود آج تک اس قسم کا کوئی خط میرے سامنے نہیں لایا گیا۔ آزاد کشمیر میں گزشتہ تین انتخابات کی تابڑتوڑ انتخابی مہم کے دوران بھی خط کی بلی تھیلے سے برآمد نہ ہوسکی۔

شیخ عبداللہ کو ملنے نہ دیا

اس سے ایک اور بات یاد آئی۔ مجھ پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ میں نے شیخ عبداللہ کو قائداعظمؒ سے ملنے نہیں دیا۔ اس طرح کشمیر کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ الزام لگانے والے اور خود شیخ عبداللہ یہ نہیں بتاسکتے کہ جناب شیخ نے کب اور کہاں قائداعظمؒ سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ شیخ عبداللہ کی آخری ملاقات قائداعظمؒ سے 1944ء میں ہوئی جس کا تفصیلی ذکر میں نے پہلے کر دیا ہے۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ نے قائداعظمؒ سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ البتہ ان کے دو ساتھی بخشی غلام محمد اور مسٹر جی۔ ایم صادق قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اگست 1947ء میں لاہور آئے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان سے ملاقات کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لیاقت علی خان نے انہیں ملاقات کا وقت نہ دیا۔ بزرگ مسلم لیگی سیاست دان میاں امیر الدین بفضلِ خدا زندہ سلامت ہیں۔ لیاقت علی خان کی ان دو حضرات سے ملاقات میاں

صاحب کے توسط سے ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد یہ دونوں رہنما میری اطلاع کے مطابق مطمئن ہو کر کشمیر واپس چلے گئے تھے۔

دراصل شیخ عبداللہ ایسی ملاقاتوں کے ذریعے بھارتی حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنی پوزیشن مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی رہائی کے بعد یہ اعلان کیا کہ میں پہلے دلّی جاؤں گا اور پھر کراچی۔ دونوں حکومتوں کے لیڈروں سے ملنے کے بعد فیصلہ کروں گا کہ ہمیں مستقبل میں کیا کرنا چاہیے۔ شیخ عبداللہ دلّی پہنچے تو پنڈت نہرو نے ان پر اپنا جادو چلایا۔ چکنی چپڑی باتوں سے بہلایا اور یوں شیخ عبداللہ کراچی گئے بغیر سری نگر لوٹ آئے۔

سردار پٹیل اس وقت ریاستوں کے وزیر تھے۔ ریاستی مسئلے کو ہندوستان کی یک جہتی اور اتحاد کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے یہ مسئلہ جلد بازی میں طے کرنا چاہتے تھے' اس لیے بھارتی حکومت نے کشمیر کے ساتھ Standstill Agreement کی تجویز مسترد کر دی۔ پٹیل کی جلد بازی کی خصوصی وجہ یہ تھی کہ جنوبی ہند میں ریاست ٹراونکور کے دیوان سر سی۔ پی۔ راما سوامی ٹراونکور کو خودمختار دیکھنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ انہوں نے 14 اگست کو ٹراونکور کی خودمختاری کا اعلان بھی کر دیا۔ اس طرح ریاست حیدر آباد دکن نے بھی مکمل خودمختاری کا فیصلہ کیا تھا۔ سردار پٹیل کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ کشمیر، حیدر آباد اور ٹراونکور نے خودمختاری کا اعلان کر دیا تو ہوسکتا ہے کہ گوالیار، بھوپال، بڑودہ، جے پور وغیرہ بھی خودمختاری کا اعلان کر دیں اور اکھنڈ بھارت کا خواب مٹی میں ملا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ کانگرس نے اس بارے میں سخت اور بے لچک پالیسی اختیار کی۔

ماؤنٹ بیٹن اس وقت بھارت میں تو سردار پٹیل کی پالیسی کی حمایت کرتا رہا لیکن اس نے مختلف ذرائع سے کوشش کی کہ پاکستان میں آجانے والے خان آف قلات اور امیر آف بہاولپور خودمختاری کا اعلان کر دیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے خود جا کر ہری سنگھ کو بھارت میں شامل ہونے کی ترغیب دی کیونکہ ہری سنگھ نہرو سے بات کرنے کا روادار نہیں تھا۔

اس پس منظر میں صورتِ حال بگڑتی گئی۔ پاکستان کے قیام کے بعد ریاست کشمیر کے مغربی علاقوں خصوصاً پونچھ میں عوام نے مسلح بغاوت کے لیے سری نگر میں عوامی اجتماعات شروع کیے۔ ان میں ریاست کی حکومت سے پرزور مطالبہ کیا جاتا کہ کشمیر کے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا جائے۔ سری نگر کی گلی گلی میں بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہوتا، کشمیر بنے گا پاکستان۔ اس وقت کے عوامی جذبات کی اہمیت کو کم کرکے بعض حلقے یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ نعرہ انہوں نے 1970ء میں ایجاد فرمایا۔

کشمیر سے متعلق پاکستان کے الحاق کی بڑھتی ہوئی عوامی امنگ نے ڈوگرہ حکومت کا تافیہ تنگ کردیا۔ عوام کو کچلنے کے لیے تمام اہم مقامات پر ڈوگرہ فوج تعینات کردی گئی۔ اس طرح سے اس المیے کا راستہ کھل گیا جس سے جموں کے دو لاکھ سے زائد مسلمان شہید ہوگئے۔

نیا جال، نئی چال

پیچیدہ اور جاں گسل کشمکش جاری تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کی جلد بازی کا مطلب پاکستان کو ہر لحاظ سے کمزور اور اپاہج بنانا تھا۔ اس ضمن میں اس نے پاکستان اور بھارت کے لیے ایک مشترکہ گورنر جنرل کی تقرری کا مسئلہ بھی کھڑا کیا۔ قائداعظمؒ نے ایک موقعہ پر اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ مرکزی حکومت کے اثاثوں کی تقسیم کے سلسلے میں کوئی مشترکہ، غیر جانبدار اور بااختیار عہدہ ہونا چاہیے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس تخیل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی سکیم کو آگے بڑھایا اور مشترکہ گورنر جنرل کی پیش کش کردی۔

یہ تجویز پاکستان کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اگر پاکستان اور بھارت کا ایک ہی گورنر جنرل ہوتا تو بیرونی دنیا تو کجا، خود برصغیر میں بھی پاکستان کے علیحدہ وجود کا تصور نہ ابھر سکتا۔ قائداعظمؒ کی بھرپور کوشش تھی کہ سیاسی یا آئینی اور نفسیاتی لحاظ سے بھی پاکستان کو ایک الگ اور ایک خودمختار ریاست کی صورت میں ظاہر کیا جائے۔ یوں یہ تاثر پیدا ہی نہ ہونے دیا جائے کہ برصغیر میں اقتدار ایک

ہی حکومت کو حاصل ہوا ہے ۔ پھر برطانوی نوآبادیاتی سسٹم میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی تھی ۔

قائداعظمؒ پر تنقید کو زندگی کا مقصد یا مشن بنانے والے حضرات کے ترکش میں ایک تیر یہ بھی ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز کی مخالفت کر کے انہوں نے بڑا نقصان کیا۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل بنانے پر آمادگی ظاہر کر دی جاتی تو اثاثوں کی تقسیم میں پاکستان کے ساتھ زیادتی نہ ہوتی ۔ اس حقیقت کو نہ جانے کیوں بھلایا جاتا ہے کہ تقسیم کے وقت ماؤنٹ بیٹن برطانوی حکومت کا نمائندہ تھا۔ اس حیثیت سے اسے ویسے بھی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا مگر وہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت نہرو کو خوش کرنے اور پاکستان کو نقصان پہنچانے کی دلی خواہش پوری کرنے کے در پے تھا۔ مشترکہ گورنر جنرل ہو جانے کی صورت میں اگر پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے کوئی غلط فیصلہ بھی کرتا تو پاکستان اس فیصلے کا پابند ہو سکتا تھا۔ قائداعظمؒ اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لے سکتے تھے؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ ایک سانس میں یہ **دلیل** دیتے ہیں، دوسرے سانس میں یہ کہہ جاتے ہیں کہ گورنر جنرل تو محض ایک آئینی عہدہ اور بے اختیار نمائندہ ہوتا ہے ۔ ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل بنا دیا جاتا تو وہ محض نام کا گورنر جنرل ہوتا ۔ اول اختیارات تو وزیراعظم یعنی قائداعظمؒ کے پاس ہوتے ۔ اگر یہ **دلیل** درست ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نام کا اور بے اختیار گورنر جنرل ہوتا تو پھر یہ بات کس طرح کہی جا سکتی ہے کہ اسے مشترکہ گورنر جنرل بنا دیا جاتا تو پاکستان کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کے پاس تو بقول نقاد حضرات کے اختیارات ہی نہ تھے ۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس وقت لازمی تھا کہ حکومت پاکستان کا پورا کنٹرول پاکستانی لیڈروں کے ہاتھوں میں ہو۔ ماؤنٹ بیٹن اثاثوں کی تقسیم میں ڈنڈی مار کے پاکستان کو رزق کی مار دے رہا تھا تو ہندو کاروباری طبقے اور صنعت کار اقتصادی طور پر

پاکستان کونقصان پہنچانے کے در پے تھے۔مشترکہ گورنر جنرل کراچی، لاہور، پنڈی اور حیدر آباد کے ہندوؤں کوتحفظ دینے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کرتا کیونکہ اسے ہندوستان کے وزیراعظم کی خوشنودی مطلوب تھی۔ وہ ماؤنٹ بیٹن جس نے ماسٹر تارا سنگھ اور جنرل موہن سنگھ کومسلمانوں کے سرقلم کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی، اس پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویہ غیر جانبدارانہ ہوگا اوروقت نے ثابت کردیا کہ قائداعظمؒ کا فیصلہ آئینی، تاریخی، سیاسی اورنفسیاتی لحاظ سے بالکل صحیح اور بروقت تھا۔

قائدکراچی پہنچے

اثاثوں کی تقسیم کا کام اور دیگر معاملات، صوبہ سرحد اور سلہٹ کا ریفرنڈم، پنجاب، بنگال اور سندھ کی صوبائی اسمبلیوں اوربلوچستان کے شاہی جرگے کے اجلاس مکمل ہونے کے ساتھ ہی قائداعظمؒ کی کراچی روانگی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

ان ہی دنوں فوج کے چار بریگیڈیئر اکبرخان رنگروٹ، ایوب خان، نذیر اور رضا قائداعظمؒ سے ملنے 10 اورنگ زیب روڈ پر آئے۔ ان حضرات کو پاکستانی فوج کی خاطر بریگیڈیر کے عہدے پر ترقی دی گئی تھی۔ اس طرح بعض سرکاری ملازم بھی قائداعظمؒ سے ملنے آئے۔ ان میں چودھری محمد علی، ملک وزیر علی، ممتاز حسن، تاج الدین عباسی اور مسٹر انعام الرحیم کے نام مجھے یاد ہیں۔

قائداعظمؒ 7 اگست کو بذریعہ جہاز کراچی روانہ ہو گئے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ بھی ساتھ تھیں۔ ماؤنٹ بیٹن کے سٹاف میں ایک اے۔ ڈی۔ سی کمانڈر احسن (پاکستان نیوی کے سربراہ جو یحیٰی دور میں مشرقی پاکستان کے گورنر رہے) نے پاکستان نیوی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ قائداعظمؒ کے پہلے اے۔ ڈی۔ سی کی حیثیت میں ان کے ساتھ گئے۔

پاکستان سپیشل پر حملہ

قائداعظمؒ نے 10 اورنگ زیب روڈ کو بیچنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مسلم لیگ کے

کاغذات اور ریکارڈ بھی کراچی لانا تھے۔ اس لیے مجھے 5 دن کے لیے بمبئی میں رکنا پڑا۔
10 اگست کو میں اور سید شمس الحسن بھٹنڈہ کے راستے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہم تیسری بار سپیشل ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ یہ گاڑیاں پاکستان کے حصے میں آنے والے افسروں اور ریکارڈ وغیرہ کو پاکستان پہنچانے کے لیے چلائی گئی تھیں۔ پہلی دو ٹرینیں بخیریت پاکستان پہنچ گئیں۔ 10 اور 11 اگست کی درمیانی رات بھٹنڈہ سے ذرا آگے کوئی نصف شب کے قریب پٹری پر زوردار دھماکہ ہوا۔ ایک ڈبہ تقریباً تباہ ہو گیا۔ تین پٹری سے اتر کر الٹ گئے۔ سات آدمی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان میں سے تین ایک ہی خاندان کے تھے۔ اس حادثے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے سکھوں نے پٹری کے اندر کی طرف تین بم باندھ دیئے تھے۔ منصوبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بم پھٹنے سے گاڑی رک جائے گی اور وہ مسافروں کو قتل کر کے سامان لوٹ لیں گے۔ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ہم اس وقت پہنچے جب انجن گزر چکا تھا۔ انجن بچ گیا۔ ملحقہ ڈبوں کو نقصان پہنچا۔ ظاہر ہے بقیہ گاڑی رک گئی۔ انجن ڈرائیور ہوشیاری سے گاڑی پاکستان لے گیا۔ چند گھنٹے بعد پاکستان سے مسلح پولیس اور طبی امداد کا سامان لے کر واپس آ گیا۔ اس دوران سکھوں نے گاڑی کے بقیہ حصے پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر خوش قسمتی سے ان کے پاس آتشیں ہتھیار نہیں تھے۔ وہ صرف کرپانوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ اس کے برعکس گاڑی میں قائداعظمؒ کی اس حفاظتی گارڈ کے سپاہی موجود تھے جو خان آف قلات نے 10 اورنگ زیب روڈ پر بھیجے تھے۔ چند اور مسافروں کے پاس پستول بھی تھے۔ میں نے گارڈ کے سپاہیوں کو فوراً ہدایت کی کہ پوزیشن لے لیں۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بعض مسافروں نے ٹارچ نکال لی اور ایک جھاڑی کے قریب سکھوں کو دیکھ لیا۔ مسافر ایک سکھ کو پکڑ کر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی بھاگ گئے۔ سکھوں نے پوری طرح منصوبہ بندی کی ہوتی تو ہم میں سے کوئی نہ بچ سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ عثمان علی خان گورنر سٹیٹ بنک بھی ہمارے ساتھ

تھے۔ بہر حال اس کے بعد ٹرینوں کے لیے حفاظتی گارڈ بھیجی جانے لگی۔

اگلی صبح ہماری گاڑی بہاولپور پاکستان میں داخل ہوئی تو مجھے اس رات سخت بخار تھا۔ راستے میں حادثے کی خبر پھیل جانے کی وجہ سے ہر ہر سٹیشن پر بے شمار لوگ جمع ہوئے۔ حادثے کی تفصیلات پوچھتے رہے۔ 12 اگست کی صبح ہم کراچی پہنچے۔ میں بخار سے نڈھال تھا۔ تین روز تک بستر میں رہا۔ اس لیے 14 اگست کی رات استقبالیے میں شریک نہ ہوسکا۔

ایک سنگین مسئلہ

قیامِ پاکستان کے بعد نئی حکومت کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے اہم اور سنگین مسئلہ مسلم مہاجرین کی آبادکاری اور غیر مسلم مہاجرین کا انخلا تھا۔ اس ایک مسئلے نے کئی اور مسائل کو جنم دے دیا تھا۔ قائداعظمؒ ہر مسئلے میں انسانی ہمدردی کے پہلو کو فوقیت دیتے۔ انہوں نے سب سے پہلے اس جانب توجہ دی۔ نئی کابینہ کی تشکیل کے چند روز بعد ہی لیاقت علی خان کو ہدایت کر دی کہ وہ اپنا ہیڈ کوارٹر لاہور منتقل کریں تاکہ مہاجرین کی دیکھ بھال و آبادکاری کا کام مکمل کرنے اور مسائل حل کرنے میں پوری قوت صرف کی جا سکے۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ نے فوری طور پر مسلم لیگ کی خواتین کمیٹی کے زیر اہتمام بے خانماں مہاجرین بالخصوص بوڑھوں اور عورتوں کے لیے کپڑوں، بستروں اور رضائیوں کا بندوبست کرنے کی خاطر گورنمنٹ ہاؤس میں ایک طرف کام شروع کر دیا۔ یہ مسئلہ پورے پاکستان پر حاوی تھا۔ پاکستان کی نئی حکومت اور مسلم لیگ کے لیے زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ قائداعظمؒ حالات کا جائزہ لینے کے لیے 23 اگست کو کراچی پہنچے۔

مہاجرین کی آمد اور ہندوؤں کے جانے کے سبب سب سے زیادہ اثر اور دباؤ پنجاب پر پڑا تھا۔ پنجاب کے بے شمار شہروں اور قصبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد مسلمانوں کے برابر تھی۔ لاہور شہر پر ہو کا عالم طاری تھا۔ اس وقت کے اخبار نویس اور آج کل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین مسٹر جمیل الزماں کی دعوت پر میں گورنر ہاؤس سے مال روڈ

کے لورینگز ہوٹل میں آیا۔ یہاں آج کل پی۔آئی۔اے کا بکنگ آفس ہے۔ یہ مال روڈ کا سب سے زیادہ بارونق ہوٹل تھا مگر اس وقت وہاں دو چار خریداروں اور بیروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ہم نے مال روڈ سے مہاجرین کے قافلے گزرتے دیکھے۔ آنے والے خالی ہاتھ تھے۔ کئی لوگ زخمی بھی تھے۔ جانے والے ہندویوں جا رہے تھے کہ چارپائیاں، لوٹے اور چٹائیاں تک ساتھ لے جا رہے تھے۔ آزادی کی خوشیاں انسانیت کے دکھ تلے دب رہی تھیں۔ پنجاب مسلم لیگ کابینہ کے ارکان بالخصوص نواب افتخار ممدوٹ، شوکت حیات، میاں افتخار الدین، ممتاز دولتانہ اور خود میں معاملات سے نپٹنے کی صلاحیت محسوس نہیں کر رہے تھے۔

وزیراعظم کے خلاف جلوس

لاہور سے واپسی کے چند روز بعد کراچی میں مہاجرین کے ایک گروہ نے جلوس نکالا اور سیدھے گورنر ہاؤس پہنچے۔ وہ لیاقت علی خان کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہیں آبادکاری کے متعلق کچھ شکایات تھیں۔ قائداعظمؒ مظاہرین کے پاس آئے۔ انہیں صبر وضبط کی تلقین کی اور وعدہ کیا کہ ان کی شکایات کی چھان بین کریں گے۔ اس واقعہ کے بعد مہاجرین کی آبادکاری کے اقدامات تیز کرنے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ ایک تو ناتجربہ کاری، پھر یہ مسئلہ اتنا وسیع تھا کہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے کسی چھوٹے بچے کے کاندھے پر منوں بوجھ ڈال دیا ہو مگر ان مشکلات کے باوجود مسلم لیگ کے کارکنوں، کابینہ کے ارکان اور عوام نے ہمت نہ ہاری۔ مہاجرین نے روح پرور کردار کے مظاہرے کئے۔ مشرقی پنجاب میں عزیزوں کی لاشیں اور گھربار جلتے چھوڑ کر آنے والے پاکستان میں داخل ہوتے ہی یہاں کی مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگاتے اور دکھ درد بھول جاتے۔ قائداعظمؒ کی سرپرستی میں اس جذبے وہمت اور بیشتر سرکاری ملازمین کی احسن کارکردگی سے مشکلات پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا۔

ڈاکٹر خان حکومت برطرف

لاہور آنے سے قبل قائداعظمؒ کو ایک ناخوشگوار فریضہ انجام دینا پڑا۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی حکومت برطرف کر دی گئی۔ جہاں تک اس وقت میں نے محسوس کیا، قائداعظمؒ کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف نہ کیا جائے۔ اسے معمولی اکثریت کی حمایت حاصل تھی مگر ایسا واقعہ پیش آیا جس کا نتیجہ حکومت کی برطرفی کی صورت میں برآمد ہوا۔ ڈاکٹر خان صاحب ایک سنجیدہ اور تجربہ کار رہنما ہونے کے باوجود 14 اگست کو جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے پاکستان کے پرچم تلے سلامی لینے سے انکار کر دیا۔ صوبہ سرحد میں یومِ آزادی کی پہلی تقریب میں وزیر اعلیٰ کی بجائے انگریز گورنر سر جارج کننگھم نے پاکستانی جھنڈے کو سلیوٹ کیا اور سلامی لی۔ اس واقعے کے بعد ظاہر ہے کوئی بھی مرکزی حکومت ایسا رویہ اختیار کرنے والے وزیر اعلیٰ اور ان کی وزارت کو قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ قائداعظمؒ نے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے گورنر کو ہدایت کی کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت برطرف کر دی جائے۔ خان قیوم خان صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔

آخری ملاقات

قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے میں چند روز کے لیے گھر واپس جانا چاہتا تھا۔ گذشتہ سوا تین سال کے عرصے میں کسی چھٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے قائداعظمؒ کی اجازت لی۔ پہلے راضی نہ ہوئے۔ بعد میں کشمیر کے اندرونی حالات کے سلسلے میں انہوں نے محسوس کیا کہ میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ انہوں نے مجھے ایک ماہ کے لیے کشمیر جانے کی اجازت دے دی۔

30 ستمبر کی شام قائداعظمؒ سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ مادرِ ملتؒ بھی موجود تھیں۔ قائداعظمؒ نے مجھے کشمیر کے متعلق ہدایات دیں اور اس یقین کا اظہار کیا کہ انشاءاللہ

کشمیر کا مسئلہ ہماری خواہش کے مطابق حل ہوگا مگر فی الوقت وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے موجودہ صورتِ حال میں مزید الجھاؤ ہو۔

میں قائداعظمؒ کی زندگی کے آخری ایام میں مقبوضہ کشمیر میں قید تھا' اس لیے ذاتی طور پر کچھ نہیں جانتا کہ قائداعظمؒ کی موت کے محرکات کیا تھے۔ البتہ میرا خیال ہے کہ یہ سب افواہیں ہیں جو بعض شکی مزاج لوگوں نے وضع کیں۔ قائداعظمؒ کی صحت تقسیمِ ہند کے بعد خراب رہنے لگی تھی لیکن ان میں ذمہ داری کا احساس اس قدر تھا کہ وہ آرام کرنے کو تیار نہ تھے' بالآخر اعصابی دباؤ انہیں بسترِ مرگ پر لے گیا۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان کی وفات پر اعلیٰ عہدے دار اقتدار کی تقسیم میں مصروف تھے یا نہیں البتہ ایمبولینس وغیرہ کے سلسلے میں تساہل کی ذمہ داری گورنر جنرل کے ذاتی سٹاف پر عاید ہوتی ہے۔

یہ خیال میرے ذہن میں بھی پیدا ہوا تھا کہ قائداعظمؒ کو علاج کے لیے بیرونِ ملک کیوں نہ بھیجا گیا۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کی تھیں۔ معلوم ہوا کہ لیاقت علی خان نے ایک مرتبہ ان کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ باہر سے ڈاکٹر بلوا لئے جائیں۔ قائد نے کہا 'نہیں'۔ خیال ہے کہ قائداعظمؒ نے یہ بات محض پاکستان دوستی اور پاکستان کے معالجوں پر اعتماد کے طور پر کہی ہوگی۔ لیاقت علی خان نے اسے ان کا حکم سمجھا ورنہ ذرا ہمت کرتے تو باہر سے ماہرین کو بلوایا جا سکتا تھا۔ لیاقت علی خان قائداعظمؒ کے قدیم ساتھیوں میں سے تھے۔ قائداعظمؒ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ وہ بہت دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ ہر بات سوچ سمجھ کر کرتے۔ برس ہا برس وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری رہے اور دونوں رہنما ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ طبیعت میں کسی قدر لاپروائی اور شانِ بے نیازی تھی اور اس کا سبب خاندانی روایات تھیں۔ نواب جو تھے۔ لیاقت علی خان ہی نہیں بلکہ لیگ کے اکثر ارکان ان سے بہت خوف زدہ رہتے تھے۔ اس کی وجہ قائداعظمؒ کا غیر جمہوری یا آمرانہ مزاج ہرگز نہ تھا۔ دراصل وہ کام میں کوتاہی یا بے اصولی برداشت نہیں

کرتے تھے اور جس شخص سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی' اس کا نوٹس بہت سختی سے لیتے تھے۔ لیاقت علی خان کے مزاج میں نوابی کے انداز تھے۔ بعض اوقات یہ ہوتا تھا کہ قائداعظمؒ تیار ہو جاتے تھے تو لیاقت علی خان نہ پہنچ پاتے۔ فون پر معلوم کیا جاتا تھا تو پتہ چلتا کہ ابھی غسل خانے میں ہیں۔ ایسے وقتوں میں قائداعظمؒ کی ناراضگی بجا ہوتی تھی۔ وہ سستی، فرض سے غفلت، بے اصولی یا منافقت کسی طرح گوارانہ کرتے تھے۔ قائداعظمؒ خالص جمہوری انداز میں سوچتے تھے اور انہیں آمریت سے شدید نفرت تھی۔ ایک مرتبہ جلسے میں کسی نے پاکستان زندہ باد کے نعرے کے ساتھ شہنشاہ پاکستان' زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ قائداعظمؒ نے اس رضا کار کو بلا کر سختی سے باز پرس کی اور بھرے جلسے میں کہا ''میں نہ شہنشاہ ہوں اور نہ بننا چاہتا ہوں''۔

پاکستان میں قائداعظمؒ کے ساتھ بہت کچھ منسوب کر لیا گیا ہے۔ حکمران کہتے ہیں کہ انہیں قائداعظمؒ کی ایک ڈائری ملی ہے جس میں انہوں نے صدارتی طرز حکومت کی بات کی تھی۔ یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ قائداعظمؒ کی کوئی ایسی ڈائری موجود نہیں ہے اور اگر حکمران اتنے حقیقت پسند اور قائداعظمؒ کے سچے پیروکار ہیں تو تین بار مارشل لاء کا نفاذ قائداعظمؒ کی کونسی ڈائری کو پڑھ کر لگایا گیا ہے۔ جدید دور میں سیاسی جماعتوں کے بغیر مملکت کا تصور ہی محال ہے اور حکمران قائداعظمؒ کی فرضی ڈائریوں اور تقریروں سے اپنے مطلب کی بات نکال رہے ہیں۔ قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے لیکن وہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دے گی بلکہ ان کی سیاسی برتری' اقتصادی اور معاشی ترقی اور آزادی کی ضمانت دے گی۔ لکھنؤ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ جس طرح کے فسادات آج کل کرائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے قائداعظمؒ سے کہا کہ آپ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ انہوں نے کہا مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں اور اختلافات سے مسلم لیگ کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ انہوں نے دونوں فرقوں سے اپیل کی کہ وہ جھگڑوں کو ختم کریں اور قومی مفاد کے تحفظ کے لئے کام کریں۔

قائداعظمؒ کی سیاسی زندگی اتنی طویل اوران کا سیاسی کردار اتنے نشیب وفراز سے گزرا ہے کہ اس پر کئی کتابیں تحریر کی جاسکتی ہیں۔بہرحال میں مختصر کچھ عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔پہلی بات یہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ قائداعظمؒ جیسا حریت پسند برصغیر پاک و ہند میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔قائداعظمؒ کی سیاست آغاز سے انجام تک اپنے تمام معاصر سیاست دانوں کے مقابلے میں برصغیر پر چھائی رہی۔گاندھی اورنہرو بلاشبہ بہت بڑے سیاستدان تھےلیکن قائداعظمؒ کی بات کچھ اورتھی۔سیاست میں قائداعظمؒ کی کامیابی کا رازیہ تھا کہ ان کا سیاست کا طویل تجربہ تھا اور وہ ہندواور انگریز سیاست دانوں کی ذہنیت کواپنے مشاہدے اور تجربے کی وجہ سے بخوبی سمجھتے تھے۔انگریز کے طریق کار،مزاج اور سیاسی چالبازیوں کا وہ پوری طرح علم رکھتے تھے۔اس لیے انہوں نے انگریز اور ہندو مدبّروں اور سیاست دانوں کا ہر میدان میں مقابلہ کیا۔قائداعظمؒ کی دوسری خوبی ان کے ذاتی کردار کی پختگی تھی۔ایسا دیانت دار سیاست دان شاید ہی برصغیر میں دوسرا کوئی پیدا ہوا ہو۔ان کی ایک اورخوبی یہ تھی کہ وہ جذباتی قطعاً نہیں تھے اور ہر فیصلہ ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ کرتے اور ہمیشہ ٹھوس قدم اٹھاتے۔حالات کے مطابق وہ اپنی حکمتِ عملی نہایت دانش مندی سے تشکیل دیتے تھے۔قائداعظمؒ کی ان خوبیوں کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کوان پر بے پناہ اعتماد تھا۔قائداعظمؒ کے جلسوں میں لوگ جوق در جوق شریک ہوتے اور جولوگ ان کی انگریزی کی تقریر کونہیں بھی سمجھ پاتے تھے'ان کوبھی یہ یقین ہوتا تھا کہ قائداعظمؒ جوبھی ارشادفرمارہے ہوں گے' وہ مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا اور قائداعظمؒ کی تعلیمات پرعمل پیرا ہوکرہی برصغیر کے مسلمان اپنے مسائل سے عہدہ برآء ہوسکتے تھے۔

قائداعظمؒ ایک جمہوریت پسند انسان تھے۔آزادیٔ تقریروتحریر پر پابندی کے سخت مخالف تھے۔قائداعظمؒ کی زندگی میں بھی ان کے مخالفین نے ان کی ذات پرنکتہ چینی کی۔ان کے خلاف الزامات لگائےلیکن قائداعظمؒ نے ایک جمہوریت پسند انسان ہونے

کی حیثیت سے اس نکتہ چینی کا کبھی برا نہیں منایا تھا۔ ولی خان تو ایک بہت چھوٹے سیاست دان ہیں۔ ان کے جھوٹے لغو اور بے بنیاد الزامات کا میں کیا جواب دوں۔ میں ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ ولی خان کے باپ غفار خان اور کانگرس کے لیڈروں گاندھی اور نہرو نے قائد اعظمؒ کے خلاف اس سے بھی زیادہ سنگین الزامات لگائے تھے جو آج قائد اعظمؒ کے خلاف لگائے جا رہے ہیں لیکن قائد اعظمؒ کی عظمت ان الزامات کی وجہ سے نہ کل کم ہوئی نہ آج اس میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ گاندھی، نہرو، ابوالکلام آزاد اور تحریکِ پاکستان کے دوسرے مخالف قائدین نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے دوران وہ کونسا الزام ہو گا جو قائد اعظمؒ پر نہ لگایا ہو۔ ان اعتراضات اور الزامات کے باوجود برصغیر کے مسلمانوں نے صرف قائد اعظمؒ کی ذات پر بھروسہ کیا۔ صرف قائد اعظمؒ کو مسلمانوں نے اپنی عقیدت اور محبت کا محور بنایا۔ صرف قائد اعظمؒ کے احکامات کو انہوں نے سر آنکھوں پر رکھا اور ان کی جلیل القدر قیادت میں پاکستان کی جنگ جیتی۔ کانگرسی مسلمانوں کو اور سرحد کے خدائی خدمت گاروں کو قائد اعظمؒ کی وہ عظیم فتح اور کانگرس کی وہ ذلت آمیز شکست کیسے بھول سکتی ہے۔ لہٰذا آج بھی جب ولی خان اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو تحریکِ پاکستان کا دور یاد آتا ہے تو وہ قائد اعظمؒ کے خلاف بولنے لگتے ہیں۔ میں ولی خان سے صرف یہ عرض کروں گا کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی اس رائے کے نتیجے میں بنا تھا جس کا اظہار انہوں نے 1946ء کے انتخابات میں کیا تھا۔ پھر سرحد میں ریفرنڈم ہوا تو وہاں بھی پختون مسلمانوں نے واضح اکثریت سے پاکستان کے موقف کی حمایت کی۔ کیا یہ تمام مسلمان انگریزوں کے آلۂ کار تھے۔ کیا ان مسلمانوں نے انگریزوں کے کہنے پر پاکستان کے حق میں اپنے ووٹ ڈالے تھے۔ ولی خان صاحب سے میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہندو قوم مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی کے لئے پاکستان کی مخالفت کر رہی تھی تو کیا مسلمان قوم کو اپنی بہتری اور خوشحالی کا احساس نہیں تھا۔ کیا مسلمان قوم اپنے نفع و نقصان کو پہچاننے سے

قاصر تھی اور کیا ہندو سیاست دان اور ان کے آلۂ کار غفار خان وغیرہ ہی مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ کیا اس دور میں مسلمان قوم بحیثیت مجموعی اتنی ہی بے شعور تھی کہ اس نے گاندھی نہرو یا غفار خان جیسے ہمدرد سیاست دانوں سے منہ موڑ کر قائد اعظمؒ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ یہ کتنی مضحکہ خیز اور خلافِ حقیقت بات ہے کہ برصغیر کے جن کروڑوں مسلمانوں نے پاکستان کی حمایت کی' وہ تو انگریزوں کے آلۂ کار تھے اور صرف ولی خان اور ان کا باپ صحیح معنوں میں آزادی کے علمبردار تھے۔ میں ولی خان سے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ پاکستان دشمنی کی عینک اتار کر اس حقیقت پر ضرور غور کریں کہ 1946ء کے انتخابات میں اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نے کانگرس اور قوم پرست سیاست دانوں کے موقف کو کیوں مسترد کر دیا تھا اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی کیوں حمایت کی تھی؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مقصد مسلمانوں کے لیے بہتر اقتصادی سہولتیں تھا اور مذہب کا نعرہ بعد میں شامل کیا گیا تھا' پہلے ہندوستان میں مختلف سیاسی تحریکوں کے پس منظر سے آگاہی ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں جتنی بھی سیاسی تحریکیں پر امن طور پر اٹھیں' ان کا مقصد سرکاری ملازمتوں کا حصول اور عوام کے لیے بہتر سامان مہیا کرنا تھا اور آزادی حاصل کرنے کا خیال اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر نیشنل کانگرس کو لیجیے۔ آپ جانتے ہیں یہ جماعت ایک انگریز مسٹر ہیوم نے بنائی تھی اور اس کا مقصد برطانیہ کے وفادار لوگ جمع کرنا اور انہیں ہندوستان میں برطانوی پالیسیوں کے بارے میں عوام کی حمایت حاصل کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ 1857ء کے بعد سے مسلمانوں پر چونکہ انگریزوں کی طرف سے زیادتیاں ہوئیں تھیں' اس لیے وہ انگریزوں سے بہت نالاں تھے۔ صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے انگریزوں سے تعاون کیا۔ انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمتیں حاصل کر لیں۔ اس طرح یہ لوگ ایک حد تک اقتدار میں شامل ہو گئے۔

مسلمانوں نے جب یہ حالات دیکھے تو انہیں پریشانی لاحق ہوئی کہ ہندو انگریز سے تعاون کر کے ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں چنانچہ سرسید احمد خان اور بعض دوسرے اکابرین نے سوچا کہ مسلمانوں کو بھی انگریزی تعلیم سے آراستہ ہو کر حکومت میں شامل ہونا چاہیے چنانچہ علی گڑھ کی ساری تحریک اسی ردعمل کا نتیجہ تھی۔ مسلم لیگ کے بارے میں بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جماعت کا مقصد شروع میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد' سیاسی بہتری کی کوشش اور ملازمتوں کا حصول تھا۔ 1916ء میں آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگرس کا جو مشترکہ اجلاس ہوا وہاں سے مسلم لیگ کی پالیسی بدلنا شروع ہوئی۔ 1917ء سے پہلے قائداعظمؒ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ لیڈر تھے اور سچ پوچھیے تو کانگرس کو آزادی کے جذبے سے روشناس کرانے کا سہرا بھی قائداعظمؒ کے سر ہے۔ پھر گاندھی جنوبی افریقہ سے واپس آئے اور قائداعظمؒ نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مشترکہ ہندوستان کی صورت میں ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں گے اور مسلمان آبادی کے لحاظ سے چونکہ اقلیت میں ہوں گے' اس لیے ان کے لیے اپنے وجود کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ بعض ہندو لیڈروں کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں نے جو حکومت کی ہے' اس کا بدلہ لینا چاہیے۔ پھر آگے چل کر 1935ء میں صوبائی خود مختاری ملی تو جن صوبوں میں کانگرس کی حکومت قائم ہوئی' وہاں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ ہندو مجموعی طور پر مسلم تہذیب کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قائداعظمؒ چونکہ ایک ماہر قانون دان بھی تھے اور وہ جانتے تھے کہ الگ ملک بنانے کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، اس لیے انہوں نے مسلم کمیونٹی کی جگہ مسلم نیشن کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا مقصد بھی مسلمانوں کے لیے اقتصادی تحفظ حاصل کرنا تھا لیکن جب قائداعظمؒ کی نگرانی میں علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے پیش نظر وہ تجربات تھے جن سے

ثابت ہوا کہ ہندو مسلمانوں کو سرے سے برداشت ہی نہیں کر سکتا اور وہ مسلم تہذیب کا جانی دشمن ہے چنانچہ پاکستان کے مطالبے میں جو چیز بنیادی اہمیت رکھتی تھی' وہ بحیثیت قوم مسلمانوں کی تہذیب کی حفاظت تھی۔ اگر محض ملازمتوں یا معاشی تحفظ کا مسئلہ ہوتا تو بڑی آسانی کے ساتھ مشترکہ ہندوستان کے فارمولے میں بھی اس کی گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مطالبۂ پاکستان میں چونکہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے تحفظات کا حصول مقصود تھا' اس لیے معاشی مسئلے کو اس سے الگ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اسے بنیاد بنانا بہت بڑی غلطی ہے۔

مسلم لیگ پر جو بعض حلقوں کی طرف سے ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی لیڈر شپ چونکہ بڑے بڑے زمینداروں اور امیروں کے ہاتھ تھی اور وہی لوگ پاکستان کے قیام کے بعد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے' اس لیے وہ نہ صرف عوام سے الگ تھلگ رہے بلکہ وہ ان کے مسائل کو بھی نہ سمجھ سکے۔ اس کے لیے آپ کو اسی ماحول میں جانا ہوگا جس میں قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ان لوگوں کی اکثریت تھی جو یا تو سرکاری ملازم تھے یا فوج یا پولیس میں کام کر رہے تھے کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مقصد ہی ملازمتوں کا حصول تھا، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سیاسی شعور نسبتاً پڑھے لکھے لوگوں میں ہی مل سکتا ہے اور کسی تحریک کو چلانے کے لیے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لے دے کے چار ہی ایسے طبقے رہ جاتے تھے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی پابندی سے آزاد تھے۔ طلبہ، وکیل، صنعت کار اور زمیندار۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سیاسی کاموں کے لیے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسان تھوڑا بہت فارغ بھی ہو۔ آپ ہی بتایئے جو انسان صبح سے شام تک محنت کر کے مشکل سے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتا ہو' وہ کیونکر سیاسی عمل میں حصہ لے سکتا ہے چنانچہ

قائد اعظمؒ ان ہی چار طبقوں میں اپنے ساتھی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے کھل کر آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔

ان میں سے بھی دولت مند آپ زیادہ سے زیادہ دو طبقوں کو قرار دے سکتے ہیں زمینداروں اور صنعت کاروں کو۔ صنعت کار کا مفاد چونکہ حکومتِ وقت کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ کسی بھی حکومت کے خلاف تحریک میں کم ہی حصہ لیتے ہیں۔ زمیندار طبقہ اس قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اصفہانی کلکتہ کے تاجر تھے تو چودھری خلیق الزمان وکیل، سردار نشتر بھی درمیانے طبقے کے وکیل تھے اور قاضی عیسیٰ کا شمار بھی متوسط طبقے میں ہوتا تھا۔ پنجاب میں ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی بھی کوئی لکھ پتی نہ تھے۔ بعض بڑے زمیندار ضرور مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن کسی شخص کو محض اس بنا پر تحریک میں شامل ہونے سے نہیں روکا جا سکتا تھا کہ وہ دولت مند ہے یا بڑا زمیندار ہے۔ جو شخص بھی اس تحریک کے بنیادی مقصد سے متفق تھا' اس میں شامل ہو سکتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی' اس کی وجہ یہ نہیں تھی۔

میرا اس پر پختہ ایمان ہے اور میں کسی کی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ اس نظریے پر کاربند رہا ہوں کہ بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ میں جو اصحاب قائد اعظمؒ کے ساتھ کام کر رہے تھے، ان میں نظریۂ پاکستان راسخ نہ ہو سکا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان کو ایک نظریاتی مملکت کہا جاتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ملک حاصل کرنے کے بعد اس نظریے کا عملی اطلاق ہوتا مگر مسلم لیگ کے اکثر و بیشتر رہنماؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ملک کے قیام کے بعد مسلم لیگ کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی ضرورت باقی نہیں رہی حالانکہ یہ نظریہ نہایت غلط تھا۔ جغرافیائی طور پر زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ جب تک اس ٹکڑے کی آبیاری ان اصولوں کے تحت نہ کی جاتی جو اس کے حصول کی جدوجہد کے وقت پیشِ نظر تھے۔

اس سوال کا جواب کہ مسلم لیگ کے اکثر رہنماؤں کے ذہنوں میں نظریۂ پاکستان

راسخ نہ ہو سکا تھا اور اس کی ذمہ داری مسلم لیگ ہائی کمان پر عاید ہوتی ہے اس خاص ماحول کو پیش نظر رکھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔قرار داد لاہور 1940ء میں منظور ہوئی تھی اور اس کے بعد 1947ء تک کا دور اس قدر ہنگامہ خیز کا تھا کہ قائد اعظمؒ کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی سیاسی تربیت کرتے۔حالات لحہ بلحہ نئی شکل اختیار کر رہے تھے۔جلوس مذاکرات، کانفرنسیں، بھاگ دوڑ غرضیکہ سیاسی عمل اچانک اتنا تیز ہو گیا تھا کہ بالخصوص پاکستان پر خالص علمی انداز میں کام کرنے کا وقت تھا نہ کارکنوں کی سیاسی تربیت کی مہلت۔ کیا انگریز، کیا ہندو اور کیا مسلمانوں کے بعض طبقے غرضیکہ پاکستان کی مخالفت میں اتنے لوگ تھے کہ ان کا ہر سطح پر مقابلہ کرنے کے لیے جسم وجان کی ساری قوتیں درکار تھیں۔یہی وجہ ہے کہ قائد اعظمؒ بہت کچھ چاہنے کے باوجود بہت کچھ نہ کر سکے۔

صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں جو میرے ذاتی علم میں ہے۔ قائد اعظمؒ کی زبردست خواہش تھی کہ وہ سیکرٹریٹ بنائیں جس میں پڑھے لکھے اور مستعد نوجوانوں کی ایک کھیپ رکھی جائے۔ سیکرٹریٹ قیام پاکستان کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا مکمل ریکارڈ رکھنے اور ان سوالات کا جو مختلف حلقوں سے تحریکِ پاکستان پر کیے جا رہے تھے، علمی انداز میں جواب دے۔کئی بار انہوں نے مجھے اس کا خاکہ تیار کرنے کو کہا مگر حالت یہ تھی کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے پاکستان کے قیام تک وہ اس قدر مصروف رہے تھے کہ مجھ سے اس چھوٹے سے منصوبے کی جزئیات بھی طے نہ کر سکے۔ چنانچہ یہ کام نہ ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ کام ہو جاتا تو آگے چل کر پاکستان کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے سیاسی عمل کا ٹیمپو اس قدر تیز ہو گیا تھا کہ سیاسی ورکروں اور لیڈروں کو روزمّرہ کی نت نئی صورتِ حال کا مقابلہ کرتے کرتے اچانک پاکستان کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ سب کچھ اس سرعت سے ہوا کہ ایک لمحے کے لیے رک کر ماضی پر نظر ڈالنے یا

نظریات کو مستحکم کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ اس لیے میری رائے اس بارے میں مستحکم ہے کہ قائداعظمؒ کے ساتھیوں اور مسلم لیگ کے کارکنوں کی اکثریت نظریۂ پاکستان کو پورے طور پر ذہن نشین نہ کرسکی تھی اور ان کا اپنا اعتماد ابھی اس پر اتنا راسخ نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی مملکت معرضِ وجود میں آ گئی۔

پاکستان جلد ہی ہمیں مل گیا۔ اس پر تو ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک لحاظ سے منزل تک آ پہنچے اور جد وجہد کا ایک مرحلہ طے ہوا مگر میرے خیال میں اگر قائداعظمؒ آج زندہ ہوتے اور جو کچھ اس وقت ملک میں ہو رہا ہے اس کو دیکھتے تو ان کی رائے مجھ سے مختلف نہ ہوتی۔

میرے خیال میں مسلم لیگ کے عہدے داران اور تحریکِ پاکستان کے ایسے بڑے رہنماؤں کو نوزائیدہ مملکت میں عہدے قبول نہیں کرنے چاہئے تھے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ پارٹی کو مضبوط رکھا جاتا۔ نظریاتی ملک پارٹی کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ پارٹی کا مقصد ختم نہیں ہو گیا تھا۔ خاکہ بن گیا تھا تو رنگ بھرنا باقی تھا اور جب تک پارٹی کی پوزیشن مضبوط نہ ہوتی اور اس نظریے پر کام نہ ہوتا اور اس نظریئے کو خواص وعوام کے ذہنوں میں راسخ کرنے کا بندوبست نہ ہو جاتا' اسے ختم کرنے یا عضوِ معطل بنانے کا کوئی جواز باقی نہ تھا۔ اگر آپ ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ نظریاتی ملک میں پارٹی کو بنیادی حقیقت حاصل ہے اور حکمران اسکے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں لیکن یہاں اس کے برعکس ہوا۔ قائداعظمؒ کی ذات تک تو یہ ٹھیک تھا۔ ان کی موجودگی میں کوئی شخصیت اتنی قد آور نہ تھی کہ ملک کی سرزمین کا بوجھ سنبھال سکتی لیکن باقی لوگوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ مسلم لیگ نے اپنا مقصد حاصل کرلیا ہے' اس لئے انہوں نے وزارتوں اور سفارتوں پر فائز ہونا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں پارٹی عضوِ معطل ہو کر رہ گئی۔ وہ تحریک جس کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا تھا ختم ہو گئی۔

اس ضمن میں کسی ایک دو کا نام نہیں لیا جا سکتا البتہ شروع کا کچھ حصہ مہاجرین کی آباد کاری، نوزائیدہ مملکت کا نظم و نسق، بھارت میں مسلم کش فسادات اور بیرون ملک پاکستان کی حیثیت کو تسلیم کرانے کے کام اتنے اہم تھے کہ پارٹی کی تھوڑی دیر کے لیے یہ لاپروائی برداشت کی جا سکتی تھی پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ مسلسل کام سے ان کے اعصاب پر گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ زیادہ دیر ہم میں نہ رہ سکے۔ میرے خیال میں لیاقت علی خان کو یہ کام کرنا چاہیے تھا۔ وہ یقیناً اس پوزیشن میں تھے کہ اس کام کو انجام دے سکتے تھے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کی قیادت نے پارٹی اور حکومت کے مابین جو تعلقات ہونے چاہئیے تھے انہیں محسوس نہ کیا اور اگر محسوس کیا گیا تو مناسب اہتمام نہیں کیا گیا اور پھر تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک طرف سرکاری ملازم بھی نوکریاں چھوڑ کر پارٹی میں شامل ہونے لگے اور دوسری طرف وزراء اور حکومت کے عہدہ داروں نے پارٹی کے عہدوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ان اقدامات نے پارٹی کی رہی سہی وقعت بھی کم کر دی اور اس کا وجود عملاً ختم ہو گیا۔

آج کل مختلف سیاسی نظریات کی جماعتیں بالخصوص قائداعظمؒ کے مذہبی نظریات کو اپنے موقف کی تائید میں استعمال کرتی ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں بعض اصحاب انہیں سوشلزم کا دشمن ثابت کرتے ہیں اور بعض انہیں اسلامی سوشلزم کا علمبردار۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ بابائے قوم کو اس بحث میں نہ گھسیٹا جائے تو بہتر ہے۔ وہ پارٹیاں جو بات بات پر قائداعظمؒ کی ذات کا حوالہ دیتی ہیں' دراصل اپنی سیاست کی کمزوریوں کی تلافی کرنا چاہتی ہیں۔ اپنے نظریات کا جواز تلاش کرنے کے لیے ایک عظیم قومی رہنما کے ساتھ غلط باتیں منسوب کرنا یا ان کی تقریروں یا تحریروں کو اکٹھا کر کے استعمال کرنا اخلاقی بددیانتی ہے۔

قائداعظمؒ کے مذہبی نظریات کے متعلق ایک بات واضح ہے کہ وہ سیدھے سادے مسلمان تھے اور فرقہ پرستی میں الجھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پاکستان کے آئین کے بارے میں

انہوں نے دورۂ مصر کے دوران شیفرڈ ہوٹل میں ایک اخباری نمائندے کے سوال کے جواب میں جو بیان دیا' وہ اس پر ہمیشہ کاربند رہے۔ انہوں نے کہا تھا:

''اس ضمن میں ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے آئین تیرہ سو سال پہلے بنا دیا گیا تھا۔''

اب رہی بات کہ وہ سوشلسٹ تھے یا اسلامی سوشلزم پر یقین رکھتے تھے، یا نہیں رکھتے تھے، اس کا جواب دینے سے پہلے آپ کو یہ تعین کرنا پڑے گا کہ سوشلزم سے کیا مراد ہے؟ اور کیا یہ لفظ ان دنوں ان ہی معنی میں استعمال ہوتا تھا جس میں آج استعمال ہو رہا ہے۔ دور نہ جایئے' محترمہ فاطمہ جناحؒ نے پاکستان کے صدارتی انتخاب میں 90 ہزار بنیادی جمہوریت کے ارکان کے نام جو خط لکھا تھا' اس میں اسلامی سوشلزم کو ہی اپنی پالیسی بتایا تھا۔ لیکن جو لوگ مادرِ ملتؒ کے خیالات سے آگاہ ہیں' وہ جانتے ہیں کہ کمیونزم اور سوشلزم سے انہیں شدید نفرت تھی اور انہوں نے اسلامی سوشلزم کی ترکیب محض عوامی مساوات یا فلاحی مملکت کے تصور کے طور پر استعمال کی۔ بہرکیف ایک بات جس کا تذکرہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ قائداعظمؒ فرقہ پرستی کے سخت دشمن تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار مسلم لیگ کے ایک ضلعی سربراہ کے خلاف یہ تحریک شروع ہوئی کہ وہ قادیانی ہے اور معاملہ قائد تک پہنچا تو انہوں نے یہ رولنگ دی کہ اگر وہ خود کو مسلمان کہتا ہے تو بس ٹھیک ہے۔ قائداعظمؒ قادیانیوں کو مسلمان سمجھتے تھے یا نہیں سمجھتے تھے، اس پر بحث بے کار ہے کیونکہ اس رولنگ کا اصل مقصد صرف اتنا تھا کہ اس دور کا تقاضہ یہ تھا کہ جتنے بھی لوگ ساتھ ملیں' انہیں ملا لیا جائے۔ اگر کسی طرح کی مذہبی پابندی عائد کر دی جائے تو آپ ہمارے ہاں کے مذہبی فرقوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے سے تحریکِ پاکستان میں شامل ہونے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی۔ میں اس دور کے تقاضے بیان کر رہا ہوں۔ جب کبھی ان سے بات ہوتی وہ لوگوں سے یہی کہتے کہ مذہبی بحثوں میں نہ الجھو اور جو شخص خود کو مسلمان

کہتا ہے' اسے مسلمان سمجھ لو۔ جب ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا اور ملک مل جائے گا تو عوام مل کر جو چاہیں گے' کرلیں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا قائداعظمؒ پاکستان کو ایک خالصتاً مذہبی سٹیٹ (تھیوکریسی) بنانا چاہتے تھے یا ایک جمہوری یا سوشلسٹ ریاست کے خواہاں تھے۔ بات یہ ہے کہ آج کل بدقسمتی سے کچھ لوگ سیاسی مقاصد کے لیے طرح طرح کے مطلب نکالتے ہیں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آج تک شیکسپیئر کے ڈراموں پر جتنے تبصرے ہوئے یا جو کچھ مطالب نکالے گئے ہیں' وہ شاید اس عظیم شاعر کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔ شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے اور مطلب نکالنے والے کچھ کا کچھ نکال لیتے ہیں۔ گذارش یہ ہے کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کو کوئی رکاوٹ نہ تھی' نہ نماز کی نہ روزہ کی نہ کوئی ذاتی قوانین کی کہ جائیداد کیسے تقسیم ہوگی۔ شادی' طلاق' وراثت کے تمام اسلامی قوانین انگریزوں کے دور میں بھی موجود تھے۔ ہندو ریاستوں میں مثلاً ہمارے ملک کشمیر میں بھی ایسا ہی تھا ماسوائے ایک دو باتوں کے کہ گاؤکشی پر پابندی تھی۔ سوال یہ تھا کہ ایک متحدہ ہندوستان میں جو مسلمان ہیں' وہ مذہبی آزادی کو قائم رکھ سکیں گے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا وہ صحیح معنوں میں آزاد ہو سکیں گے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی امور کے لحاظ سے یا جہاں تک سفارتوں کا تعلق ہے' پروفیشن کا تعلق ہے' انڈسٹری کا تعلق ہے' بینکوں کا تعلق ہے' کیا ان میں سے ایک مرکز بھی جس پر کہ ہندوؤں کا قبضہ ہے' وہ انہیں کھلی اجازت دے گا؟

قائداعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ میرا ہندوؤں کے متعلق گہرا مشاہدہ ہے۔ میری ساری زندگی ان میں ہی گزری ہے۔ اگر ایک متحدہ ہندوستان بن گیا تو مرکز میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہوگی تو آپ تجارتی لحاظ سے' پروفیشنل لحاظ سے' کسی بھی انداز سے کوئی ترقی نہیں کرسکیں گے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے قیام کا جو مقصد ہے' وہ یہ تھا کہ مسلمان ہر لحاظ سے آزاد ہوں گے اور ان کی اپنی حکومت ہوگی۔ وقار اور احترام کے ساتھ سب رہیں

گے۔ قائداعظمؒ نے ایسے سوالات کا تفصیل سے جواب دینے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ انہوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ ہم مسلمان ہیں ہمیں جمہوریت کے لیے زیادہ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس قرآن شریف کی آیات موجود ہیں اور ہماری روایات جمہوری ہیں۔ لہٰذا پاکستان ایک جمہوری ملک ہوگا جس میں اسلام کو اس کی سپرٹ کے مطابق ایک نظام میں مرتب کیا جائے گا لیکن بنیادی مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اسلام کی روح کے مطابق جو نظام مرتب ہوگا' اس کا صحیح نمونہ تو خلافتِ راشدہ کا تھا۔ خلافتِ راشدہ جیسی عظیم جمہوریت میرے خیال میں آج تک پیدا نہیں ہوئی کیونکہ اس میں خلیفہ جو وقت کا حاکم ہے' وہ دن میں پانچ وقت نماز کے وقت عوام کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ وہی اس کا دربار تھا۔ وہیں اس سے سوال و جواب ہوتے تھے اور ایسے کئی واقعات تاریخ میں ہیں کہ عام آدمی بھی خلیفۂ وقت پر تنقید کر سکتا تھا اور جواب طلب کر سکتا تھا۔ اب جو بعض عناصر یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی ریاست ہونی چاہئے تو کیا یہ اسلامی ریاست ہے؟ جنرل محمد ضیاء الحق نے 26 قسم کے کمیشن قائم کئے۔ انصاری صاحب کا' فلاں جج کا' تنزیل الرحمٰن کا' اس کے علاوہ اور لوگوں کا بھی۔ باہر بھی گئے۔ سعودی عرب گئے۔ علماء کانفرنسیں کیں' مشائخ کانفرنسیں کیں اور یہ ابھی تک اسلامی ریاست کا نچوڑ پیش نہیں کر سکے۔ کیا اسلامی نظام یہ کہتا ہے جو ضیاء الحق پیش کرنا چاہتے ہیں؟ اسلام نے کوئی نظام پیش نہیں کیا۔ اسلام نے چند ایک بنیادی اصول پیش کئے۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ حکومت وہ کرے جو تم میں سے ہو اور حکومت وہ ہے جو قوم کے سامنے جواب دہ ہو اور پھر سب سے بڑا کام اسلامی حکومت کا یہ ہے کہ عدل کرے۔ اسلامی حکومت کا کام ٹیلی ویژن پر اذان سنانا نہیں۔ اسلامی حکومت کا کام روزے رکھوانا نہیں ہوتا۔ اسلامی حکومت کا کام نمازیں پڑھانا نہیں ہوتا۔ اسلام میں شروع سے ہی نماز پڑھوانا' روزے رکھوانا اور قرآن شریف پڑھوانا والدین کا کام ہے۔ اسلام میں شرع کے لحاظ سے یہ والدین کا فرض ہے کہ وہ بارہ سال کی عمر تک بچوں کو قرآن بھی پڑھائیں' روزے بھی رکھوائیں' نماز بھی

پڑھائیں اور اسلام کے بنیادی عقائد سے واقف کرائیں۔ اس کے بعد اسے تب سزا ملے گی جب جرم وسزا کا معاملہ ہوگا اور بعض معاملات میں جو سزا ہوگی' وہ سٹیٹ اور قانون کے مطابق ہوگی اس لیے کہ وہ بالغ اور خودمختار ہے۔

اسلامی حکومت کا بنیادی کام عدل وانصاف کرنا ہے۔ جتنا زور عدل اور انصاف پر قرآن شریف میں دیا گیا ہے' کسی اور بات پر نہیں۔ عدل کرنا' مساوات قائم کرنا' اخوت قائم کرنا' دولت کے ارتکاز کا روکنا اور اس کے ساتھ علاقائی اور صوبائی تعصبات کو روکنا اسلامی حکومت کے کام ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر شخص کی ذات' اس کی جائیداد' اس کے حقوق' اس کی جان ومال کا تحفظ ہو۔ ٹیلی ویژن پر اذانیں سنانا تو میرے خیال میں بدعت ہے۔ اذان وہاں ہونی چاہئے جہاں سے نماز کے لیے بلایا جائے۔ ''حی علی الصلوٰۃ'' یہاں آؤ اور نماز پڑھو' ٹیلی ویژن اسٹیشن پر جائیں تو وہاں تو نماز نہیں ہوتی۔ وہاں تو اذان کے بعد فوراً دوسرا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ یہ تو ویسے ہی لوگوں نے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ نے قرارداد لاہور پڑھی ہوگی۔ اس سے یہ بات صاف واضح ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم پاکستان میں تمام اقلیتوں کو ان کے مذہبی' معاشی' معاشرتی اور انتظامی حقوق جو ہیں ان کی گارنٹی دیں۔ اسی طرح ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق کی بھی گارنٹی ہو۔ اس لیے یہ کہنا کہ پاکستان کا مطلب ہے کہ یہاں خالصتاً اسلامی حکومت ہوگی اور وہ اسلامی حکومت یہ ہوگی کہ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اذانیں سنائے گی' یہ پاکستان کا مقصد نہیں تھا۔

بین الاقوامی سطح پر بھارت کے بعض ادیب اور دانشور یہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ پاکستان قائم نہ ہوتا تو متحدہ ہندوستان کی شکل میں بھی مسلمانوں کے حقوق محفوظ رہ سکتے تھے بلکہ اس صورت میں بھارت کے مسلمان بھی اس قدر اقلیت میں نہ ہوتے جس قدر آج کل ہیں۔ ہمارے ہاں کے بعض نام نہاد دانشور بھی کبھی کبھی ایسی باتیں کر جاتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کی جدوجہد جس پلیٹ فارم سے ہو رہی تھی، اس کا ایک ادنیٰ خادم ہونے کے ناتے میری معلومات یہ ہیں کہ ایک سٹیج ایسی آ گئی تھی کہ جو کچھ ہمیں آج ملا ہے وہ بھی نہ ملتا۔ اس مرحلے پر پاکستان کو موجودہ حالت میں قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ رہا متحدہ ہندوستان کا تصور تو اگر مسلمانوں کو اس میں نمائندگی مل بھی جاتی تو بھی کانگرس کے پاس نام کے کافی مسلمان تھے اور مختلف صوبوں میں بھی ڈاکٹر خان صاحب اور خضر حیات جیسے لوگ موجود تھے۔ ان کی وزارتوں میں شامل ہونے کے باوجود مسلمانوں پر وہ ظلم اور زیادتیاں ہوئیں جو آج بھارت کے مسلمانوں پر ہو رہی ہیں۔ اس وقت کے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہر واقعہ کو اس کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ بہرکیف یہ ایسا مسئلہ ہے کہ مستقبل کا مورخ جو حقیقتاً غیر جانبدار ہوگا اور جسے کسی کا خوف نہیں ہوگا، اس پر اپنی رائے دے گا اور میرا ایمان ہے کہ اس کی رائے قائداعظمؒ کے حق میں ہوگی۔ انہوں نے آپ کو ایک خطہ دے دیا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ اسے جنت نظیر بنائیں یا جہنم زار۔

پاکستان جس نظریے کی بنیاد پر بنا تھا' اسے مدنظر رکھیں تو اسے دنیا بھر کے مسلمانوں کی آزادی پسند تحریکوں کا مرکز ہونا چاہیے تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو ملک حق خودارادیت کی بنیاد پر قائم ہوا ہو، اسے غیر مسلم دنیا میں بھی ان ریاستوں اور قوموں کی مدد کرنا چاہیے تھی جو آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے نیشنلزم کا تصور یہ تھا کہ کوئی قوم رنگ، نسل، زبان، شکل و شباہت کے اعتبار سے ایک وحدت میں ہو لیکن پاکستان کا قیام اس بات کا ثبوت ہے کہ نیشنلزم کے معنی یہ نہیں ہیں اور نیشنلزم جغرافیائی حدود کی بجائے نظریاتی حدود کے تابع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر واہگہ بارڈر کے پار رہنے والے رنگ' زبان اور شکل میں ہم سے مختلف نہیں لیکن نظریے میں شدید اختلافات کے سبب ہم اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم سمجھتے ہیں۔ یہی نظریاتی سرحدیں ہیں جن کی حفاظت پاکستان کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ بھارت سے فیڈریشن کی باتیں

کرتے ہیں، وہ دراصل ان ہی سرحدوں کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے اور ان کے ذہن میں نیشنلزم کا وہی پرانا تصور ہے جس کی بنیاد جغرافیائی سرحدوں پر ہوتی تھی۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک تو قائداعظمؒ نے بعض تقریریں ایسی کیں جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ پاکستان کوئی متعصب مذہبی سٹیٹ نہیں ہے۔ ان تقریروں کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہو رہا تھا فکری سطح پر اس کے لیے یہ جواز مہیا کیا جا رہا تھا کہ پاکستان مذہبی دیوانوں کی ریاست ہے اور چونکہ یہاں سب سے زیادہ ہندو اور سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا، اس لیے یہاں بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو ذبح کرنا ضروری ہے۔ قائداعظمؒ بار بار اس پراپیگنڈے کا جواب دیتے کہ ہم اقلیتوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے اور پاکستان مذہبی دیوانوں کی ریاست نہیں ہے۔ یہاں ہر مذہب کے لوگوں کو مکمل آزادی ہے۔ یہ تقریریں وقت کی ایک اہم ضرورت تھیں۔

لیڈروں یا سرکاری عہدہ داروں کی ایک کھیپ ابھر رہی تھی جس نے بھارت کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ایک شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ وہ غیر شعوری طور پر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان مذہبی دیوانوں کی ریاست نہیں ہے اور اس میں چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے اور نہ وہ سزائیں دی جائیں گی جنہیں تہذیب برا سمجھتی ہے۔ اس کھیپ میں پاکستانی سفیر خاص طور پر شامل تھے کیونکہ انہیں بین الاقوامی سطح پر پریس کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور پریس بھارت کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان سے ایسے سوالات ضرور پوچھتا تھا۔ چنانچہ اکثر سفیروں نے اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ پاکستان ہرگز مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا۔ یہ صورتِ حال پاکستان کے حق میں انتہائی مضر تھی کیونکہ دوسرے ممالک پر ہم پاکستان کے قیام کا مقصد ہی ثابت نہ کر سکے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر سفیر بنا کر بھیجا جاتا جو نظریۂ پاکستان سے بخوبی آگاہ ہوتے اور علمی سطح پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب دے سکتے اور حالات کا تجزیہ کر

کے ثابت کرتے کہ پاکستان مذہب کی بنا پر قائم ہونے کے باوجود دوسرے مذہب کی اقلیتوں سے کس قدر بہتر سلوک کرتا ہے اور بھارت سیکولر ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود برہمنی فسطائیت کا کس حد تک شکار ہے۔ بعض سفیروں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان نظریاتی ریاست نہیں، ماڈرن سٹیٹ ہے۔ اس طرح پاکستان کو بہت نقصان پہنچا اور کمزور وکالت کے سبب ہم بین الاقوامی سطح پر اپنے نظریے کو تسلیم نہ کروا سکے۔ میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ پاکستان کا حصول ہماری منزل نہیں تھا۔ ہمیں صرف مٹی ملی تھی۔ اس مٹی کو بہتر بنانا، اس کی زرخیزی کے لیے کوشش کرنا، اس میں بیج ڈالنا اور فصل پیدا کرنا ہمارا کام تھا۔ مسلم لیگ پارٹی نے اس موضوع پر قطعاً توجہ نہ دی اور اس لاپروائی کے نتائج اب پاکستان میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔

قائد اعظمؒ کی سوانح کا کام کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ بھارت میں گاندھی انسٹی ٹیوٹ بنا اور اس نے خاص ریسرچ کے بعد گاندھی پر کتابیں شائع کیں۔ اس طرز پر پاکستان میں بھی ایک انسٹی ٹیوٹ بننا چاہیے تھا جو اس موضوع پر رسالے، کاغذات اور دستاویزات جمع کر کے انہیں مرتب کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں اب تک جتنی جماعتیں برسر اقتدار آئیں، انہوں نے اس مسئلے پر توجہ نہیں دی۔

مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ نے ایک بار مجھ سے کہا کہ میں انہیں ایسا پروگرام مرتب کر کے دوں۔ اس میں مجوزہ کمیٹی کے ارکان کے نام بھی تھے جن میں بعض سے وہ ذاتی طور پر متنفر تھیں۔ انہوں نے مجھے منع کیا کہ وہ لوگ اس قابل نہیں ہیں۔ لیاقت علی خان نے البتہ اپنے دور اقتدار میں بولائتھو کو قائد اعظمؒ کی سوانح عمری لکھنے کا کام سپرد کیا۔ یہ ایک اچھی کتاب ہے مگر صحافتی انداز میں لکھی گئی ہے۔ زیادہ تجسس اور تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ اس کے علاوہ بولائتھو نے دانستہ طور پر لیاقت علی خان کے کردار کو ضرورت سے زیادہ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

باب سوم

قائداعظمؒ اور مسئلہ کشمیر

تحریک پاکستان اس لئے چلی کہ قائداعظمؒ جیسی حریت پسند شخصیت برصغیر میں موجود تھی اور جتنی ان کی سیاسی زندگی طویل تھی' اتنی طویل سیاسی زندگی کسی اور کی نہیں تھی۔ قائداعظمؒ کی سیاسی زندگی پورے برصغیر پر حاوی تھی۔ انہوں نے جو بات شروع کی' وہ یہاں سے شروع کی کہ ہم نے پورے برصغیر کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کروانا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ دیکھا کہ برصغیر میں ہندوستانی لوگ بطور قوم تسلیم نہیں کئے جاتے چنانچہ وہ یہ کہتے رہے کہ پہلے ہندو اور مسلمان دونوں کے درمیان مصالحت ضروری ہے۔ پھر یہ دونوں مل کر انگریز سے آزادی حاصل کریں گے لیکن انہوں نے دیکھا کہ ہندوؤں کے ذہن میں آزادی کچھ اور ہے اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ ہندو کم ظرفی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور ''اکھنڈ بھارت'' بنانا چاہتا ہے تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ برصغیر کو تقسیم کر دیا جائے اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے' وہ خطہ انہیں دے دیا جائے۔ سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مسلمانوں کا ملک ہے لیکن آئینی اور قانونی لحاظ سے جو شکل تھی' وہ یہ تھی کہ برصغیر میں ایک طرف تو گیارہ بڑے صوبے تھے جو انگریز کے زیر نگیں تھے' پانچ چھوٹے صوبے تھے جو کہ کمشنری کہلاتے تھے اور 512 ریاستیں تھیں۔ ان میں دس بارہ ریاستیں بڑی تھیں۔ ان کی آئینی پوزیشن تھوڑی سی پیچیدہ تھی۔ اس لحاظ سے کہ ہر ریاست کے ساتھ برطانوی حکومت کا ایک علیحدہ معاہدہ تھا۔ چنانچہ قائداعظمؒ نے پاکستان بنتے وقت ریاستوں کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی' وہ یہ تھی کہ ریاستوں کے جو حکمران ہیں' وہ آئینی طور پر تو خودمجاز ہوں گے کیونکہ 1947ء میں Indian Independence Act

کے پاس ہونے کے بعد تمام معاہدے ختم ہو گئے۔ ختم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ریاستیں خودمختار ہو گئیں۔ اس طرح کشمیر بھی خودمختار ہو گیا۔ قائداعظمؒ نے یہ فرمایا کہ جو ریاست آزاد رہنا چاہے وہ آزاد رہ سکتی ہے لیکن ان ریاستوں کے حکمرانوں کو ریاست کے عوام کی رائے اور احساسات اور جذبات کو پیش نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔ ریاست جموں وکشمیر پر جو جھگڑا پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ وہاں پر اختلاف رائے تھا۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ اس ریاست کو پاکستان میں شامل ہونا چاہئے۔ اس گروپ میں ہم لوگ تھے۔ دوسرا گروپ جس میں شیخ عبداللہ شامل تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ ریاست کا الحاق بھارت سے ہونا چاہئے۔ ان کی بات میں کتنی سیاست اور چالبازی تھی یہ وہی جانتے ہیں۔ دراصل شیخ عبداللہ کانگرس کے پراپیگنڈے سے متاثر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان چھ ماہ سے زیادہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ ان کا پراپیگنڈہ بہت زوردار تھا کیونکہ مسلمانوں کا اخبار سوائے ''نوائے وقت'' اور ''زمیندار'' کے اور کوئی نہیں تھا جبکہ ہندوؤں کے کانگرسی اخبارات بہت پراپیگنڈہ کر رہے تھے۔ مخلص لوگ بھی اس پراپیگنڈے کے دھوکے میں آ گئے لیکن حقیقت میں بات کچھ اور تھی۔ قائداعظمؒ کھرے اور سچے انسان تھے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جو بے بنیاد خیالی ہو۔ جب وہ یہ بات کرتے کہ انڈیا ایک ہونا چاہئے اور ہندو اور مسلمان سے برابر کا سلوک ہونا چاہئے اس وقت بھی وہ مخلص تھے اور جب انہوں نے کہا کہ پاکستان الگ ملک بنے گا اب ہمیں ہندو پر اعتماد نہیں اس میں بھی وہ مخلص تھے۔

شیخ عبداللہ بھی اس پراپیگنڈے کے اثر میں آ گئے اور بھارت کی طرف جھک گئے مگر کشمیر میں قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے ابتدا سے ہی ہر بات غلط ہوئی۔ جو کشمیر کا الحاق ہوا وہ بھی غلط تھا۔ ہری سنگھ پر دباؤ ڈال کر دستخط کروا لئے گئے۔ نہرو کو اس کا احساس تھا کہ یہ بات کتابوں میں آ چکی ہے۔ چنانچہ اس غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے بعد میں کہا گیا کہ ہم اس پر لوگوں کی رائے لیں گے اور اگر شیخ عبداللہ کہیں گے تو الحاق کریں گے لیکن میں

بحیثیت ایک کشمیری' ایک قانون دان اور ایک سیاست دان کے یہ سمجھتا ہوں کہ 26 اکتوبر 1947ء کومہاراجہ ہری سنگھ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ الحاق کر سکتا کیونکہ آدھی ریاست اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن یہ ہندوؤں کی ایک چال تھی جس میں وہ آ گیا۔ ہماری تو ابتدا ہی غلط ہوئی تو مسئلہ کیسے نہ بڑھتا۔ جب ہم نے کشمیر کا الحاق بھارت سے نہیں کیا تو کشمیر گیا کہاں؟ ہم کہتے ہیں کشمیر یہاں موجود ہے- اس کی علامتی حکومت یہاں موجود ہے۔ اس کو آپ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اس کو آپ اختیار نہیں دیتے۔ وہاں کہنے کو صدر بھی موجود ہے' عدالتیں بھی موجود ہیں' سب کچھ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کشمیر کے لوگ بات کو اٹھائیں لیکن کس کے ساتھ مل کر اٹھائیں۔ کون ان کا ساتھ دیتا ہے۔ اگر میں ذاتی طور پر ان کا ساتھ دیتا ہوں تو انٹیلی جنس والے میرے پیچھے لگ جائیں گے' مجھے غدار قرار دیں گے کیونکہ ہماری حکومت کی پالیسی تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔ ہم تعلقات بہتر بنانے کے درپے ہیں۔ اگر ہم مسئلہ کشمیر چھیڑیں گے تو جھگڑا ہوگا اور ہم کسی صورت جھگڑا مول لینا نہیں چاہتے اور پھر مسئلہ کیسے طے ہوگا یہاں تک کہ آزاد کشمیر ریڈیو سے بھی کشمیر کی تحریک کا پراپیگنڈہ بند ہو گیا۔ یہ بڑی افسوس ناک بات ہے۔ اب کشمیری عوام کہتے ہیں کہ پاکستان کچھ کرے گا۔ جب کہ پاکستان یہ کہتا ہے کہ کشمیری خود کچھ کریں۔ یہ مسئلہ درمیان میں لٹکا رہے گا۔ خدا جانے! حکومتِ پاکستان کی کیا پالیسی ہے۔ یہ مسئلہ کب اور کیسے حل ہوگا؟

بھارت ہر طرح کا جمہوریت کش رویہ اپنے لئے اپناتا ہے۔ آسام کے مسلمان کا مسئلہ ہو یا میزو قبائل کے حق خود ارادیت کی جدوجہد کا مسئلہ ہو' آسام ہو یا بھوٹان ہو یا بنگال کے کسی مسلمان یا پنجاب کے سکھ کا مسئلہ ہو' بھارت کی جمہوریت کے لئے یہ سب چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔ وہ اقلیت کے حقوق کو ترجیح نہیں دیتے' ہندو اکثریت کے مفادات کا تحفظ ہی ان کی اوّلین ترجیح ہے۔ پنجاب میں وسیع ترکشت وخون کے بعد اب کشمیر کی باری

آئی ہے۔نہرو اگر کچھ عرصہ زندہ رہتا تو ممکن ہے بھارت کی پالیسی میں کچھ تبدیلی آتی کیونکہ چین نے نیفا کے محاذ پر جب بھارت کے خلاف جوابی کارروائی کی تو بھارت نے محسوس کیا کہ یہ معاملات اتنے آسان نہیں ہوتے جیسا کہ حیدرآباد جونا گڑھ اور کشمیر کا تھا۔ ان تلخ حقائق کو دیکھ کر ہی پنڈت نہرو پاکستان آئے۔پھر انہوں نے شیخ عبداللہ کو پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔اس سے ان کی خواہش تھی کہ کشمیر کے معاملے میں پاکستان سے کوئی سمجھوتہ کرلیا جائے۔مگر افسوس نہرو کو زندگی نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس سلسلے میں فیصلہ کن بات چیت کرسکتے۔نہرو کے بعد بھارت کی سیاست بہت چھوٹے قد کاٹھ کے لوگوں کے ہاتھ آگئی جو بھارت پر حکومت کرنے کی مہم جوئی کو اپنا مقصد حیات بنا چکے تھے۔

جہاں تک کشمیر کی آزادی کا تعلق ہے میرے خیال میں یہ کہنا غلط ہے کہ مسلم لیگ یا پاکستان کی حکومت کشمیر کی آزادی یا کشمیر سے الحاق کے بارے میں واضح پالیسی اختیار نہ کرسکی۔حکومت کی پالیسی بالکل واضح تھی اور خود بانئ پاکستان قائداعظمؒ نے چند اقدامات کئے تھے۔پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ بغیر کسی لڑائی جھگڑے یا کسی خون خرابے کے اگر مہاراجہ ہری سنگھ کو بھی اس بات پر قائل کرلیا جائے کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے ہونا ہی ریاست کے مفاد میں ہے تو یہ معاملہ خوش اسلوبی اور پرامن طریقے سے طے پا جائے گا۔ چنانچہ اس کے واسطے قائد نے کوشش کی۔جب بھی ایسا ہوا ہری سنگھ کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔پہلی بار جب 1944ء میں وہ کشمیر گئے تو ہری سنگھ سے انہوں نے ملنے کی کوشش کی۔ہری سنگھ برطانیہ کے دورے پر گیا ہوا تھا۔واپسی پر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے ملنے سے انکار کردیا۔جب پاکستان بن گیا تو قائداعظمؒ نے اپنے ملٹری سیکرٹری کرنل برنی کو یہاں بھیجا تاکہ مہاراجہ کے ساتھ ملاقات کرے اور قائد کے کشمیر جانے کا بندوبست کرے۔کشمیر کی حکومت نے اس کو ٹال دیا کہ وہاں امن عامہ کی صورت خراب ہوجائے گی۔اس قسم کے بہانے بنانے لگے۔بہرحال قائداعظمؒ کی یہی کوشش تھی کہ

چونکہ راجوں مہاراجوں کو برطانوی قانون کے تحت یہ حق حاصل تھا کہ وہ الحاق کر سکتے تھے' اس لئے قائد کی یہ بھی کوشش تھی کہ آئینی طریقے سے پرامن طریقے سے کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر دیا جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

اس کے بعد قائد کی دوسری کوشش یہ تھی کہ حکومت پاکستان کو کشمیر کے سلسلے میں اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس دوران آپ جانتے ہیں کہ کشمیر میں ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اس بغاوت کی حمایت میں پاکستان سے قبائلی علاقوں سے رضا کار آزاد کشمیر میں پہنچ گئے۔ اس وقت بھی قائداعظمؒ نے یہ پیش کش کی تھی بلکہ لیاقت علی خان کو یہ نصیحت کی تھی کہ چونکہ ہندوستان کی فوج ریاست میں آ گئی ہے' اس لئے ضروری ہے کہ طاقت کا جواب طاقت سے دینے کیلئے پاکستان اپنی فوج استعمال کرے۔

بہرحال میرا کہنے کا یہ مطلب ہے کہ جیسی بھی صورت حال تھی' اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت پاکستان وقتاً فوقتاً کشمیر کے حصول کے لئے اپنی مختلف پالیسیاں وضع کرتی رہی۔ مگر بدقسمتی سے قائداعظمؒ کی وفات کے بعد جب یہ معاملہ یو-این-او میں تھا' وہاں بھی پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ نے کشمیر کے لئے کوشش کی اور یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوؤں نے بھی تسلیم کیا کہ چوہدری ظفر اللہ جیسا وکیل یہاں نہ ہوتا تو شاید پاکستان کا موقف بھی یو-این-او میں تسلیم نہ کیا جاتا۔ یہ تیسری کوشش تھی جو پاکستان نے کی اور کم از کم اصولی طور پر اس کو مان لیا گیا کہ ریاست کے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں اور ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں وہاں سے نکالی جائیں۔ سوال یہ ہے کہ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو پاکستان کی حکومت اس فیصلے پر عمل درآمد کیوں نہ کرا سکی۔ یہ ایسی بات ہے جیسے کسی پراپرٹی کا جھگڑا ہو اور عدالت میں پراپرٹی کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے اور اسے ڈگری مل جائے مگر وہ اس پر عملدرآمد نہ کرا سکے۔ بدقسمتی سے بعد کی جو حکومتیں آئیں' ان میں اتنی قابلیت نہ تھی کہ وہ یو-این-او کی قرارداد پر عمل درآمد کرنے کے لئے ہندوستانی

حکومت کی چالوں کا مقابلہ کرسکتی ۔بہر حال حکمت عملی جیسی بھی تھی' تھوڑی بہت تھی ۔

1946ءمیں جب پاکستان کی منزل قریب تھی تو ان لمحات میں مسلم کانفرنس کے علاوہ بھی بے شمار ایسے نوجوان اور سیاسی گروپ تھے' مسلم لیگ بھی تھی جس کے سربراہ پروفیسر عبدالعزیز تھے اور علی گڑھ کے پڑھے لکھے نوجوان جو ریاست جموں وکشمیر میں واپس آرہے تھے' وہ پاکستان کی تحریک اور قائداعظمؒ کی قیادت سے خاصے متاثر تھے ۔پھر اس کے علاوہ مسلم سٹوڈنٹس یونین جو ہم نے قائم کی تھی' اس میں نوجوان عناصر جن کا تعلق مسلم کانفرنس کے ساتھ تو تھا لیکن وہ بہر حال ایک آزاد تنظیم تھی ۔ ان سب کا مقصد یہ تھا کہ ریاست کو آزاد کرایا جائے اور لوگوں کی مرضی سے اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہو۔اس دوران حقیقت تو یہی ہے کہ ریاست میں بڑی سیاسی جماعت مسلم کانفرنس ہی تھی جو کہ ریاست کے پاکستان سے الحاق کی بات کرتی تھی ۔ اگر چہ اس سے پہلے خود مسلم کانفرنس نے الحاق کی مخالفت کی تھی جب وہ نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہوگئی تھی ۔وہ الگ قصہ ہے ۔

اس وقت جذباتی سیاست کو چھوڑ کر ایک ایسی بالغ نظر اور دور اندیش قسم کی رہنمائی کی ضرورت تھی جو سیاسی افق پر ہونے والے تغیر وتبدل کو اچھی طرح سمجھ سکے ۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ چودھری غلام عباس جن کا میرے دل میں بہت احترام ہے' ان کی بڑی قربانیاں بھی ہیں انہوں نے ریاست میں مسلمانوں کے لئے بڑا کام بھی کیا۔ ان دنوں بین الاقوامی سیاست میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور انگریز کی پالیسی کے اندر تبدیلی واقع ہو رہی تھی' تحریک پاکستان جس تیزی سے چل رہی تھی' میرے خیال میں چودھری صاحب کو ان معاملات کا پوری طرح ادراک نہیں تھا اور وہ ان کے تمام پہلو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے تھے ۔ اس غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے 1946ءمیں ڈائریکٹ ایکشن تحریک شروع کی تو اس سے پہلے وہ شملہ میں قائداعظمؒ سے ملاقات کرنے آئے اور ان کا مقصد تھا کہ میں قائد سے اس تحریک کی حمایت میں کوئی بیان جاری کروادوں یا کوئی اجازت

ان سے لوں۔ چودھری صاحب کے ساتھ اے آر ساغر بھی تھے۔ جو ان دنوں مسلم کانفرنس کے سیکرٹری جنرل تھے۔ میری بھی ساغر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان دنوں بالکل نوعمر تھا اور میرا کوئی سیاسی تجربہ بھی نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ لگتا ہے کہ انگریز ہندوستان سے جا رہے ہیں اور انگریز کے ہندوستان سے جانے کے بعد انشاء اللہ پاکستان بن جائے گا۔ ایسے وقت میں یہ تحریک چلا کر جیل میں جانا بے وقت کی راگنی ہوگی۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ قائداعظمؒ سے وقت طلب کر سکتے ہیں۔ قائد نے انہیں نہایت وضاحت سے سمجھایا کہ آپ کو اس سے بہتر کوئی موقعہ نہیں مل سکتا کہ آپ ریاست کے اندر مسلم کانفرنس کو مضبوط کریں اور ریاست کے اندر تحریک کو پھیلائیں۔ قائداعظمؒ کے الفاظ یہ تھے کہ تمہارے دو دشمن ہیں: ایک شیخ عبداللہ دوسرا مہاراجہ ہری سنگھ۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ یہ دونوں دشمن اس وقت لڑ رہے ہیں کیونکہ شیخ عبداللہ نے اس وقت کشمیر چھوڑ دو تحریک (Quit Kashmir Movement) چلا رکھی تھی۔ اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا۔ جب کانگرس نے انگریز کے خلاف ہندوستان چھوڑ دو تحریک (Quit India) شروع کی تو میرے دو دشمن آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں نے اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم کی۔ تمہارے لئے بھی یہ موقع ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ایجی ٹیشن (agitation) شروع کرو، تم بھی اپنی تنظیم پر توجہ دو، عوام میں جاؤ اور علاقے میں پھیل جاؤ۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا میرے خیال میں شیخ عبداللہ تمہارے لئے کوبرے (cobra) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واسطے اگر اس وقت تم نے اس کی حمایت میں تحریک شروع کی تو دشمن کو مضبوط کرو گے اور تحریک کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

چودھری غلام عباس قائداعظمؒ کی بات مان گئے لیکن کشمیر پہنچ کر جو وہاں کے مقامی حالات تھے وہ دیکھنے کے بعد انہوں نے یہی کہا کہ ایجی ٹیشن شروع کرنا ہے۔ اکتوبر میں ایک جلسہ بلایا، قانون کی خلاف ورزی کی۔ بدقسمتی سے ایجی ٹیشن بھی نہ چل سکی کیونکہ اس

میں صرف 5 یا 6 آدمی گرفتار ہوئے اور یہ کوئی تحریک نہ بن سکی۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نفسیاتی طور پر کوئی موقع نہیں تھا۔

ہری سنگھ کو اس سے بہتر موقع تو مل ہی نہیں سکتا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہوئی کہ شیخ عبداللہ کی تحریک تو کسی طور پر چل ہی رہی تھی اگرچہ وہ زیادہ زوروں پر نہیں چل رہی تھی لیکن مظاہرے بھی ہوجاتے تھے۔گرفتاریاں بھی ہوجاتی تھیں۔کچھ لوگ انڈر گراؤنڈ چلے گئے۔ کانگرس اور ہندوستان کا سارا پریس ان کی پشت پر تھا۔اس کا ایک نفسیاتی پروپیگنڈا تھا۔ اس میں تعصب بہت زیادہ تھا۔ یوں کشمیر چھوڑ دو تحریک بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ چودھری غلام عباس کی تحریک کا زیادہ اثر نہیں تھا اور ہری سنگھ کو یہ موقع ملا کہ اس کے دو بڑے دشمن اس کے قابو میں آ گئے۔اس نے انہیں نظر بند کردیا۔اس کے بعد جب پاکستان بنا تو اس نے اپنی مرضی سے شیخ عبداللہ کو رہا کیا جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا کہ شیخ عبداللہ نے معافی مانگی اور اسے رہا کیا گیا۔ چودھری صاحب بعد میں رہا ہوئے لیکن اس سے ہماری تحریک آگے نہ بڑھ سکی۔

اکتوبر 1947ء میں جب میں کراچی سے روانہ ہوا قائداعظمؒ سے میری آخری ملاقات 30 ستمبر 1947ء کو ہوئی۔قائداعظمؒ نے مجھے کہا "مہربانی کر کے کشمیر میں ہمارے لیڈروں کو بتادو کہ میں مہاراجہ کے لئے کوئی مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ پرسکون رہیں اور ہم بعد میں صورت حال جیسی بھی ہوگی نپٹ لیں گے۔یہی صورت حال تھی اور اسی دوران انہوں نے اپنے ملٹری سیکرٹری کرنل بل برنی کو سری نگر میں بریگیڈیئر سکاٹ کے ساتھ ملاقات کے لئے بھیجا جو اس وقت مہاراجہ کی افواج کے سربراہ تھے۔سکاٹ کو مطلع کیا کہ قائداعظمؒ کشمیر آنا چاہتے ہیں۔اسی دوران قبائلیوں کا حملہ ہوگیا۔

اس سے کچھ عرصہ قبل کشمیر کی حکومت نے شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا تھا مگر چودھری غلام عباس اور ان کے رفقاء ابھی تک جیلوں میں تھے۔حکومتِ کشمیر کے

اعلان میں بتایا گیا تھا کہ چند دنوں تک مزید قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ قائد اعظمؒ نے اس توقع کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ چودھری غلام عباس، مسٹر اے آر ساغر اور مسلم کانفرنس کے دیگر رہنماؤں کو رہا کر دیں۔ تاہم حکومتِ کشمیر نے مسٹر ساغر اور مولوی نور دین کو عارضی طور پر پیرول پر رہا کرنے کا حکم دیا۔ کشمیر میں جیل کاٹنے اور قبائلیوں کے ریاست پر حملے اور آزاد کشمیر کی تشکیل کے واقعات کے بعد جب میں رہا ہو کر پاکستان آیا تو لاہور میں نواب لیاقت علی خان سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں نے بطور خاص سوال کیا کہ ایک ماہ کی رخصت پر کشمیر جانے سے ایک روز پہلے 30 ستمبر 1947ء کو میں نے قائد اعظمؒ سے الوداعی ملاقات کی تھی۔ انہیں اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پاکستانی قبائلیوں اور رضا کاروں کی مدد سے کشمیری حریت پسند جنگ آزادی کا آغاز کر دیں گے۔ یہ سن کر لیاقت علی خان نے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ نہ بولے۔ میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ خود انہیں بھی پہلے سے اس کا علم نہیں تھا۔ اس کارروائی کی اطلاع 22 اکتوبر کو قبائلی رضا کاروں اور کشمیری حریت پسند لیڈروں کے حملے کے بعد دی گئی۔ سردار عبد الرب نشتر اور غلام محمد سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ سے ملنے کے لیے کراچی پہنچا۔ وہ اس وقت فلیگ سٹاف ہاؤس میں منتقل ہو چکی تھیں۔ ابھی تک سیاہ ماتمی لباس پہنا ہوا تھا جو انہوں نے ایک سال کے بعد اتارا۔ گزشتہ واقعات، خصوصاً قائد اعظمؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ آخر دم تک قائد اعظمؒ کو کشمیر کی فکر دامن گیر تھی۔ آخری روز جب ان کی حالت بگڑ گئی اور انہیں کراچی لانے کا فیصلہ کیا گیا تو وہ تقریباً بے ہوش تھے لیکن اس نیم بے ہوشی میں بھی ان کے ذہن پر کشمیر چھایا ہوا تھا۔ انہوں نے چند جملے کہے جو واضح طور پر سنائی نہ دیے لیکن ایک بات صاف تھی کہ ''کشمیر کمیشن والوں نے مجھ سے ملنے آنا تھا۔ نا معلوم کیوں نہیں آئے''۔

جب میں کشمیر سے واپس آیا تو میری اس سلسلے میں محترمہ فاطمہ جناحؒ سے بڑی

طویل بات ہوئی ۔قائداعظمؒ کے خیالات بڑے واضح تھے۔انہیں یقین تھا کہ کشمیر ہر حالت میں پاکستان کا ایک حصہ بنے گا لیکن لیاقت علی خان بس نہ پکڑ سکے۔ جب سری نگر میں ہندوستانی افواج پہنچیں تو ان کا خیال تھا کہ پاکستانی افواج بھی فوراً وہاں بھجوادی جائیں لیکن ان دنوں فوج مشترکہ کمان کے زیر اثر تھی۔آ کنلیک سپریم کمانڈر تھا اور جنرل گریسی پاکستان آرمی چیف تھا۔گریسی نے کہا کہ برطانوی افواج دوسری طرف برطانوی افواج سے نہیں لڑیں گی' اس لئے اس کے لئے افواج بھجوانا ممکن نہیں تھا۔

قائداعظمؒ نے لیاقت علی خان سے کہا" آپ پرائم منسٹر ہیں۔آپ کا فرض ہے کہ حالات کے مطابق صورت حال سنبھالیں ورنہ آپ بس نہ پکڑ سکیں گے۔اس لئے کچھ کریں"۔میرے خیال میں قائداعظمؒ نے اس مسئلے کو کافی سنجیدگی سے محسوس کیا اور یہ چیز انہیں بستر مرگ پر بھی پریشان کرتی رہی۔محترمہ فاطمہ جناحؒ نے مجھے بتایا کہ جب قائداعظمؒ کے آخری لمحات تھے تو انہوں نے کہا"کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے ڈیلی گیشن نے مجھ سے ملنے آنا تھا' ابھی تک نہیں پہنچے"۔اصل میں کسی کو نہیں آنا تھا۔کوئی ایسی ملاقات متوقع نہیں تھی لیکن بیماری کے دوران جب وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے' اس وقت بھی ان کے اعصاب پر کشمیر سوار تھا۔

میں خود حیران تھا کہ اگر قائداعظمؒ کے پاس ایسا کوئی پروگرام ہوتا تو وہ مجھے ضرور مطلع کرتے کیونکہ انہوں نے مجھے کشمیری لیڈروں کے نام چند ضروری پیغامات دے کر بھیجا تھا۔مجھے یقین ہے کہ انہیں اس حملے کا علم نہیں تھا اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، چند سابق فوجیوں، سرکاری افسروں، سابق سرکاری افسروں، مسلم لیگ کے رضا کاروں کے ایک ناظم، سرحد کے گورنر خان قیوم کے چند حاشیہ نشینوں نے مل کر اس منصوبے کو بنایا اور سرحد کے قبائلیوں کی مدد سے آزاد کشمیر کے راستے سری نگر کا رخ کیا۔حملہ آوروں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔بعض تو دل سے کشمیر کی آزادی چاہتے تھے تو بعض مال غنیمت کے شوق

میں گھر سے نکلے تھے۔ راولپنڈی میں دو اعلیٰ سرکاری افسر جو شاید کشمیر کو حلوے کی پلیٹ سمجھتے تھے، آپس میں اس بات پر جھگڑنے لگے کہ سری نگر میں مہاراجہ کا محل ان میں سے کس کے حصے میں آئے گا۔

جن لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا وہ کشمیر کے جغرافیائی حالات تک سے واقف معلوم نہیں ہوتے تھے۔ پھر انہوں نے جانے یہ کیوں سمجھ لیا کہ غیر تربیت یافتہ رضا کاروں کی مدد سے وہ ایک باقاعدہ ریاست سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کشمیر کے جس حصے میں سری نگر واقع ہے، مقامی لیڈروں کو اس حملے کی خبر تک نہ تھی۔ یہ غلط منصوبہ بندی نہیں تو اور کیا ہے۔ مسلمہ کشمیری لیڈروں کو اعتماد میں لے کر حملہ کیا جاتا اور باقاعدہ تیاری ہوتی تو اس کے نتائج بہت بہتر ہوتے۔ سب سے بڑی غلطی انہوں نے یہ کی کہ غلط سمت سے حملہ کیا گیا۔ کشمیر سے پاکستان کو جانے والی ساری سڑکیں پختہ تھیں۔ اس کے برعکس بھارت کو صرف ایک راستہ جاتا تھا۔ اگر سب سے پہلے سپلائی لائن کاٹ دی جاتی تو کشمیری باشندے بھی اس جدوجہد میں شریک ہو سکتے تھے کیونکہ راجہ کو بھارت سے فوجی امداد نہیں آسکتی تھی۔ لیکن یہاں ہوا یہ کہ سپلائی لائن کھلی ہے اور دھڑا دھڑ بھارت سے تازہ فوج آرہی ہے۔ اس کمک کی موجودگی میں اور بالخصوص کشمیری قیادت کو اعتماد میں لیے بغیر کامیابی کی توقع کیوں کر کی جاسکتی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے مسلم عوام کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا ضروری تھا۔ ان کے لیے حملہ آوروں کی مدد کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ باہمی اعتماد کی فضا موجود نہ تھی۔ نہ پہلے سے کسی طرح کی تیاری تھی۔ پھر جب باقاعدہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکے تو بھارتی فوج پاکستان کی سرحدوں کے قریب آ پہنچی تو مجبوراً پاکستان کو حفاظت کے طور پر پوزیشن لینا پڑی۔ اس طرح کشمیر کے بعض اضلاع بھارت کے قبضے میں نہ آسکے۔

باب چهارم

خورشید کی کہانی

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی' ان دنوں میں کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے پہلے ہی ملکی اور بین الاقوامی حالات کی معلومات حاصل کرنے کا شوق تھا۔ جنگ کے بعد یہ جذبہ اور بڑھ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ہی برصغیر میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ بھی ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ علاوہ ازیں تحریکِ آزادیٔ برصغیر سے کوئی نوجوان الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ بنیادی طور پر مجھے انسانیت اور عالمی انسانی اقدار نیز انسانی برادری پر اعتقاد تھا اور میری گہری دلچسپی ان چیزوں سے وابستہ تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد مسلم لیگ نے قراردادِ پاکستان منظور کی تو میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے برصغیر کی آزادی کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ ان ہی بنیادوں پر تھا کہ آخر کار ہم مسلمانوں کو بھی اپنی مذہبی روایات اور دینی عقائد پر عمل کرنے اور اپنے مستقبل کا خاکہ مرتب کرنے کا بنیادی انسانی حق اسی طرح حاصل ہے جس طرح دوسری قوموں کو۔ دراصل کشمیر میں ہم لوگ ایک لحاظ سے دوہری غلامی میں تھے۔ ایک برطانوی حکومت اور دوسری مہاراجہ کی آمریت۔ چنانچہ اس وقت جو ہمارے جذبات تھے اور محسوسات تھے' ان کے مطابق اس آزادی کو حاصل کرنا باقی تمام مقاصد پر فوقیت رکھتا تھا اور اس فیصلے کے تحت میں نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی۔

سیاسی میدان میں میرا پہلا عملی قدم وہ تھا جب میں نے سری نگر میں سری پرتاب کالج میں جہاں میں اس وقت طالب علم تھا' ایک جلسے سے خطاب کیا۔ یہ 1941ء کے آخر کی بات ہے جب ہم نے کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس وقت میری عمر تقریباً 18 سال تھی۔ ان دنوں ریاست کشمیر میں قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے

والی کوئی تنظیم نہ تھی کیونکہ اس وقت مسلم کانفرنس نے خود کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر لیا تھا اور وہ جماعت متحدہ ہندوستان کی حامی تھی۔ مسلم سٹوڈنٹس یونین وہ پہلی جماعت تھی جس نے کشمیر کے اندر تحریکِ پاکستان کی حمایت کرنے کا کام شروع کیا۔ ہم نے کالج کی گراونڈ میں طلبہ کا ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسہ میں تقریباً سو کے قریب طلبا شامل ہوئے۔ یہاں میں نے اپنی زندگی کی پہلی سیاسی تقریر کی۔ میرے دوستوں اور ساتھیوں نے مجھے اس تقریر پر خراجِ تحسین پیش کیا کہ میں نے پاکستان کی حمایت میں زوردار دلائل پیش کر کے تحریکِ پاکستان کے موقف کو طلبہ کی اکثریت سے تسلیم کروایا ہے۔ میرے لئے وہ دن بہت یادگار اور مبارک تھا کہ میں نے قیامِ پاکستان کی حمایت سے اپنی عملی سیاست کا آغاز کیا تھا۔

1942ء میں مسلم کانفرنس دوبارہ معرضِ وجود میں آ چکی تھی۔ اس جماعت نے قیام پاکستان کے موقف کی حمایت بھی شروع کر دی تھی۔ اس جماعت سے ہم خیالی کے باوجود میں کبھی بھی اس دور میں اس کا باقاعدہ رکن نہ بن سکا۔ جب میں نے قائداعظمؒ کے ساتھ ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا تو سب سے پہلے بمبئی سٹی مسلم لیگ کی وارڈ کا بنیادی رکن بنا یہ نومبر 1944ء کی بات ہے۔ گویا طالب علمی کے زمانے کے دور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے میں نے اپنی عملی سیاست کا آغاز کیا۔ اس وقت میری سوچ یہ تھی کہ برصغیر اور ریاست کشمیر کے مسلمانوں کو اس دور میں جن پریشان کن حالات کا سامنا تھا' ان حالات میں کوئی اجتماعی فیصلہ کیا جانا چاہئے۔ انگریزوں کے خلاف تحریکِ آزادی سے ہم پوری طرح متفق تھے لیکن مسلمان قوم کو درپیش مسائل کے حوالے سے پاکستان کا تصور ہمارے لئے بہت کشش کا حامل تھا۔ اس تصور کو سامنے رکھتے ہوئے کہ برصغیر کے مسلمانوں کا اپنا ایک آزاد اور خودمختار ملک ہوگا' میں نے قیام پاکستان کی واحد علمبردار جماعت مسلم لیگ میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

جن تقاضوں کے پیشِ نظر میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا تھا' اگر ان قومی

تقاضوں کا آج بھی تجزیہ کیا جائے تو مجھے اپنا فیصلہ درست معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ جب شیخ عبداللہ کی جماعت بھرپور طریقے سے کانگرس کا ساتھ دے رہی تھی' میں نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں اپنا عملی کردار ادا کیا۔ میری سیاست میں بعد ازاں نشیب و فراز بھی آئے لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ سیاست میں آ کر میں نے کوئی غلط قدم اٹھایا تھا۔

1944ء میں جب میں قائداعظمؒ کے ساتھ بمبئی گیا تو اس وقت سے لے کر پاکستان بننے تک گھر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بدقسمتی سے جس روز پاکستان بنا' مجھے سخت تیز بخار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں 14 اگست کی تقریبات میں شریک نہ ہو سکا۔ میں نے ستمبر 1947ء میں قائداعظمؒ سے درخواست کی کہ میں ایک ماہ کے لئے گھر جانا چاہتا ہوں۔ پہلے تو انہوں نے انکار کر دیا لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد ہری سنگھ کی حکومت نے شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا۔ قائداعظمؒ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ انہوں نے شیخ عبداللہ کو چھوڑ دیا ہے۔ کیا چودھری غلام عباس کو بھی چھوڑ دیں گے اور مسلم کانفرنس کے دوسرے لیڈروں کو بھی؟ میں نے کہا میرا خیال ہے کہ نہیں چھوڑیں گے۔ قائداعظمؒ نے کہا نہیں' ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ اس وقت دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کرے اور دونوں کو چھوڑ دے اس وقت میں نے پھر قائداعظمؒ سے کشمیر جانے کی اجازت مانگی جو انہوں نے مجھے دے دی۔

اگرچہ میں رخصت پر تھا مگر قائداعظمؒ نے مجھے دو ایک کام بھی دیئے۔ ان میں سے ایک پیغام بھی تھا جو مسلم کانفرنس کے لیڈروں کے لئے تھا۔ میں نے بڑا خطرہ مول لیا۔ آغا شوکت علی اور مولوی نوردین سے جیل میں جا کر ملا اور قائداعظمؒ کا پیغام دیا۔ دوسرا کام یہ تھا کہ وہاں کے سیاسی حالات کے متعلق قائداعظمؒ کو رپورٹ پیش کروں۔ اس کے علاوہ کوئی اور خفیہ مشن یا کوئی اور پروگرام نہیں تھا۔

جب میں سری نگر میں تھا تو میں بخشی غلام محمد سے تین بار ملا۔ اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں کراچی واپس جاؤں اور قائداعظمؒ سے کہوں کہ مسلم کانفرنس کے لیڈروں چودھری غلام عباس' میر واعظ محمد یوسف اور دوسرے تمام کشمیر کے مسلمانوں کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ شیخ عبداللہ اور ان کے حامی ہی اصل کشمیریوں کے نمائندہ ہیں۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے میں آپ کا پیغام دوں گا لیکن یہ یک طرفہ فیصلہ ہے۔ آپ کا کیا موقف ہوگا اور آپ کو اگر لیڈر سمجھ بھی لیا جائے تو آپ کی پالیسی کیا ہوگی''۔ اس نے کہا ''ہم سب مسلمان ہیں'' میں نے کہا ''میں مسٹر جناح سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ایک ایسی تجویز لایا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ دیں' مسلم کانفرنس کو چھوڑ دیں' اپنی پارٹی چھوڑ دیں صرف اس یقین دہانی پر کہ نیشنل کانفرنس کے تمام لیڈر مسلمان ہیں''۔

1947ء میں جب میں کشمیر گیا تو حکومت نے جاتے ہی مجھے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کر لیا اور کچھ عرصہ سری نگر جیل میں رکھنے کے بعد رام نگر کے دور افتادہ قلعہ میں بھیج دیا۔ آزاد کشمیر کی صدارت کے دوران میر نور محمد کاشمیری نے ایک دلچسپ مضمون ''آزاد کشمیر کے موجودہ صدر قلعہ رام نگر میں'' لکھا تھا۔ نور محمد نے لکھا کہ ''ہم نے 40 میل کا پہاڑی سفر پیدل 8 گھنٹے میں طے کیا تھا۔ مسلح ڈوگرہ سپاہی ساتھ تھے اور اس پہرے میں گھنٹوں بھوکے پیاسے سنگین دشوار گزار پہاڑی راستوں پر چلتے رہے تھے۔ تحصیل رام نگر سری نگر سے 180 اور اودھم پور سے 40 میل دور ہے۔ اودھم پور سے رام نگر تک کی مسافت ایک صبر آزما امتحان سے کم نہ تھی کیونکہ یہ سارا راستہ پہاڑوں پر سے جاتا ہے۔ اس دشوار گزار راستے کو چلچلاتی دھوپ میں پیدل طے کرنا مذاق نہ تھا بہرکیف سارا دن چلنے کے بعد ہم سورج غروب ہوتے وقت ''جگالو'' پہنچے جہاں ہمارے لئے ٹھہرنے کا انتظام ایک ہندو ذیلدار کے گھر کیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ حاجی جلال الدین کی معیت باعثِ رحمت ثابت ہوئی کیونکہ حاجی صاحب خود ایک پرگنہ کے ذیلدار تھے' اس

لئے صاحبِ خانہ نے ہماری کافی آؤ بھگت کی۔ ''جگالو'' کافی بلندی پر واقع ہے اور یہاں مغل بادشاہوں کے زمانے کا ایک قلعہ بھی موجود ہے جو دور سے نظر آتا ہے۔

فجر ہوتے ہی ہم یہاں سے چل پڑے اور تپتی دھوپ میں دن بھر چلتے چلتے ہم بالآخر چھ بجے شام اس مہیب اور بھیانک منزل کے قریب پہنچے جس کے لئے ہمیں کئی روز سے طرح طرح کے مصائب اور آلام کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ رام نگر کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہماری نظریں اس نئے مسکن کی تلاش میں دوڑیں جو ڈوگروں کے عہد ماضی کا ایک ایسا نشان تھا کہ شکستہ ہونے پر بھی کشمیر کے حریت پسندوں کو پابہ جولاں کرنے کا سبب بنا۔ قلعہ کی بیرونی صورت اس قدر ڈراؤنی اور ہیبت ناک تھی کہ اس کے اندر جانے کے تصور سے ہی انسان لرزہ براندام ہو جاتے۔ اسے دیکھ کر یہ خیال یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ اس میں بھوت پریت' سانپ اور اژدھے آباد ہوں گے۔ درحقیقت نیشنل کانفرنس حکمران اقتدار کے نشے میں اندھے ہو گئے تھے وگرنہ انہیں ذرا بھی انسانیت یا اخلاقی اقدار کا پاس ہوتا تو وہ ہمیں قید و بند کی حالت میں اس بدترین مقام پر نہ بھیجتے۔

جونہی ہم قلعہ کے نزدیک پہنچے' انسپکٹر پولیس نے ہمیں بیٹھ جانے کا حکم دیا اور خود قلعہ کے جنوبی دروازے کی جانب بڑھا۔ جہاں دو پولیس کانسٹیبل رائفلیں کندھوں پر رکھے پہرہ دے رہے تھے۔ اس اثنا میں چند راہ گیر ہمارے پاس آ کر رکے اور ہم سے عجیب و غریب استفسار کرنے لگے۔ ایک نے پوچھا ''کیا تم لوگوں نے ڈاکہ مارا ہے جو تمہیں اس خطرناک قلعہ میں بند کیا جا رہا ہے؟''۔ دوسرا بولا ''نہیں یہ تو قوالی (قبائلی) ہیں۔ یہ لوگ ہمارے ڈوگرہ دیش پر قبضہ کرنے آئے تھے لیکن ہماری فوج نے ان پر قبضہ کر لیا''۔

ان جاہل مطلق ڈوگروں میں سے ایک حیوان صفت شخص نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا ''اندر جا کر ان لوگوں کو ناگ دیوتا چٹ کر جائیں گے۔ ان میں ایک بھی زندہ باہر نہ آ سکے گا''۔ اس پر میں نے گارڈ کے ایک ڈوگرہ سپاہی سے نہایت انکسار کے ساتھ پوچھا ''کیا

اس قلعہ میں ناگ دیوتا رہتے ہیں' وہ ہنستے ہوئے بولا'' اس میں ناگ دیوتا' بچھو سبھی کچھ ہے''۔ سپاہی نے مجھے بتایا کہ ''تحصیل رام نگر میں جہاں کہیں سانپ نظر آئے تو اسے ہندو لوگ دیوتا سمجھ کر مارنے کی بجائے زندہ پکڑ کر اس قلعہ کے اندر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ سلسلہ برس ہا برس سے قائم ہے''۔ یہ سن کر مجھے گمان ہوا کہ شاید موت ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ ذرا تامل کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی اس حوصلہ شکن حقیقت سے آگاہ کیا تو اس پر خورشید صاحب کہنے لگے ''میاں اگر قدرت نے ہماری موت اسی ڈھنگ سے لکھی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ رہا ہم پر سانپ اور بچھوؤں کے ٹوٹ پڑنے کا' سو ہم بھی آخر آدمی ہیں اگر حوصلہ رکھیں تو ہم انہیں ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ وہ بھی تو آدمی ہی ہوتے ہیں جو سانپوں اور بچھوؤں کو اپنا مطیع بنا لیتے ہیں''۔ خورشید صاحب کی اس دلیرانہ گفتگو سے ہم لوگوں کو کچھ حوصلہ ہوا اور ہمارے ذہنوں سے ان بلاؤں کا خوف بھی جانے لگا۔

غرض ہمیں اس منحوس عمارت میں جانے کا حکم ملا اور جونہی ہم نے اس بھوت گھر میں قدم رکھا یکا یک قلعہ کی سرنگوں سے زور زور سے بندروں نے چیخنا شروع کر دیا۔ غالباً وہ سمجھ گئے تھے کہ ہم ان کی 'بندر گاہ' یعنی رہائش گاہ پر قبضہ جمانے آ گئے ہیں۔ بندروں کی چیخ پکار کے علاوہ قلعہ میں بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ قلعہ کے صحن میں لمبی خود رو گھاس کے علاوہ کھٹے آموں کے تین بڑے بڑے درخت تھے جن پر چھوٹی چھوٹی امبیاں لٹک رہی تھیں۔ قلعہ کے مشرقی حصے میں پتھروں کا ایک چھوٹا سا مکان جس کے اوپر نیچے فقط دو کمرے تھے بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواریں پرانی اور شکستہ ہونے کے باعث اس قدر بدہیت اور بدصورت تھیں کہ ان کی طرف نظر اٹھانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ قلعہ کی مشرقی دیواروں کے ساتھ کچھ اینٹوں کی ایک جھونپڑی تھی اور اس کی بائیں طرف ایک چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر ہم قلعے میں بیٹھے رہے' اس کے بعد ہمارے پاس رام نگر کا تحصیل دار آ گیا اور اس نے ہمیں آگاہ کیا کہ وہ ہمارا جیلر ہو گا۔ اس لئے آئندہ ہمارے سارے معاملات اس کے

ذریعے انجام پائیں گے۔ سب سے پہلے ہم لوگوں نے اس سے مطالبہ کیا کہ ہمارے لئے چارپائیوں کا انتظام کیا جائے لیکن اس نے ہمارے مطالبے کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہم میں سے کسی ایک کے وارنٹ پر کلاس اے درج نہیں ہے۔

ان دنوں کشمیر کی جیلوں میں چارپائی اور دوسرے فرنیچر کی سہولیات صرف اے کلاس قیدیوں کو میسر ہوتی تھیں۔ اس لئے جیلر ہمارے اس مطالبے پر غور نہ کر سکا۔ گو ہم میں سے اکثر وہ لوگ تھے جو جیل میں رولز کے تحت اے کلاس کے مستحق تھے لیکن جب ہم کو ایذا پہنچانا ہی مقصود تھا تو ہمیں اے کلاس کیوں دی جاتی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد پونچھ اور لاہور کے چوبیس نظر بندوں کو کچی جھونپڑی میں بند کر دیا گیا اور ہم کو پتھر یلے مکان کے اوپر نیچے کے دو کمرے مل گئے۔ نیچے کے کمرے میں خورشید صاحب' مسٹر عبدالغنی ویئو' حاجی جلال دین' مولوی عبداللہ شاہ' سلطان محمود خالدی' محمد عبداللہ بوبلی اور راقم کو مقفل کر دیا گیا۔

اوپر صوفی نور محمد' پروفیسر یوسف' راجہ زبردست خان' خواجہ غلام نبی گلکار' عبدالرحمٰن پارٹو اور محمد صادق ہندواڑہ کو تالہ لگا کر بند کر دیا گیا۔ ہم سب کو کمروں میں بند کرنے کے بعد پہرے داروں نے قلعہ کی ڈیوڑھی میں اپنا ڈیرہ جما لیا۔ تینوں کمروں کے لئے ہمیں علیحدہ علیحدہ لالٹینیں دی گئیں لیکن ان میں تیل اتنا کم ڈالا گیا تھا کہ ساری رات کے لئے کافی نہ تھا' لہٰذا ہم نے لالٹین کی بتی مدھم رکھی تا کہ ساری رات تک روشنی دیتی رہے۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ کمرے کے ایک ستون کی درز میں سے ایک خوفناک سیاہ بچھو اپنی زہریلی دم کو ہلاتا ہوا نکلا اور نیچے کی طرف تیزی سے بھاگنے لگا۔ اگر میری نظر اس پر فوری نہ پڑ جاتی تو شاید ہم میں سے پہلی ہی شب کسی کو وہ اپنے زہر سے نوازتا۔ اس کو دیکھتے ہی میں نے لالٹین کی بتی تیز کر دی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے مارنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جونہی خورشید صاحب کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے فوراً ہی کوئی چیز اس پر دے ماری نتیجہ یہ ہوا کہ بچھو کی

دم کٹ گئی لیکن دم کٹ جانے کے بعد بھی وہ ہلتا رہا اور دیوار کے شگاف میں جا کر غائب ہو گیا۔ ایک بچھو کا مرنا کیا تھا کہ ہر دیوار سے بچھو ہی بچھو نکلنے شروع ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ نصف شب تک خورشید صاحب نے تنہا چھتیس بچھوؤں کو جہنم رسید کیا۔ فی الواقعی اگر خورشید صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہمارا برا حال ہو جاتا۔ نصف شب کے بعد بچھوؤں کا حملہ رک گیا لیکن میری نفسیات پر اس دم کٹے بچھو کا جو دم کٹ جانے کے بعد دیوار کے چھید میں گھس گیا تھا' بہت اثر رہا۔ گو میں جانتا تھا کہ وہ اب ڈنگ مارنے کے قابل نہیں ہے لیکن اس کی خوفناک صورت کا تصور کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مجھے اس بات کا بھی وہم ہو گیا تھا کہ ممکن ہے کہ یہ دم کٹا بچھو قلعہ کے تمام بچھوؤں کا سردار ہو جبھی تو اس کی دم کٹ جانے کے بعد بچھوؤں نے ہم پر چاروں طرف سے یورش کر دی تھی۔

ہمارے دوسرے ساتھیوں کی رات بھی اسی کشمکش میں گزری چنانچہ انہوں نے بھی رات بھر بچھوؤں کی خاصی تعداد کا صفایا کر ڈالا تھا۔ بہر کیف صبح ہوتے ہی ہمارے کمروں کے دروازے کھول دیئے گئے اور ہم سب قلعہ کے آنگن میں جمع ہو کر بچھوؤں کے متعلق رات بھر کا جائزہ لینے میں محو ہو گئے۔ اس روز دس بجے صبح قلعہ کی ایک دیوار سے دو فٹ لمبا سانپ نمودار ہوا۔ سانپ بڑی پھرتی سے دوڑ رہا تھا کہ یکا یک لاہور کے ایک نظر بند محمد رفیع جو بڑے لحیم و شحیم تھے کی نظر اس پر پڑی اور انہوں نے تیزی سے ڈنڈا ہاتھ میں لیا اور اسے ایک ہی وار میں ٹھنڈا کر دیا۔ سانپ کی نمود سے ہماری وحشت میں اور بھی اضافہ ہوا اور ہم سب کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔

دوپہر کے وقت داروغہ ہمارے لئے راشن لے آیا۔ اسے ہم نے شب بھر کی داستان سنائی' مردہ سانپ اور بچھو بھی دکھائے لیکن وہ اس تلخ حقیقت کے باوجود چارپائیاں دینے پر راضی نہ ہوا۔ ان حالات کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کر لیا کہ رات کو سونا ترک کر دینا چاہئے اور دن میں موقع ملے تو نیند پوری کر لینا چاہئے۔ اس دن ہمارا کھانا پکانے کے لئے

کٹھوعہ جیل سے ریاست کے دو مسلمان قیدی محمد سلیمان اور حبیب اللہ قلعہ کے اندر لائے گئے۔ یہ دونوں مسلمان ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم سب نے ان کی اس مسرت کی وجہ دریافت کی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جن کے عزیز و اقارب فرقہ وارانہ فسادات میں ایک ایک کر کے قتل کر دیے گئے تھے۔ مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ ان کے خاندان کی عصمت مآب عورتوں کو بھی ہندو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ الٹا ان پر قتل کا الزام لگا کر چودہ چودہ برس کی سزا دی گئی تھی اور اس قید و بند کے دوران انہوں نے اپنے ہم مذہب لوگوں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ یہ دونوں نیک دل مسلمان بڑی عقیدت اور محبت سے ہمارے لئے کھانا پکاتے رہے اور بڑے خلوص سے ہماری خدمت کرتے رہے۔ معلوم نہیں یہ غریب اب کہاں اور کس حال میں ہیں۔

صرف دو ہفتوں کے دوران ہم نے قلعہ کے اندر نو سانپ اور سینکڑوں کی تعداد میں بچھوؤں کو ٹھکانے لگا دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کافی مضبوط ہو گئے تھے اور اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ جس دن بچھو کے شکار کا ناغہ ہو جاتا تو محفل پھیکی اور سونی ہو جاتی کیونکہ نہ تو ہم کو اخبار پڑھنے کو ملتا تھا اور نہ شطرنج، تاش یا کوئی اور گیم میسر تھی۔ کبھی کبھی ہم word making آپس میں کھیلا کرتے تھے اور کبھی کبھی سیاسی بحث میں بھی وقت کٹ جاتا تھا۔ رات کو ہم خورشید صاحب سے قائدِ اعظمؒ اور دیگر مسلم لیگی رہنماؤں کے اہم اور دلچسپ حالات سنتے رہتے تھے۔

ایک روز خورشید صاحب کو نجانے کیا سوجھی کہ انہوں نے قلعہ میں بزمِ مشاعرہ منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ شاید وہ ہماری توجہ روزمرہ کی مشکلات اور ذہنی تفکرات سے ہٹا کر ایک نئی چیز کی جانب مرکوز کرنا چاہتے تھے۔ خورشید صاحب کی یہ تجویز ہمارے لئے زبردست پریشانی کا باعث بن گئی کیونکہ ہم میں ناز گلکار کے علاوہ کوئی بھی شاعر نہ تھا اور ناز صاحب بھی کشمیری زبان کے ہی شاعر تھے۔ ہمارے لئے شاعری تو شاعری، تک بندی کرنی

بھی مشکل تھی ۔ہم نے خورشید صاحب سے بہتیری التجا کی کہ وہ مشاعرے کی تجویز واپس لے لیں لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ بالآخر یہ مجلسِ مشاعرہ جون 1948ء کے دوسرے ہفتے میں منعقد ہوئی۔ مشاعرے سے قبل ہم سب نے اپنے بستروں کی دریاں جمع کیں اور انہیں قلعہ کے صحن میں بچھادیا اور صاحبِ صدر کی نشست کے لئے تکیوں سے مسند ترتیب دی گئی۔ مشاعرے کی صدارت کے لئے اگر چہ ہم میں سے دوتین احباب بطور امیدوار مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن جب میں نے خورشید صاحب کا نام مشاعرے کی صدارت کے لئے پیش کیا تو سامعین میں سے اکثر نے میری رائے سے اتفاق کیا اور خورشید صاحب مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوگئے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ قلعہ رام نگر کی بزمِ مشاعرہ کے صدر کو تقریباً گیارہ برس بعد آزاد کشمیر کی صدارت کا اعزاز حاصل ہوگا۔

اس مشاعرہ میں جن لوگوں نے نظمیں اور رباعیاں پڑھیں' ان کا کلام اگرچہ پوری طرح یاد نہیں لیکن نام ضرور یاد ہیں۔ غلام احمد ناز' عبدالغنی ویئو' حاجی جلال الدین' سلطان محمود خالدی' خورشید حسن خورشید اور راقم الحروف کے نام ان میں قابلِ ذکر ہیں۔ اس سے پہلے عبدالغنی ویئو کا ایک شعر جو ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

گر نہیں بندری تجھے مرغوب
مفت مل جائے تو برا کیا ہے

غنی صاحب نے یہ شعر قلعے کے اندر بندروں کی بہتات سے مرعوب ہوکر لکھا تھا مگر ادبی لحاظ سے شعر مہمل سا ہے لیکن چونکہ جس ماحول اور ذہنی کشمکش میں اس کی تخلیق ہوئی ہے' اس کے پیشِ نظر اس شعر کو بے معنی نہیں کہا جا سکتا۔

خورشید حسن خورشید کی نظم میں سے بھی ابھی تک دو شعر یاد ہیں۔

حشر تک روئیں گے اس بزم میں رونے والے
اب تو ہم جاگ اٹھے ہیں نہیں سونے والے

گلے ملنے کو ہے کشمیر بھی پاکستان سے
کام رکتے نہیں تقدیر کے ہونے والے

حاجی جلال دین کا ایک شعر ۔

غدارو! نابکارو! بے ضمیرو! یاد رکھنا
زمانہ وہ بھی آئے گا کہ تم سو بار تڑپو گے

حاجی جلال دین تحریک پاکستان کے سلسلے میں کئی بار جیل جا چکے ہیں اور یہ شعر انہوں نے بھارت کے ان زرخرید ایجنٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے جنہوں نے ذاتی مفاد اور ہوس اقتدار کے باعث کشمیر کی سرزمین کو بھارتی سامراج کے حوالے کر دیا ہے۔ سلطان محمود خالدی اردو میں بالکل نہ لکھ سکتے تھے' ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

بیا اے باد نوروزی بحال قیدیاں بن کر
جو کھانا ہم کو ملتا ہے اڑا لے جاتے ہیں بندر

سلطان محمود کا یہ شعر بالکل حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ جب ہم کھانا کھانے بیٹھتے تھے تو سینکڑوں بندر ہمارے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے نتیجہ یہ کہ ہمیں اپنے حصے کی زیادہ روٹیاں ان کی نذر کرنا پڑتی تھیں۔ اس مشاعرے میں جو اشعار میں نے پڑھے تھے' وہ سب کے سب ان ہی بلاؤں کے متعلق تھے جن سے ہمیں شب و روز پالا پڑتا تھا۔ ان میں سے چند اشعار ۔

یہ بچھو' سانپ اور کن کھجورے
یہ دار ڈز یہ مچھر' بندر بھورے

نحیف ان میں کوئی' کوئی زور دار ہے
ہمیں ان سے خوف اور انہیں ہم سے ڈر ہے

یہ سب پہرہ داروں کی صف میں کھڑے ہیں
کہ دشمن ہمارے یہ موذی بڑے ہیں

بچا لے الٰہی ہمیں ان کی زد سے
نپٹ لیں گے ہم ان سے تیری مدد سے

اس بزم مشاعرہ کے انعقاد سے خورشید صاحب بے حد خوش ہوئے حالانکہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اس میں جو نظمیں یا جو شعر پڑھے گئے ہیں' ان میں سے اکثر و بیشتر شعر و شاعری کے بنیادی اصولوں اور قواعد وضوابط سے بے نیاز تھے۔ خورشید صاحب یوں بھی خوش ہوئے کہ جو لوگ ابتدا میں ان کی اس تجویز سے اس بنا پر کہ انہیں فن شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا' اختلاف کرتے تھے' وہی اب بار بار انہیں ایک اور مجلسِ مشاعرہ منعقد کرنے کی ترغیب دینے لگے۔ غالباً وہ لوگ اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ اپنی پہلی کاوش میں شاعرانہ تخیل کی بلندیوں کا خاصا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ درحقیقت ان کا بھی قصور نہیں تھا بلکہ اگر قصور تھا تو داد دینے والوں کا کیونکہ ہم میں سے بعض ایسے بھی تھے جو ہر ٹوٹے پھوٹے مصرع پر واہ واہ کرتے رہتے۔ نتیجہ یہ کہ ان نیم شعرا کو یہ خیال گزرا کہ اگر انہوں نے مشق جاری رکھی تو وہ شعرا کی صف میں آسانی سے شامل ہو سکیں گے۔

مختصر یہ کہ ہم نے کئی بار مشاعرے منعقد کر کے شاعری کی وہ ٹانگ توڑی کہ کچھ نہ پوچھیں۔ اب ہمیں یہاں ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ ایک روز جیلر میری مشروط رہائی کا پروانہ لے کر اندر آ گیا لیکن میں نے اسے فوراً رد کر دیا۔ خورشید صاحب نے میری اس حرکت کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا اور جب تک میں قلعہ میں ان کے ساتھ رہا' وہ بار بار اس واقعہ کو دہرایا کرتے تھے۔ بالآخر اگست 1948ء کا پہلا ہفتہ تھا کہ رام نگر قلعہ سے اودھم پور جیل لے جانے کے لئے میری منتقلی کے احکام لے کر جیلر دس بجے قلعہ میں آیا۔ میں نے اس سے ڈیڑھ گھنٹے مہلت لی اور اس اثنا میں تمام ساتھیوں سے رنج و ملال میں ڈوبا باتیں کرتا رہا حالانکہ مجھے اس جہنم زار سے نجات ملنے پر مسرت و انبساط سے پھولے نہیں سمانا

چاہئے تھا لیکن خورشید صاحب سے علیحدگی کے احساس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ان تین مہینوں کا اذیت دہ اور روح فرسا عرصہ جو مجھے گزارنا پڑا' خورشید صاحب کی صحبت میں اس خوبصورتی سے کٹا کہ میں اب نظر بندی کا سارا وقت یہاں گزارنے کا خواہش مند تھا۔ خورشید صاحب کو اس قدر قریب سے دیکھنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ موصوف ذہین و فطین اور خوش خلق ہونے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک بھی ہیں۔ بات بڑی مدلل کرتے ہیں اور کج بحثی نہیں کرتے۔ دورانِ اسیری میں ان کی جرأت اور دلیری کا قائل ہو گیا۔ خورشید صاحب میں ایثار کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ ایک اچھے دوست اور مخلص ساتھی ہیں۔

رام نگر قلعہ سے روانہ ہونے سے پہلے خورشید صاحب نے مجھے پنسل سے ساغر صاحب کے نام ایک کھلا خط دیا جسے میں نے اپنے ہینڈ بیگ کی تہہ میں چھپا لیا۔ اس خط کے مضمون کا خلاصہ درج ہے: ''بفضلِ خدا ہم بخیریت ہیں اور آپ کی خیریت کے متمنی۔ ناقص خوراک اور ناموافق ماحول نے ہم سب کی صحت پر بہت برا اثر کیا ہے' اس کے باوجود ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ دعا ہے کہ خدا ہمیں ان صبر آزما حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت بخشے۔ جب میں کوٹھی باغ سٹیشن میں تھا تو میرے پاس بلاناغہ ریڈیو آزاد کشمیر اور پاکستان ریڈیو کی خبریں خفیہ طور پر پہنچ جایا کرتی تھیں اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہوتا تھا کہ مجاہدین ڈٹ کر بھارتی فوجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن یہاں تو اخبار بھی نہیں ملتا۔ نور محمد صاحب کے جانے سے آج ہماری محفل سونی ہو جائے گی۔ یہ زندہ دل اور باحوصلہ آدمی ہیں۔ امید ہے ان کی رفاقت آپ کی تنہائیوں کی اذیتوں میں کمی کا باعث ہوگی۔ سب ساتھی آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں''۔

''رام نگر قلعہ'' سے جسے لوگ موت کا کنواں بھی کہتے ہیں' خورشید کئی ماہ کی قید و بند کے بعد جب آزاد ہوئے اور قیدیوں کے تبادلے میں جب سری نگر سے جموں تک جس

ہوائی جہاز میں خورشید کو لایا گیا وہ جہاز خراب حالت میں تھا۔ سازش یہ تھی کہ دوران پرواز جہاز تباہ ہو جائے لیکن یہ جہاز صحیح سلامت ایئر پورٹ پر اترا لیکن جموں سے سری نگر جاتے ہوئے وہی جہاز تباہ ہو گیا۔ خورشید کو کئی بار اللہ نے حادثوں سے محفوظ رکھا۔ اس طرح قیام پاکستان کے بعد خورشید جس ٹرین سے بابائے قوم اور مسلم لیگ کا دفتری ریکارڈ لے کر پاکستان آ رہے تھے وہ دھماکے سے تباہ ہوگئی لیکن وہ بوگی محفوظ رہی جس میں وہ سوار تھے۔ اس طرح آزاد کشمیر کی صدارت کے دوران بھی دو تین بار برساتی نالوں کو جیپ میں پار کرنے کے بعد پل ٹوٹ گئے۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ بھاری وزنی پتھر نالے کے بہاؤ میں آ گئے۔ صرف لمحوں کے فاصلے نے ایسے حادثات سے انہیں بچایا اور اس آخری خونی جان لیوا حادثے سے چند دن قبل میر پور سے پنڈی آتے ہوئے ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا اور اس کے سارے شیشے ٹوٹ گئے لیکن اللہ نے انہیں محفوظ رکھا بس انسان بے بس ہے اس ذات پاک کی قدرت کے سامنے۔ میں رام نگر جیل میں 13 ماہ تک قید رہا۔ چھ ماہ مجھے قید تنہائی میں رکھا گیا''۔

جب میری گرفتاری کی خبر قائد اعظمؒ کو دی گئی تو انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو خط لکھا کہ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کو ان کی حکومت نے گرفتار کر لیا ہے، اسے واپس کر دیجئے کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں سرکاری کام میں کافی حرج ہو رہا ہے۔ اس پر پنڈت نہرو نے لکھا کہ ان کی حکومت نے خورشید کو گرفتار نہیں کیا بلکہ ریاست کی حکومت نے کیا ہے۔ اس لیے ان کا اس گرفتاری میں کوئی دخل نہیں۔ غالباً قائد اعظمؒ کا یہ واحد نجی خط تھا جو انہوں نے نہرو کو لکھا تھا۔ بعد میں بین الاقوامی ریڈ کراس کے تحت قیدیوں کے تبادلے میں میری رہائی ہوئی۔ بریگیڈیر گھنارا سنگھ پاکستان کی قید میں تھا۔ اس کی رہائی کے بدلے 6 جنوری 1949ء کو میں دوبارہ پاکستان آ گیا۔

رام نگر کی جیل ایسی تھی جہاں تمام مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جاتا تھا اور ہمیں بھی یہ

خیال رہتا تھا کہ ڈوگرے ہمیں بھی ختم کر دیں گے۔ وہاں نہ اخبار تھا اور نہ ریڈیو۔ میں اگرچہ خوابوں پر یقین نہیں رکھتا لیکن میں نے خواب میں دیکھا کہ جیل کے چوکیدار نے تمباکو کی پڑیا کھولی۔ وہ پڑیا ایک اخبار تھی۔ اس اخبار میں بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا کہ قائداعظمؒ کوئٹہ سے کراچی آتے ہوئے ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ صبح اٹھا لیکن جب آنکھ بند کرتا تھا تو میرے سامنے یہ حروف واضح ہوتے تھے۔ میں دو تین دن بہت مضطرب رہا۔ میں نے اپنے ایک جیل کے ساتھی سے پوچھا کہ خواب میں اگر کسی کی موت کی خبر دیکھی جائے تو کیا مطلب ہوتا ہے۔ اس نے کہا اگر وہ شخص زندہ ہے تو اس کی عمر لمبی ہوگی اور اگر وہ اس دوران مر گیا تو یوں کہیے کہ آپ کو اطلاع ملی ہے۔ اس کے دو تین دن بعد جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ملوہترہ راؤنڈ پر آئے تو مجھے بلا کر علیحدہ لے گیا اور کہا کہ میں تمہیں بہت افسوس سے سناتا ہوں کہ قائداعظمؒ کا انتقال ہوگیا ہے اور خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل ہو گئے ہیں۔

ہم لوگ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں کسی انعام اور معاوضہ کی توقع میں شامل نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ہمیں یہ لالچ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ہم پلاٹ، مکان یا امپورٹ لائسنس حاصل کریں گے۔ تحریکِ پاکستان میں ان باتوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ پاکستان کا قیام ہی ہمارا انعام ہے۔ ہمارے ملک میں یہی تو مصیبت ہے کہ لوگ روٹی کپڑے کی بات تو کرتے ہیں کردار کی بات نہیں کرتے۔ قائداعظمؒ کی زندگی کا سب سے بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے سیاست کو جذبات یا ذاتی عقیدت کا حصہ نہیں بنایا۔ قوم کے آبرومندانہ مقام کے لئے جدوجہد کی اور اسی مقصد کے لیے سائنٹفک بنیادوں پر کام کیا۔

ہم لوگ یہ سمجھتے تھے اور ایمانداری سے یہ محسوس کرتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ہمارے پاس یہاں معاشی خوشحالی لانے کے لئے اسلام کے عمل والا نظام موجود ہے۔ پھر پارلیمانی نظام کا تجربہ بھی کسی حد تک ہمیں حاصل تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پارلیمانی نظام

اسلامی تعلیمات کے قریب تر ہے کیونکہ پارلیمانی نظام کی سب سے بڑی خوبی حکمرانوں کی جواب دہی کا تصور ہے۔اس میں وزیراعظم اور پوری کابینہ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ اسلام کا بھی یہی پیغام ہے کہ حاکم عوام کے سامنے اپنے اقدامات کے حوالے سے جواب دہ ہوں گے۔دوسرے یہ کہ اس میں انتخاب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اچھے آدمی چن سکیں۔ اس میں یہ بھی ہے کہ پارلیمنٹ باہمی مشورے اور رائے سے معاملات طے کرے۔ میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قائداعظمؒ پارلیمانی نظام کے حامی تھے۔ہمارا یہ خیال تھا کہ پاکستان میں جمہوری نظام اس انداز سے چلایا جائے گا کہ ہمارا ملک دوسرے اسلامی ممالک کے لیے بھی ایک مثال بن جائے گا۔پھر یہاں معاشی انصاف پر مبنی نظام بھی قائم کیا جائے گا لیکن بدقسمتی سے قائداعظمؒ کے جلد انتقال کی وجہ سے ہماری یہ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔

پاکستان بننے کے بعد جب میں کراچی پہنچا' اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ترقی کے بے پناہ مواقع ہمارے سامنے تھے۔لوگ نئے ملک میں جائیدادوں کی الاٹمنٹ اور مختلف تجارتی شعبوں پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔کچھ سیاست دان وزارتوں اور سفارتوں کے چکر میں پڑے ہوئے تھے لیکن مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ پاکستان کی تکمیل کا مرحلہ ابھی باقی ہے اور کشمیر کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے اسی مقصد کے حصول کے لیے قائداعظمؒ سے اجازت طلب کی اور کشمیر چلا گیا تھا۔

بہرحال جب میں کراچی پہنچا تو محترمہ فاطمہ جناحؒ سے ملاقات ہوئی' لیاقت علی خان سے ملا اور باقی مسلم لیگ کے لیڈروں سے ملا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ ہمیں اس وقت جو توقعات مسلم لیگ کی لیڈرشپ سے تھیں' وہ پوری نہیں ہوئیں۔پہلی بات تو یہ تھی کہ مسلم لیگ کا فرض تھا کہ وہ یہ طے کرتی کہ پارٹی اور حکومت کے درمیان کس قسم کے تعلقات یا مراسم ہوں گے کیونکہ پہلے حکومت انگریزوں کی تھی۔پارٹی اس کے خلاف تھی اور پارٹی کا یہ رویہ

حکومت مخالف تھا مگر اب تو اپنی حکومت تھی ۔سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ نئی حکومت اور پارٹی کے درمیان کس نوعیت کے تعلقات ہوں گے؟ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لیاقت علی خان نے اس بارے میں کوئی ٹھوس لائحہ عمل مرتب نہیں کیا تھا۔ دوسرا جو سب سے اہم سوال ہے وہ یہ تھا کہ پاکستان جب بن گیا تو ان نظریات' بنیادوں اور تصورات کو عملی صورت دینے کیلئے پارٹی کا فرض تھا کہ اس کے لئے کوئی سکیم بناتی 'کوئی سیل بناتی 'کوئی گروپ بناتی' کوئی ادارہ قائم کرتی جو یہ بتاتا کہ مسلم لیگ نے جس مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا تھا اور اب پاکستان بننے کے بعد چونکہ حکومت ہمارے پاس ہے' ہمیں یہ اقدامات کرنے چاہئیں جو کہ معاشی' سیاسی' معاشرتی اور ہمہ گیر بنیادوں پر ہونے چاہئیں مگر بدقسمتی سے لیاقت علی خان نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

جب محترمہ فاطمہ جناحؒ اور لیاقت علی خان کے اختلافات بڑھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ لیاقت علی خان کی حکومت کے ساتھ محترمہ نے تعاون نہیں کیا اور پھر یہ ہوا کہ انہوں نے سرکاری ملازموں یعنی بیوروکریسی کو اہمیت دینا شروع کر دی مثلاً چودھری محمد علی اور سکندر مرزا وغیرہ کو۔ بیوروکریسی حکومت کے زیادہ قریب آ گئی اور حکومت کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے لگی اور بیوروکریسی نے مسلم لیگ کی رائے سے چودھری محمد علی کے روپ میں حکومت پر قبضہ کر لیا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت جو غفلت اور سستی ہوئی' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت آہستہ آہستہ مسلم لیگ کے ہاتھوں سے بیوروکریسی اور پھر بیوروکریسی کے ہاتھوں سے فوج کے ہاتھ میں چلی گئی۔

سری نگر جیل سے رہائی کے بعد میں نے صحافت میں کام کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ زمانہ طالب علمی میں بھی میں بطور جرنلسٹ کام کرتا رہا ہوں ۔جموں سے ایک اخبار 'جاوید' نکلتا تھا' میں اس سے منسلک رہا ہوں۔ اے آر ساغر جو جموں وکشمیر کے ایک منجھے اور مانے ہوئے صحافی تھے اور جنہیں مولانا ظفر علی خان نے بھی خراج تحسین پیش کیا تھا' میرے ساتھ

تھے۔ یہاں پر میں عرض کردوں کہ لیاقت علی خان' غلام محمد اور سردار عبدالرب نشتر سب نے میرے ساتھ بڑی ہمدردی کی اور مجھے حکومت کے مختلف محکموں میں لینے کی پیشکش کی مگر میں طبعاً ملازمت کے حق میں نہیں تھا۔ اس لئے میں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔

چنانچہ 1949ء میں' میں نے اور معروف صحافی عزیز بیگ نے لاہور سے ایک انگریزی ہفت روزہ ''گارڈین'' نکالا تھا جو لیاقت علی خان کی حکومت پر شدید نکتہ چینی کرتا تھا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ پاکستان میں جمہوری نظام قائم کرنے والی پہلی آواز تھی کیونکہ میاں افتخار الدین نے بھی حکومت پر نکتہ چینی کی اور ''نوائے وقت'' نے لیاقت علی خان کے خلاف اداریے لکھے تھے اور کچھ اور اخبارات نے بھی۔ بات یہ ہے کہ ''گارڈین'' کی نکتہ چینی زیادہ شدید ہوتی تھی اور بدقسمتی سے لیاقت علی خان نے حسین شہید سہروردی کو ''کتا'' کہہ دیا تھا اور ہم نے اس پر شدید احتجاج کیا تھا کہ ایک جمہوری ملک میں یہ کیا ہو رہا ہے جبکہ سہروردی تحریک پاکستان میں رہے ہیں اور بنگال میں انہوں نے بہت کام کیا ہے اور وہ مسلم لیگ کا ستون مانے جاتے تھے۔ اگر آج ان کا اختلاف ہو گیا ہے تو انہیں ''کتا'' کہنا جمہوری قدروں کے خلاف ہے۔ ایک تو ہم نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ دوسرے لیاقت علی خان کے زمانے میں تھوڑی بہت کرپشن شروع ہو گئی تھی۔ ہمارے نوٹس میں ایک چیز آئی کہ آرمی ہیڈ کوارٹر کے لئے جو سامان خریدا گیا ہے' اس میں کچھ گھپلا ہے۔ اس پر ہم نے لیاقت علی خان پر اعتراض کیا۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین نے پہلے ہمارے اشتہارات بند کروائے' پھر دھمکیاں بھی دیں۔ اشتہارات کی بندش سے اخبار چلانا مشکل ہو گیا۔ اس لیے خواجہ شہاب الدین کی عنایات سے 1951ء میں ہمیں اخبار بند کرنا پڑا۔

بدقسمتی سے جرنلزم میں بھی مجھے بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ پاکستان میں اخبار اور پریس کو بڑے کٹھن دور سے گزرنا ہو گا۔ بالخصوص سرمائے کے بغیر کسی بھی اخبار

کے لئے آزاد پالیسی اختیار کرنا ممکن نہیں ۔ چنانچہ جرنلزم کو چھوڑ کر اور اپنی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے میں انگلستان چلا گیا جہاں سے بار ایٹ لاء کیا۔ 1954ء میں واپس آ کر کراچی میں آئی آئی چندریگر کے جونیئر کی حیثیت سے پریکٹس شروع کر دی۔ انگلستان میں اچھے تعلیمی ریکارڈ اور تحریر وتقریر کی شستگی اور روانی کی وجہ سے یہاں کے چند بڑے بڑے قانون دانوں نے مجھے لندن میں پریکٹس کرنے کو کہا لیکن وطن کی محبت اور ہم وطنوں کی کشش زندگی بھر میرے لیے اہم رہی ۔

بدقسمتی سے قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت انتظامی معاملات اور مہاجرین کی آبادکاری وغیرہ میں الجھ گئی ۔ پاکستان بننے سے قبل بھی قائداعظمؒ مسلم لیگ کی تنظیم سے مطمئن نہیں تھے اور ان کے ذہن میں جماعت کو زیادہ مستحکم کرنے کے منصوبے زیرِ غور تھے مگر بدقسمتی سے بین الاقوامی واقعات اور برصغیر کی صورت حال اس تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی کہ ان میں سے کسی منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی لیڈرشپ حکومت اور پارٹی کے مابین رشتے کو صحیح طور پر واضح نہ کر سکی جس کے نتیجے میں الجھاؤ پیدا ہو گیا اور مسلم لیگ کی صفِ اوّل کی قیادت اپنی حب الوطنی' خلوص اور نیک نیتی کے باوجود حالات پر صحیح طرح سے قابو نہ پا سکی' نہ تو آئین مرتب کرنے میں کامیاب ہو سکی اور نہ ہی پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی کے سلسلے میں کوئی دوررس منصوبہ تیار کیا گیا اور ان میں سے بعض جو شریف النفس لوگ تھے مثلاً خواجہ ناظم الدین' سردار عبدالرب نشتر' نواب افتخار حسین ممدوٹ' وہ بھی بسیار کوششوں کے باوجود ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مقابلہ نہ کر سکے جو اوپر کی سطح پر شروع ہو گئی تھیں اور جن میں بعض سرکاری ملازم بھی شریک تھے ۔ ان حالات میں مسلم لیگ کی تنظیم بے اثر ہو کر رہ گئی ۔ مجھے ذاتی طور پر سردار نشتر اور مشرقی بنگال کے فضل الرحمٰن سے بڑی توقعات تھیں ۔ نشتر صاحب پرکشش شخصیت کے مالک تھے اور عوام میں وہ مقبول بھی تھے ۔ جماعت میں ان کا احترام تھا۔ مرکزی وزیر اور

گورنر کی حیثیت سے ان کا کردار قابل تعریف تھا مگر انہیں بھی ہر طرح سے بے دست و پا کرنے کی کوشش کی گئی اور مسلم لیگ کی قیادت دو بڑے صوبوں بنگال اور پنجاب میں بندر بانٹ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف رہی ۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان عناصر کافی حد تک بد دل ہو گئے ۔آج بھی میرا خیال ہے اور اس وقت بھی میری یہ تجویز تھی کہ جب غلام محمد نے گورنر جنرل کی حیثیت سے آئین ساز اسمبلی کو توڑا تھا تو مولوی تمیز الدین کی طرف سے ہائی کورٹ میں درخواست دینے کی بجائے مسلم لیگ کی لیڈر شپ کو عوامی تحریک چلانا چاہئے تھی کیونکہ نوکر شاہی اور آمرانہ ذہنیت کا یہ پہلا وار تھا مگر میری تجویز پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ان ہی حالات سے قدرے مایوس ہو کر کراچی میں ایک گروپ قائم ہوا جس کے روح رواں ایم اے اچ اصفہانی اور خواجہ خیر الدین تھے۔ان کے ساتھ میرے علاوہ مطلوب الحسن سید'مسٹر عبد الرزاق کو ہاری'مسٹر حاتم علوی وغیرہ بھی شامل تھے اور ہمیں راجہ صاحب محمود آباد کی تائید حاصل تھی ۔اس گروپ کو NRM یعنی National Reconstruction Movement یا تحریک تکمیل ملی کہا جاتا تھا۔بدقسمتی سے شروع میں ہی اس گروپ کو حسین شہید سہروردی کی حکومت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہم جداگانہ انتخابات چاہتے تھے اور جب یہ تحریک شروع ہوئی تو جماعت اسلامی کے مولانا مودودی'جمعیت العلماء کے مولانا عبد الستار نیازی اور مولانا محمد شفیع اور بعض دیگر سیاسی اہم شخصیتوں نے جو انتخابات کے مسئلے پر ہم سے متفق تھے' سہروردی حکومت کی پالیسی کی مخالفت کا فیصلہ کرلیا۔

پاکستان مسلم لیگ کے صدر سردار عبد الرب نشتر نے بھی ہماری حمایت کا اعلان کیا۔یہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ میں پاکستان کی سیاست کے بنیادی معاملات سے بے تعلق نہیں رہا بلکہ اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔این آر ایم کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس تحریک سے وابستہ کسی شخص کو کوئی عہدہ قبول نہیں کرنا ہوگا۔

کیونکہ ہمارے نزدیک دیگر قباحتوں کے ساتھ ایک قباحت عہدوں کا لالچ بھی تھا۔ اس تحریک کے ذریعے پاکستان کے بنیادی مسائل کے بارے میں تین پمفلٹ بھی شائع ہوئے۔ 1958ء کے مارشل لاء کے بعد اس تحریک کو ختم کر دیا گیا۔

اس سوال کو کہ ہمارے بزرگ سیاستدانوں نے کوئی کام نہیں کیا جس کا نتیجہ بار بار مارشل لاء کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے' دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ تو یہ ہے کہ بزرگ سیاست دانوں نے کام نہیں کیا جس کے نتیجے میں مارشل لاء لگا۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ جو کچھ کیا' اپنے مقصد کے لیے کیا جس کے نتیجے میں سیاسی بحران آیا۔ جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے، یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ بزرگ سیاست دانوں نے چونکہ کام نہیں کیا اس لیے مارشل لاء لگا۔

1949ء کی ابتداء کا کا زمانہ تھا جب کہ ہر ذی ہوش اور محب الوطن پاکستانی کو یہ احساس تھا کہ پاکستان کن کن مشکلات سے گزر کر حاصل کیا گیا اور بھارتی رہنما، انگریز اور ہندو کی طرح انتقامی جذبے کے ساتھ پاکستان کو کمزور کرنے کے درپے تھے۔ ابھی ہمارے وزرا کے دفاتر میں میز کرسی تک نہیں تھی کہ کروڑوں انسان مہاجرین بن کر پاکستان آئے اور یہاں سے گئے۔ کشمیر میں لڑائی شروع ہو گئی۔ پاکستانی حکومت کے خزانے کا پیسہ اور دیگر سازوسامان بھارت نے روک لیا۔ حیدرآباد پر حملہ کر دیا۔ اس عالم میں پاکستان کے بزرگ سیاست دانوں نے کون سا قصور کیا کہ راولپنڈی سازش کیس بھی سامنے آیا۔ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طبقے میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جس کا اپنا انداز فکر ہے اور یہ ان لوگوں کی طرح نہیں سوچتا جن کے خیال کے مطابق مارشل لاء صرف غلطیوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ پاکستان کے بزرگ سیاست دانوں سے غلطیاں ہوئیں' انہوں نے آئین بنانے میں سستی سے کام لیا اور 9 سال بعد 1956ء میں پہلا آئین منظور کیا۔ اس دوران کئی حکومتیں بنیں اور بگڑیں لیکن جب 1958ء میں انتخابات کی

مہم شروع ہوئی' اس وقت ملک میں فضا بالکل پرسکون تھی، پر امن تھی۔ سیاسی رہنما انتخابی دوروں کا پروگرام بنا چکے تھے اور اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو چکا تھا۔ کہیں کوئی فساد نہیں ہوا تھا اور کہیں قتل و غارت گری نہیں ہوئی تھی۔ کہیں کوئی ہڑتال نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی اکتوبر میں سکندر مرزا نے مارشل لاء لگا دیا۔ یہ ایسا دور تھا جب بزرگ سیاست دان آئین بنا کر آئین کے تحت جمہوری طریقے سے پہلی حکومت کا انتخاب چاہتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مارشل لاء کس غلطی کی بنا پر لگایا گیا تھا؟ کیا نوجوان یہ سوچتے ہیں کہ یہ الیکشن ہونا ہی نہیں چاہیے تھا کیونکہ الیکشن ہونے کی وجہ سے مارشل لاء لگانا پڑا۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ بزرگ سیاست دان کام کرتے تو مارشل لاء نہ لگتا۔ آخری بار (تا دمِ تحریر) مارشل لاء جولائی 1977ء میں لگایا گیا۔ اس وقت ہارنے والی جماعتوں کا الزام تھا کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے لیکن ہارنے والے عموماً اپنی ناکامی کا الزام کسی نہ کسی پر لگاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کئی سال تک انتخابات نہ کرائے جاتے اور ایک جماعت بغیر انتخابات کے اپنی آمریت برقرار رکھتی تو پھر دوسری بات تھی چنانچہ اگر آپ واقعات کا تجزیہ کریں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ بزرگ سیاست دانوں کے اقدامات کی وجہ سے مارشل لاء نہیں لگایا گیا بلکہ دونوں موقعوں پر ان کے محرکات کچھ اور تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر کوئی حکومت ناکام ہو جائے تو اس کا علاج آئین میں موجود ہے۔ مارشل لاء اس کا حل نہیں ہے۔ میں نوجوانوں کو عرض کروں گا کہ ان کا اندازِ فکر غلط ہے۔

جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ بھی ایک مفروضہ ہے کہ سیاست دانوں کی ذاتی غرض بندی بحران کا باعث بنی۔ سیاست سے ذاتی عنصر کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ افراد اور ذاتی عوامل یقیناً بروئے کار نظر آتے ہیں لیکن کوئی ٹھوس مثال ایسی نہیں دی جا سکتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ سیاست دانوں کی ذاتی اغراض سے بحرانی کیفیت پیدا ہوئی۔ ذاتی اغراض دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ برسر اقتدار

سیاست دان اپنی ذات کو کرسی سے چمٹائے رکھنے کے لیے اقدامات کرتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سوائے مسٹر بھٹو کے کوئی بھی سیاست دان چار سال سے زائد عرصے تک برسر اقتدار نہیں رہا۔ لیاقت علی خان چار سال 2 ماہ تک وزیراعظم رہے۔ خواجہ ناظم الدین صرف 2 سال، محمد علی بوگرہ بھی صرف دو برس۔ چودھری محمد علی اور سہروردی 13 ماہ سے زیادہ عرصہ نہ نکال سکے۔ چندریگر صرف 56 روز تک برسر اقتدار رہے۔ ان مثالوں سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی نے برسر اقتدار رہنے کے لیے کوئی ایسی حرکت کی ہو جس سے سیاسی بحران پیدا ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی بحران پیدا ہوا یہ لوگ اپنے عہدوں سے الگ ہو گئے۔

ایک قسم کی خودغرضی یہ ہو سکتی ہے کہ کسی سیاست دان نے اپنی اغراض اور مقاصد کی خاطر اقرباپروری یا دیگر مالی فائدوں کی خاطر کوئی ایسا قدم اٹھایا ہو۔ صورت یہ تھی کہ لیاقت علی خان کا اپنا مکان تک نہ تھا۔ انہوں نے کوئی کوٹھی الاٹ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، فیروز خان نون تینوں خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے متعلق تو یہ بھی نہیں سنا گیا کہ انہوں نے اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ اٹھایا یا دولت جمع کی ہو۔ دوسرے وزرائے اعظم مثلاً سہروردی اور چودھری محمد علی کے متعلق بھی ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ انہوں نے اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا ہو۔ دوسرے ممتاز سیاست دان مثلاً سردار عبدالرب نشتر، افتخار حسین ممدوٹ، فضل الرحمٰن، نورالامین وغیرہ کے بارے میں بھی ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ صرف ایوب کھوڑو پر الزامات لگائے گئے تھے لیکن وہ بھی غلط ثابت ہوئے۔

میں تو نوجوانوں کو یہ کہوں گا کہ کسی بھی خاندان کا نظام اس وقت تک درست طور پر نہیں چل سکتا جب تک کہ بزرگوں کا احترام نہ کیا جائے اور ان سے رہنمائی حاصل نہ کی جائے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ نوجوان سیاست دانوں کو یقیناً بزرگوں پر نکتہ چینی کرنے کا

حق حاصل ہے لیکن ان کے بھی کچھ فرائض ہیں ۔میری خواہش ہے کہ وہ مسائل کو سطحی اور جذباتی انداز میں نہ دیکھیں۔ حالات اور واقعات کا جائزہ لیں۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ اگر نوجوان کوئی ایسی تحریک پیش کریں اور ایسا لائحہ عمل عوام کے سامنے رکھیں جس پر پوری قوم متفق ہو اور ان کا ساتھ دینے کو تیار ہو۔

جب میں آزاد کشمیر پہنچا تو حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ مسلم کانفرنس کئی حصوں میں بٹ چکی تھی اور چودھری غلام عباس چونکہ 1954ء میں یہ قانون منظور کروا چکے تھے کہ مسلم کانفرنس وہی تصور ہوگی جسے حکومتِ پاکستان کی وزارت داخلہ و امور کشمیر تسلیم کرے گی۔ اس لیے عملاً یہ سارے سیاست دان وزارت داخلہ اور کشمیر کے کلرکوں اور افسروں کی نظر کرم کے خواہش مند ہو کر رہ گئے تھے اور مسلم کانفرنس کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی تھیں۔ یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ مسلم کانفرنس کشمیری مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بھی بنے اور اس کے مشورے پر ہی آزاد کشمیر کا صدر بنے گا۔ چودھری صاحب نے ایک غلطی اور بھی کی تھی کہ صدر کے اوپر ایک عہدہ سپریم ہیڈ کا بنوالیا تھا اور خود اس پر فائز رہے۔ سیاسی سطح پر بھی اکثر کشمیری لیڈر پاکستانی لیڈروں کی دیکھا دیکھی ساری امیدیں سلامتی کونسل پر لگائے بیٹھے تھے اور اندر سے شکست کا اعتراف کر چکے تھے۔ میں نے ان حالات میں کام شروع کیا اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا، جمہوری روایات قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1962ء میں بنیادی جمہوریت کا انتظام میں نے محض اس لیے قبول کیا کہ پاکستان میں یہ نظام ترقی کے مترادف ضرور تھا کیونکہ یہاں براہ راست بنیادوں پر پارلیمانی نظام رائج رہا تھا لیکن آزاد کشمیر میں انتخابات ہوتے ہی نہ تھے۔ بنیادی جمہوریت کے نظام میں جس جگہ نامزدگیاں تھیں، میں نے اسے ختم کر دیا۔ آزاد کشمیر کا پہلا الیکشن میری نگرانی میں ہوا۔ گو میں نے کامیابی حاصل کی لیکن صرف 29 ووٹوں کے بل بوتے پر۔ علاوہ ازیں ان انتخابات کے منصفانہ ہونے کا ثبوت یہ بھی تھا کہ آزاد کشمیر کے علاقے جہاں میں صدر تھا، مجھے کم ووٹ

ملے اور یہ کمی پاکستان کے مختلف شہروں میں رہنے والے کشمیری مہاجرین نے پوری کی۔

لبریشن لیگ اور آزاد کشمیر کا نظم و نسق

لبریشن لیگ نے آزادیٔ کشمیر کی خاطر پوری تحریک' اس کے ماضی اور اس کے تقاضوں پر نظر ثانی کر کے نئی راہ متعین کی مگر جب صدر کی حیثیت سے میں نے ذمہ داری سنبھالی تو انتظامی مسائل بھی ہمارے سامنے آئے۔ اکثر لوگ اور بالخصوص نوجوان یہ سوال کرتے ہیں کہ خورشید صاحب نے اس سلسلہ میں اپنے دورِ اقتدار میں کیا کیا۔ اس لئے ضروری یہ ہے کہ اس سلسلہ میں چند اہم اقدامات کا ذکر کر دیا جائے تا کہ حقائق عوام تک پہنچ سکیں۔

اصولِ ریاست اور دستور

جہاں تک اس کا تعلق ہے رولز آف بزنس کا ذکر آ چکا ہے چنانچہ ان کی جگہ ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی جو ہمارے تقاضوں کو پورا کر سکتا۔ بدقسمتی سے اس وقت بھی پاکستان میں مارشل لاء تھا۔ اس لئے میں اپنی کوشش میں کماحقہٗ کامیاب نہ ہو سکا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان اگر چہ پارلیمانی نظام پر راضی نہ ہوئے کیونکہ وہ خود صدارتی نظام کے حامی تھے اس لئے آزاد کشمیر میں جہاں پہلے سے ہی صدارتی نظام رائج تھا' وقتی طور پر اس کو اختیار کیا گیا کیونکہ اس وقت اہم ترین ضرورت انتخابات کی تھی۔

انتخابات کے بعد اور سٹیٹ کونسل کے قائم ہو جانے سے آزاد کشمیر کی سیاسی فضا میں بہت بڑی تبدیلی آئی اور مجھے ایک عرصے کے بعد قریب قریب یقین ہو چلا تھا کہ ہم جلد ہی مکمل پارلیمانی نظام کی طرف بڑھ سکیں گے مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میری مخالفت میں ہمارے بعض کرمافرماہی اس حد تک آگے چلے گئے کہ انہوں نے سرے سے ہی انتخابات کی مخالفت کی اور آزاد کشمیر حکومت کو با اختیار بنانے کے خلاف ماضی میں جائنٹ سیکرٹریوں سے اپنی وفاداریوں اور خدمات کی مثالیں دینے لگے۔

میں بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ فیلڈ مارشل ایوب خان اور

میرے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ جب ہم ایک دوسرے پر اعتماد کھو بیٹھیں گے تو میں مستعفی ہو جاؤں گا چنانچہ ایسے حالات پیدا کیے گئے جو بیشتر و اکثر ہمارے سیاسی مخالفین کی چغلیوں بے بنیاد و جھوٹے الزامات اور وزارتِ امورِ کشمیر کے افسروں کی اس نالائقی اور نا اہلیت کی پیداوار تھے جس کی نشاندہی میں نے بارہا کی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے ایوب خان سے اختلافات ہونے لگے۔ پہلی مرتبہ کھل کر مخالفت چار مسائل پر ہوئی۔ منگلا ڈیم کے بے دخل عوام کے لیے مناسب سہولتوں کا وعدہ مگر انتظامی طور پر اس عہد کا ایفا نہ ہونا' آزاد کشمیر فوج کی تنخواہوں کے سکیل' آزاد کشمیر میں ترقی کی رفتار کا کم ہونا اور بعض پاکستانی افسروں کا آزاد کشمیر میں غیر جمہوری رویہ۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ حالات پیدا ہو گئے ہیں جن کی بنا پر میرا مزید اپنے عہدے پر رہنا میرے اپنے ضمیر اور اختیار کردہ موقف کے خلاف ہوگا۔ میں نے صدر ایوب کو مطلع کیا مگر وہ اصرار کرتے رہے کہ مجھے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیے مگر کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے خود یہ محسوس کیا کہ ہمارا باہمی اعتماد ختم ہو چکا ہے۔ مجھے ان کا پیغام ملا اور میں نے اسی وقت اگست 1964ء میں اپنا استعفیٰ دے دیا۔ اس استعفے کے بارے میں بے شمار داستانیں اور فرضی قصے گھڑے گئے مگر حقیقت وہی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے ایک انتخابی قانون وضع کیا جو ہمارے قومی تقاضے ایک حد تک پورا کرتا تھا اور میں نے انتخابات کروا کر جمہوری ادارے قائم کروا دیئے تھے اور آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں پر وزارتِ امورِ کشمیر کی مالی اور نفسیاتی گرفت کو توڑ دیا تھا۔

میری حکومت کے اقدامات

1- آزاد حکومت کا نام: آزاد حکومت اس وقت آزاد کشمیر حکومت کہلاتی تھی چونکہ میرا بنیادی موقف یہ تھا کہ یہ حکومت پوری ریاست کی عوامی حکومت ہے جس کا نام جموں و کشمیر تھا۔ اس لئے میں نے یہ نام آزاد کشمیر حکومت سے بدل کر آزاد حکومت ریاست جموں و

کشمیر رکھا اور اس طرح ایک اہم تبدیلی لائی گئی۔ ویسے بھی آزاد کشمیر میں ضلع میر پور جواب ضلع میر پور اور کوٹلی میں تقسیم ہوگیا ہے نیز پونچھ صوبہ جموں کے علاقے تھے جبکہ مظفر آباد کا ضلع صوبہ کشمیر کا تھا' اس لحاظ سے بھی جموں و کشمیر کی آزاد حکومت اس کا مناسب نام معلوم ہوتا تھا اور ہے۔

2- مونوگرام: آزاد جموں و کشمیر حکومت کا کوئی مونوگرام یا ریاستی نشان نہیں تھا۔ اس سے قبل سرکاری کاغذات اور مراسلوں پر آزاد کشمیر کا جھنڈا بنایا جاتا تھا۔ میں نے مراسلات اور لفافہ جات کے لئے ایک مونوگرام تجویز کیا۔ اس میں اس وقت کے ہمارے سیکرٹری جنرل مسٹر جسٹس ایم ایس ایچ قریشی نے ایک دو تبدیلیاں کیں جو پسندیدہ تھیں۔ چنانچہ موجودہ مونوگرام جس میں چنار کا پتہ' پہاڑ اور دریا شامل ہیں' وضع کیا گیا۔

3- پرنٹنگ پریس اور گزٹ: اگر چہ آزاد حکومت کا ایک گزٹ تھا مگر کبھی تو اس کی صرف چند کاپیاں ٹائپ ہوتی تھیں اور کبھی سائیکلوسٹائل کے ذریعے چند کاپیاں تیار کی جاتی تھیں۔ یہ صورت شرمناک حد تک ناقابلِ برداشت تھی۔ بعض ایسے قانون بھی پاس کیے گئے جن کی صرف تین کاپیاں ٹائپ ہوتی تھیں۔ ایک عدالت کے پاس' ایک پولیس اور ایک وزارتِ قانون کے پاس ہوتی تھی۔ چند گزٹ اور قوانین راولپنڈی سے چھپوائے جاتے تھے مگر ساتھ ہی یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا کہ پاکستان میں پاس شدہ قوانین کو آزاد کشمیر پر عائد کر دیا جاتا تھا جو ایک مضحکہ خیز صورت بن گئی تھی۔ میں نے اس کی طرف توجہ دے کر ایک پرنٹنگ پریس قائم کیا جو اب کافی ترقی کر چکا ہے اور اس طرح سے صورتِ حال کو بہتر بنایا گیا۔

4- رسالے: میرا ہمیشہ یہ نظریہ رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر چونکہ بین الاقوامی شکل اختیار کر چکا ہے' اس لئے ہمیں بھی بین الاقوامی رائے عامہ کو مطلع رکھنے کے اقدامات کرنے چاہئیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک انگریزی پندرہ روزہ Azad Kashmir

News کے نام سے جاری کیا گیا جس کو بعد کی حکومتیں جاری نہ رکھ سکیں۔ آزاد کشمیر میں بنیادی جمہوری اداروں کے قیام کے بعد دیہات کی زندگی نے انگڑائی لی تھی۔ اس میں ربط قائم کرنے کے لئے ایک پندرہ روزہ اردو رسالہ ''جہانِ نو'' کے عنوان سے جاری کیا گیا مگر یہ بھی بعد کی حکومتوں کی نا لائقی اور عدم توجہ کا شکار ہو کر ختم ہو گیا۔

-5 آزاد کشمیر ریڈیو: آزاد کشمیر ریڈیو غالباً 1948ء میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا ہیڈ کوارٹرز تراڑکھل میں تھا مگر یہ ریڈیو فی الحقیقت آزاد کشمیر کی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے کوشش کر کے مظفر آباد میں آزاد کشمیر ریڈیو کا دوسرا اسٹیشن قائم کیا۔ اگرچہ ریڈیو سٹیشن اس طرح نہیں چل رہا جیسا کہ میری خواہش یا تجویز تھی مگر پھر بھی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کا باعث بنا۔

-6 ڈویلپمنٹ اور ترقیاتی منصوبے: صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد میں نے جب ڈویلپمنٹ اور ترقیاتی پروگراموں پر نظر ڈالی تو معاملہ قریب قریب خالی تھا۔ مسلم کانفرنس کی حکومت اس حکمتِ عملی پر کاربند تھی کہ جب تک مقبوضہ کشمیر آزاد نہیں ہو جاتا اُس وقت تک نہ تو ڈویلپمنٹ کی ضرورت ہے اور نہ ہی انتخابات کی۔ اس پالیسی کے پیچھے کیا مصلحتیں کارفرما تھیں، وہ کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہیں چنانچہ میں نے ڈویلپمنٹ بورڈ کی تشکیلِ نو کر کے منصوبہ بندی کی طرف توجہ دی۔

سکندر مرزا اور محترمہ فاطمہ جناح کی امداد

پہلی بات جو میرے نوٹس میں لائی گئی وہ یہ تھی کہ سکندر مرزا جب مظفر آباد دورے پر آئے (یہ میری آمد سے سال بھر یا اس سے بھی زیادہ قبل کی بات ہے) تو انہوں نے آزاد حکومت کی امداد کے لئے مبلغ 5 لاکھ روپے کی امداد کا اعلان کیا تھا مگر کسی نے ان سے یہ رقم لینے یا ان کو اس وعدے کی یاد دہانی کرانا مناسب نہیں سمجھا۔ پاکستان والے بھی بھول گئے۔ میں نے سب سے پہلے یہ رقم حاصل کی اور ڈویلپمنٹ بورڈ کے حوالے کی۔ اسی طرح محترمہ

فاطمہ جناح اپنے دورۂ آزاد کشمیر میں بعض مقامات پر ترقیاتی سکیموں میں امداد کا وعدہ کر گئی تھیں مگر اس طرف بھی کوئی توجہ نہ ہوئی۔ یہ رقم بھی حاصل کی گئی اور محترمہ کی خواہشات کے مطابق نقشے تیار کر کے سکیمیں مرتب کی گئیں اور سی ایم ایچ مظفر آباد میں زنانہ وارڈ' چھیاں' دھیر کوٹ اور کھڑت وغیرہ میں یہ رقم سکیموں پر خرچ ہوئی۔

ضلع مظفر آباد میں نیلم ویلی روڈ' نیلی ریشیاں روڈ اور چکار سراں روڈ کو پختہ کرنے کے منصوبے تیار کر کے عملی جامہ پہنایا گیا۔ ضلع پونچھ میں دوارندی سے عباس پور اور کھوئہ روڈ کا منصوبہ بنا کر اس پر عمل درآمد شروع ہوا۔ ضلع پونچھ میں منگ' سوا' راولا کوٹ روڈ کا منصوبہ جو ترک کر دیا گیا تھا' بحال کر کے اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا گیا۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں سکولوں' ڈسپنسریوں' شفاخانہ حیوانات' ڈاک بنگلوں کے منصوبے تیار کر کے مکمل کئے گئے۔ بے شمار پل' نرسریاں وغیرہ قائم کی گئیں جن کی تفاصیل غیر ضروری ہیں۔ مظفر آباد میں ایک سپورٹس سٹیڈیم جس کا نام ''نیلم سٹیڈیم'' رکھا گیا' قائم کیا گیا۔ بھمبر میں بجلی اور کوٹلی اور بھمبر میں نہر کے ذریعے آب پاشی کا منصوبہ تیار اور مکمل کیا گیا۔ دریائے جہلم اور نیلم پر کئی پل تعمیر ہوئے۔ غرضیکہ صرف 3 کروڑ روپے کی رقم سے جو منصوبہ تیار ہوا' اس میں ان کے علاوہ بن جوسہ اور چکار کو صحت افزا مقامات بنانے کے منصوبے بھی شامل ہیں۔ ان مثالوں کو پیش کرنے کا صرف یہ مدعا ہے کہ میں نے ماضی کی پالیسی کو ترک کر کے آگے کے لئے ترقیاتی عمل کی شاہراہیں کھول دیں۔ ضلع میر پور میں ہم منگلا بند کی وجہ سے کافی بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے کئی مشکلات بھی پیدا ہوتی رہیں۔

بجٹ

ڈویلپمنٹ پروگراموں کے لئے بجٹ کا باضابطہ ہونا ضروری تھا۔ اس سے قبل کوئی بجٹ کی شکل نہ تھی۔ گرانٹ کے نام پر کچھ رقم دی جاتی اور بجٹ دو سال تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اس میں بھی باضابطگی قائم کی اور یکم جولائی کو بجٹ پاس کیا جانے لگا۔

میں نے اپنی صدارت کے دوران سندھ طاس معاہدے پر بہت احتجاج کیا تھا اور میرا بیان اس زمانے میں چھپا تھا اور اس کا اتنا اثر ہوا کہ میرے پاس اس وقت مظفر آباد میں تین غیر ملکی نمائندے آئے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ تو حکومت پاکستان کے ایجنٹ ہیں مگر آپ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ''آزاد حکومت'' ہیں کیونکہ میں نے جو موقف اس میں اختیار کیا تھا' میں نے اس میں کہا تھا کہ کشمیر پر چوروں کا قبضہ ہے اور آپ نے چوروں کے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ لیکن اس معاہدے میں ...... میں نے ایک شق کا اضافہ کیا تھا کہ اس معاہدے پر مسئلہ کشمیر کے حل کے بعد نظر ثانی کی جاسکتی ہے۔

سالار بند کی تفصیلات میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ اس معاہدے میں جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تھا کہ پانی پینے کے لئے استعمال ہو سکتا ہے مگر آبپاشی کے لئے نہیں۔ بجلی بنانے کے لئے استعمال ہو سکتا ہے مگر کسی اور مقصد کے لئے نہیں۔ اگر سالار بند کا کام بجلی بنانا ہے تو پھر میرے خیال میں معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی لیکن ایک دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ چناب سے دور ایک نہر نکالی جائے جو بستی کے مقام پر گرائی جائے گی۔ لیکن کیا معلوم کہ وہ کسی اور کام کے لیے بھی استعمال کر لیں۔ اگر چہ ورلڈ بنک کی ٹیمیں یہاں جاتی رہتی ہیں مگر ہندوستان کی نیت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔

اس سالار بند کے حوالے سے 15 اگست کو راجیو گاندھی نے بھارت کے قومی دن پر جو تقریر کی ہے' اس میں کہا ہے کہ ہم سالار بند کو پانی دیں گے۔ وہ لوگ جو راجستھان کو پانی دینے کے منصوبے سے واقف ہیں' انہیں پتہ ہے کہ یہ سارا پانی انہوں نے جموں و کشمیر کے دریاؤں سے لینا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے خیال میں حکومتِ پاکستان کو اقوام متحدہ سے رجوع نہیں کرنا چاہئے۔

اگر حکومت پاکستان کے پاس کچھ شواہد ہیں تو کوئی بھی پانی چناب' جہلم اور سندھ ان تینوں دریاؤں میں سے ایک قطرہ بھی راجستھان یا ہریانہ کے لئے استعمال ہو رہا ہو تو

حکومت کو فوراً احتجاج کرنا چاہئے اور انٹرنیشنل کورٹ میں جانا چاہیے۔

میری سیاسی زندگی کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی ہے کہ میں پاکستان کی حکومت کو آزاد کشمیر میں گلگت اور بلتستان کی شمولیت اور آزاد کشمیر کی حکومت کو مناسب مقام اور تشخص دینے پر مجبور یا رضامند نہ کرسکا۔

آزاد کشمیر کی صدارت سے علیحدگی کے بعد میرا شروع کیا ہوا عمل روک دیا گیا اور نت نئے آرڈیننس اور مضحکہ خیز قوانین پاس کئے گئے۔ ان اقدامات کے خلاف میری جماعت نے 69-1968ء میں جمہوری نظام کے لئے تحریک چلائی اور خدا کے فضل سے یہ تحریک کامیاب ہوئی اور آزاد کشمیر میں کافی حد تک جمہوری عمل بحال ہوگیا۔

شروع میں ایوب خان کے رویے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ چنانچہ میرے مطالبے پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ آزاد حکومت کو تسلیم کرنے کے معاملے پر غور کریں گے مگر آہستہ آہستہ سرکاری ملازمین اور افسر شاہی کے کارندوں کا رنگ ان پر چڑھنا شروع ہوگیا۔ 1964ء میں جب بھارت اور چین کی جنگ ہوئی تو میں ایوب خان سے ملا۔ وہ ان دنوں گلگت میں تفریح کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یہ خبر سن کر واپس آنے کی بجائے انہوں نے پروگرام میں ایک دن کا اضافہ کرلیا۔ واپس لوٹے تو میں نے کہا کہ اس وقت یہاں کے عوام سخت خوف کے عالم میں مبتلا ہیں۔ بھارتی فوجی افسر میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج رہے ہیں۔ اس موقع پر کشمیری چاہتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کے حریت پسندوں کی مدد کے لیے کوئی منصوبہ بنایا جائے لیکن ایوب خان نہ مانے اور سختی سے اس مؤقف پر قائم رہے کہ بھارت بہت بڑا ملک ہے ہم اس سے جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ رہی یہ بات کہ 1965ء میں انہوں نے یہ خطرہ کیسے مول لیا' میرا پختہ یقین ہے کہ 1965ء کی جنگ کے جو اسباب بنے، ایوب خان ان سے قطعی لاعلم تھے۔ وزارت خارجہ، داخلہ اور امور کشمیر کے چند اعلیٰ افسروں اور سیکرٹریوں نے جن میں اے بی

اعوان، قدیر احمد، عزیز احمد اور بھٹو صاحب تھے' ان کی لاعلمی میں سارا منصوبہ بنایا، یا کم ازکم انہیں اس حد تک یقین دلوایا کہ چھوٹا سا پروگرام ہے اور اس حد تک سنگین نہ ہوگا۔ انہیں بعض غیر ملکی سفیروں سے بھی یقین دلوایا گیا۔ اس پر بھی شاید وہ نہ مانتے کیونکہ میرا ایمان ہے کہ ایوب خان جو بھارت سے متحدہ دفاع کی پیش کش تک کر چکے تھے، کبھی جنگ پر راضی ہونے والے نہیں تھے لیکن ان افسروں نے جو شائد اس طریقے سے ایوب خان کو کمزور کرنا چاہتے تھے، اپنے طور پر سب تیاریاں کر لیں۔ بھٹو صاحب اور اعوان صاحب سے ایوب خان کی اصل ناراضگی کا سبب یہی ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں واقعات سے لاعلم رکھا گیا ہے۔ اس وقت میں کراچی میں تھا۔ مجھے 19 اگست 1965ء کو انقلابی کونسل کے متعلق ریڈیو پر خبر ملی۔ میں نے کراچی میں عزیز احمد سے ملاقات کی۔ وہ کچھ بتانے پر راضی نہ ہوئے۔ میں نے کہا کشمیری لیڈروں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ میں نیک نیتی سے سمجھتا ہوں کہ جو لوگ بھی یہ کام کر رہے ہیں' ان کی منصوبہ بندی درست نہیں۔ وہ خاموش رہے۔ میں پنڈی پہنچا اور وزیر امور کشمیر علی اکبر صاحب سے ملا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ میری معروضات ایوب خان تک پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے ہوم سیکرٹری معز الدین سے ملنے کی ہدایت کی۔ اسی شام پولیس نے زبردستی مجھے ایک جیپ میں ڈالا اور آزاد کشمیر لے گئی۔ اگلے روز اخبارات میں یہ خبر دی گئی کہ مجھے رشوت اور بدعنوانی کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے اور یہ جرائم میں نے دورِ صدارت میں کئے تھے۔

1965ء کی جنگ ہمارے اوپر مسلط کر دی گئی۔ میرے خیال میں پاکستان کے بعض اعلیٰ افسران کو غلط سمت لگایا گیا۔ مثال کے طور پر میری پارٹی جموں وکشمیر لبریشن لیگ اور دوسری پارٹیاں بھی جموں وکشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت کی خواہاں ہیں لیکن حکومت پاکستان اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم ہمیں اٹھانے نہیں دیتی' نہ خود کچھ کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں اس لئے کہ آزاد کشمیر کے صدر کی حیثیت سے میں نے صدر ایوب خان سے اس مسئلے

پر کئی بار بات کی تھی۔ خاص طور پر 1962ء میں جب بھارت چین کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ ایوب خان جنگ کرنے کے سخت خلاف تھا اور کسی قیمت پر بھارت سے دشمنی مول لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے میرا مذاق اڑایا اور کہنے لگا ''تم غیر فوجی لوگ نہیں جانتے کہ جنگ کتنی ہولناک ہوتی ہے۔صرف ایک سپاہی جانتا ہے کہ جنگ کتنی مشکل اور کٹھن ہے' یہ آسان نہیں ہوتی۔ ہمیں بین الاقوامی حالات کی روشنی میں کسی بہتر وقت کے لئے ان مسائل کے حل کا انتظار کرنا چاہئے''۔ یہ تو ایوب خان کی پالیسی تھی لیکن ان ہی دنوں امریکہ نے دیکھا کہ پاکستان چین سے دوستی بڑھا رہا ہے' آر سی ڈی (RCD) اور سینٹو (CENTO) کی وجہ سے ایوب خان طاقت ور ہو رہا ہے تو امریکہ نے سوچا کہ ایوب خان کو کسی طرح کمزور کرنا چاہئے۔ چنانچہ چند پاکستانی افسروں کی مدد سے ایک ایسا لائحہ عمل بنایا گیا جسے ''آپریشن جبرالٹر'' کا نام دیا گیا۔ ایوب خان نے اسے مسترد کر دیا لیکن کسی نہ کسی طرح 1965ء کی جنگ امریکہ نے پاکستان پر مسلط کر دی۔

میرے خیال میں 1965ء کی جنگ میں مسٹر بھٹو کا رول صرف یہ تھا کہ انہوں نے ایوب خان کو بتایا کہ امریکہ نے یقین دہانی کروائی ہے کہ بھارت بین الاقوامی سرحدیں عبور نہیں کرے گا اور پاکستان اپنی فوجی کارروائیاں صرف کشمیر تک محدود رکھے گا۔ ایک لحاظ سے امریکہ کی طرف سے یہ ایک ایسا عہد تھا جس سے ایوب خان 1965ء کی جنگ میں کوئی مخالفت نہ کر سکے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔

کشمیر میں گوریلے بھیجنے کی کارروائی ایک بھونڈی کارروائی تھی اور یہ بدنیتی پر بھی مبنی تھی۔ یہ ایک سازش تھی جس کی وجہ سے کشمیر کی تحریک آزادی کو بھی نقصان پہنچا اور پاکستان 1965ء کی جنگ سے دوچار ہو گیا۔ جب کشمیر میں گوریلے بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تو میں نے اس کارروائی کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ اس پر مجھے فوراً گرفتار کر لیا گیا اور دلائی کیمپ میں رکھا گیا۔ میں دلائی کیمپ کا پہلا قیدی تھا۔ مجھے اس کیمپ میں 6 ماہ کے لیے قید تنہائی

میں رکھا گیا۔ گوریلے بھیجنے کی اس کارروائی میں جو انداز فکر کار فرما تھا' میں اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ آزادیٔ کشمیر کی تحریک کشمیری عوام کی ہے لیکن گوریلوں کو تربیت دینے اور انہیں مقبوضہ علاقے میں بھیجنے کا کام پولیس کے چند افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ اے۔ بی۔ اعوان کے محکمۂ انٹیلی جنس نے مقبوضہ کشمیر کے متعلق فرضی داستانوں کو گھڑا اور ان داستانوں کی بنیاد پر اس گوریلا کارروائی کا منصوبہ بنایا گیا۔ درحقیقت یہ ایوب خان کو کمزور کرنے کی ایک سازش تھی۔ یہ ایک ایسی گوریلا جنگ تھی جس میں گوریلا جنگ کا جذبہ اور سیاسی پس منظر ہی مفقود تھا۔ اس کا اصلی مقصد مقبوضہ کشمیر کی آزادی کی بجائے ایوب خان کو اقتدار سے محروم کرنا اور پاکستان کی فوجی طاقت کو زک پہنچانا تھا۔ اس سازش میں فوج کے چند جرنیل، محکمۂ خارجہ و محکمۂ داخلہ کے بعض افسران اور چند مشہور سیاست دان شریک تھے۔ یہ لوگ ایوب خان کو راستے سے ہٹانا چاہتے تھے اور انہیں اس کی یہی تدبیر سوجھی کہ کشمیر کے نام پر ایوب خان کی حکومت کو بھارت سے بے وقت اور بے تکے انداز میں لڑا دیا جائے تاکہ بعد کے حالات کی ذمہ داری ایوب خان پر ڈال کر اسے نکال باہر کیا جا سکے۔

میں اس وقت پاکستان میں شاید واحد شخص ہوں جو ہندوستان کی جیل میں بھی رہا۔ پاکستان کی جیلوں میں بھی رہا ہوں اور آزاد کشمیر میں بھی قید و بند کی آزمائشوں سے گزرا۔ بہرحال میں نے قید و بند کی صعوبتوں کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ سیاست میں یہ نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ ان مشکل حالات کا ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کرنا چاہئے۔

میری دانست میں کشمیر میں 1965ء میں آزادی کی جو تحریک اٹھی، اس کی ناکامی کے اسباب یہ تھے:

1- کشمیری لیڈروں کو اعتماد میں نہ لیا گیا۔

2- منصوبہ بندی غلط تھی۔ جو لوگ مقبوضہ کشمیر میں کارروائیاں کر رہے تھے' ان کا کسی بڑی تنظیم سے کوئی رابطہ نہ تھا۔

3- جن حوالوں اور رپورٹوں پر ان کی رہنمائی کی گئی تھی، وہ سب آوٹ آف ڈیٹ اور غلط تھیں۔

4- ان کی قیادت کا پتہ نہ چلتا تھا۔

5- مقبوضہ کشمیر کے عام مسلمانوں کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ کیا گیا تھا۔

6- مجاہدین کی اکثریت بعض علاقوں کی مقامی زبانیں تک نہ جانتی تھی۔

1965ء کی جنگ کے سبب بھارت اور پاکستان کے تعلقات اور خراب ہو گئے اور جے پرکاش نارائن جیسا لیڈر یہ کہنے لگا کہ اب بھارت نے کشمیر کے لئے اپنا خون بہایا ہے اس لئے اب رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک پاکستان کے اندرونی حالات کا تعلق ہے اس جنگ نے ایوب خان کو بہت کمزور کر دیا۔لوگ بھی ناخوش ہو گئے۔ایوب خان بدنام ہو گیا۔مسٹر بھٹو نے تاشقند میں سخت رویہ اختیار کیا اور ایوب خان کا زوال شروع ہو گیا۔ جہاں تک شیخ عبداللہ کی آمد کا تعلق ہے ان کے آتے ہی پنڈت نہرو کا انتقال ہو گیا۔اس لئے مجھے بالکل موقع نہ ملا کہ میں شیخ عبداللہ سے کشمیر کے سلسلے میں کوئی بات کر سکتا۔

ایوب خان نے ان دنوں شیخ عبداللہ کے ساتھ تین یا چار دن مری اور راولپنڈی میں گزارے۔لیکن میرے خیال میں شیخ عبداللہ نے کوئی خاص بات نہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ گفت وشنید ہونے سے پہلے دونوں ملکوں میں دوستی کی فضا قائم ہونی چاہئے۔حکومتیں قریب آئیں گی تو لوگ قریب آئیں گے اور اس طرح مسائل حل ہو سکیں گے۔ہو سکتا ہے اس طرح رائے شماری ہو سکے یا کوئی اور حل نکالا جا سکے یا کشمیر کو ایک آزاد غیر جانبدار حصہ قرار دیا جا سکے لیکن ان کے سارے خیالات واضح نہیں تھے۔بعد میں ایوب خان نے اپنی کتاب Friends Not Masters میں لکھا کہ شیخ عبداللہ ان سے باہمی دفاع اور کنفیڈریشن کی بات کرنے آیا تھا۔لیکن شیخ عبداللہ نے اس کی تردید کر دی تھی اور کہا تھا ''یہ

درست نہیں ہے۔ہم نے اس طرح کا کبھی نہیں سوچا اور ہم اس قسم کے لوگ نہیں ہیں ۔ہو سکتا ہے کنفیڈریشن کی بات ہوئی ہو۔ ایوب خان نے خود نہرو سے باہمی دفاع کی بات کی تھی ۔میرے خیال میں شیخ عبداللہ ایک کھلے ذہن کے ساتھ پاکستان آیا تھا۔ پنڈت نہرو کے رویے میں بھی چین کی لڑائی کے بعد ایک تبدیلی آ گئی تھی ۔ ہوسکتا ہے شروع میں سوچی ہوئی باتیں حالات سے بے اثر ہوگئی ہوں۔

جنوری 1973ء میں مظفر آباد میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ: ''اگر صدر بھٹو معاہدہ شملہ کے تحت کشمیر کے کسی مثبت حل کے بارے میں پر امید ہیں تو پھر ہم ان کی کوششوں کے نتائج کا انتظار کریں گے لیکن اس کے بعد آزاد کشمیر حکومت کو ساری ریاست کی نمائندہ حکومت تسلیم کر کے یا اس کے متبادل کسی ٹھوس پروگرام بنانے میں تاخیر نہیں ہونا چاہئے ۔صدر بھٹو سے منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے آزاد کشمیر حکومت کو تسلیم کرنے کے مطالبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ گزشتہ 25 سالوں میں پاکستان کی کسی حکومت نے اسے مفید نہیں سمجھا۔ ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ گزشتہ حکومتوں نے مسئلہ کشمیر کے اس پہلو پر غور نہیں کیا' اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے جذباتی نعرہ بازی ترک کر کے مثبت پروگرام مرتب کرنا چاہئے ۔

جہلم ویلی روڈ کو مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے لوگوں کی آمدورفت کے لئے کھول دینا چاہئے ۔آزاد کشمیر کی برسراقتدار جماعت اس علاقہ پر اکتفا کرنا چاہتی ہے۔اس سلسلے میں کسی خفیہ قرارداد کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ یہ مسئلہ کشمیر کے مستقبل سے تعلق رکھتا ہے۔کسی گروہ کو اختیار نہیں کہ وہ قوم کو بے خبر رکھ کر کسی قسم کی سودا بازی کرے اگر کسی ایسی قرارداد کا وجود ہے تو اس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں اور ایسی ہر کوشش جو کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے منافی اور کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرنے پر مبنی ہوگی' آزاد کشمیر کے عوام قبول نہیں کریں گے۔ایک طرف بھارت کنٹرول لائن کو مستقل سرحد قرار دے رہا ہے جیسا کہ سردار

سورن سنگھ کے بیانات اور مغربی مما لک کے اخبارات کے تبصرے اس قسم کا تاثر دے رہے ہیں اور دوسری طرف آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے اور پاکستان کی قومی اسمبلی میں نمائندگی کا مطالبہ کرنے سے شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ حکومتِ پاکستان کو چاہئے کہ اس بارے میں اپنی پوزیشن واضح کرے اگر بھارت کشمیر سمیت سارے جھگڑے طے کرنا چاہتا ہے تو اسے جنگی قیدیوں کو بلاتاخیر واپس کر دینا چاہئے''۔

شملہ میں خفیہ سمجھوتہ

جہاں تک معاہدۂ شملہ کے موقع پر بھٹو صاحب اور اندرا گاندھی میں کشمیر کے مسئلہ پر خفیہ سمجھوتے کی خبروں کا تعلق ہے تو ان خبروں کی حقیقت اور صداقت ابھی تک مشتبہ ہے کیونکہ حکومتِ ہند کی طرف سے سرکاری اعلان میں کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ کچھ خبریں شائع ہوئی ہیں لیکن کشمیر کے متعلق معاہدہ خفیہ ہو یا اعلانیہ، کشمیری عوام کی منظوری کے بغیر اس کی حیثیت ردی کے پرزے کی ہے۔ تنازعہ کشمیر میں اصل فریق کشمیری عوام ہیں جو معاہدہ ان کی مرضی اور منظوری سے نہ ہو وہ کسی کام کا نہیں۔ یہ ہمارا بنیادی موقف ہے اور اس بنا پر جموں و کشمیر لبریشن لیگ نے ہمیشہ معاہدۂ تاشقند اور معاہدۂ شملہ دونوں کی مخالفت کی کیونکہ ان دونوں معاہدوں میں نہ تو کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کی توثیق کی گئی ہے اور نہ اس سلسلے میں کشمیری عوام کی منظوری حاصل کی گئی تھی۔

اگر شملہ میں بھٹو اور اندرا گاندھی کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ ہوا بھی تو اس کو شملہ معاہدہ کا حصہ قرار نہیں دیا گیا اور یہ خفیہ مفاہمت شملہ معاہدہ سے الگ ایک چیز ہے اور یہ اندرا بھٹو کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس لیے شملہ معاہدہ صحیح ہو تب بھی پاکستانی عوام یا کشمیری عوام کسی خفیہ سمجھوتہ کے جس کے متعلق انہیں کچھ علم نہیں پابند نہیں ہو سکتے۔ اندرا اور بھٹو میں اگر کوئی ذاتی مفاہمت تھی تو ان کے ساتھ ہی یہ ختم ہو گئی۔ اصولاً بھی حکومتیں صرف انہی معاہدوں کی پابند ہو سکتی ہیں جو ان ملکوں کی قومی اسمبلیوں یا کسی مجاز ادارہ میں توثیق شدہ

ہوں اور خفیہ سمجھوتہ کی چونکہ توثیق نہیں ہوتی اس لیے نہ یہ لاگو ہو سکتا ہے اور نہ اس کا کوئی پابند ہے اور ہم بھارتی حکومت کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ کسی خفیہ معاہدہ کی خبر کو بنیاد بنا کر مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی ضرورت سے انکار کرے۔ اگر بھارت نے یہ طرز عمل اختیار کیا تو یہ اس پاک بھارت مفاہمت کو ختم کرنے کی کارروائی ہوگی جو جنرل ضیاالحق اور نئی جنتا حکومت کی پالیسیوں کے نتیجہ میں پیدا ہو رہی ہے۔ اگر بھارت اس مفاہمت کو پروان چڑھانا اور نتیجہ خیز بنانا چاہتا ہے تو اسے مسئلہ کشمیر کے حل کی ضرورت تسلیم کرنا ہوگی۔

جنتا حکومت کا رویہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ جنتا قیادت و حکومت سابق نہرو خاندان کی قیادت اور حکومت سے مختلف نظریات اور مزاج رکھتی ہے۔ جے پرکاش نرائن جنتا پارٹی کے مہاتما گاندھی ہیں۔ یہ وہی جے پرکاش نرائن ہیں جو 65ء تک کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی حمایت کرتے رہے ہیں اور انہوں نے برس ہا برس تک یہ کہا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ طے شدہ نہیں ہے اور بھارت نے بین الاقوامی برادری میں وعدہ کیا ہے کہ یہ مسئلہ کشمیری عوام کی مرضی سے طے کیا جائے گا۔ اس وعدہ سے انحراف کرنا بھارت کا اخلاقی اصولوں سے انحراف کرنا ہوگا۔ یہ بات جے پرکاش نرائن 65ء تک کہتے رہے ہیں البتہ 65ء کی جنگ کے بعد انہوں نے خاموشی اختیار کر لی مگر ہمیں یقین ہے کہ وہ اب بھی اپنے خیالات پر قائم ہوں گے۔ جنتا پارٹی میں راج گوپال اچاریہ کی سونتر اپارٹی بھی پیلو مودی صاحب کی رہنمائی میں شامل ہے اور یہ پارٹی بھی کشمیر کے متعلق پنڈت نہرو کے خیالات کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ جن سنگھ انتہا پسند اور متعصب پارٹی رہی ہے لیکن اب اس کے رویہ میں واضح تبدیلی کے آثار ہیں۔ اس سارے پس منظر کی بنا پر ہی جموں و کشمیر لبریشن لیگ نے بھارتی وزیر خارجہ شری باجپائی کے دورۂ پاکستان کی حمایت کی تھی۔ جو لوگ باجپائی کے دورۂ پاکستان کے موقع پر مخالفانہ شور برپا کر رہے تھے ان کا نقطہ نظر حقیقت پسندانہ نہیں تھا۔ بھارت میں پہلی بار

ماضی کے مقابلے میں ایک مختلف ذہن اور مزاج کی لیڈر شپ آئی ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے ۔ اس نئی لیڈر شپ سے رابطہ قائم کرنا' اس کا نقطۂ نظر سمجھنا، اسے اپنا نقطۂ نظر سمجھانا ضروری تھا۔ اس اعتبار سے باجپائی کا دورۂ پاکستان مفید تھا اور ہمیں امید ہے کہ ضیا الحق کا دورۂ بھارت مزید مفید ثابت ہوگا۔ تاہم ابھی سے بہت زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونا صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ان کی حکومت مختلف پارٹیوں کا مجموعہ ہے اور مختلف عناصر ہیں۔ آخر کون غالب آئے گا' ابھی معلوم نہیں ہوسکتا۔ لیکن باجپائی نے اپنے دورۂ پاکستان کے موقع پر یقیناً ایک مثبت تاثر دیا ہے اور ممکن ہے کہ بھارتی رہنماؤں میں کشمیر کے متعلق نیا انداز فکر جنم لے سکے۔ ہمیں اس بارے میں نہ مایوس ہونے کی ضرورت ہے' نہ زیادہ پر امید ہونے کی ضرورت ہے ۔ حالات آئندہ کیا شکل اختیار کرتے ہیں' یہ کچھ عرصے میں واضح ہو جائے گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بھارت کے موجودہ وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی بنیادی طور پر ایک روحانی اور اخلاقی شخصیت ہیں ۔ انہوں نے صدر کارٹر کی دہلی آمد کے موقع پر بھی یہ اعلان کیا تھا کہ بھارت بین الاقوامی تنازعات اور معاملات میں اخلاقی اصولوں کی برتری کو اہمیت دے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً مرارجی ڈیسائی کو تنازعۂ کشمیر کے اخلاقی پہلو پر بھی نگاہ رکھنا ہوگی کہ بھارت نے ساری دنیا سے استصوابِ رائے کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدہ سے انحراف اخلاقی اصولوں سے انحراف ہوگا۔ یہ بات کہنا کہ وعدہ اور معاہدہ پرانا ہوگیا ہے' غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتو پھر ہر وعدہ اور معاہدہ کے متعلق یہ بھی سوچنا ہوگا کہ یہ کتنے عرصے کے لیے کارآمد رہے گا اور کب پرانا قرار دے کر فراموش کر دیا جائے گا۔

مقبول بٹ مرحوم نے 1962ء میں ہماری جماعت کی پشاور شاخ میں کام بھی کیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے ہماری جماعت چھوڑ دی۔ شیخ عبد اللہ کے دورۂ پاکستان کے بعد وہ محاذ رائے شماری میں شامل ہو گئے اور پھر انہوں نے کشمیر لبریشن فرنٹ بنا لی ۔ کشمیر لبریشن فرنٹ کی تشکیل کے بعد پہلا واقعہ گنگا طیارے کا اغوا تھا۔ اس وقت طیارہ اغوا

کرنے والے نوجوانوں ہاشم قریشی وغیرہ نے کہا تھا کہ وہ مقبول بٹ کے فرنٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر مقبول بٹ خود بھارت جانے کے بعد وہاں گرفتار ہو گئے۔

ہم نے صدر ضیاالحق کو دو مرتبہ درخواستیں ارسال کیں، بیانات دیتے رہے اور مطالبہ کرتے رہے کہ مقبول بٹ کے پاس پاکستانی پاسپورٹ ہے۔ اسے قیدیوں کے تبادلے میں پاکستان لایا جا سکتا ہے۔ خدا جانے کیا مصلحتیں تھیں کہ کسی طرف سے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مقبول بٹ کشمیر کو بھارت کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ ہم بھی بھارت کی سپریم کورٹ، ہائی کورٹ کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر مقبول بٹ نے کوئی جرم کیا تھا تو وہاں کی عدالتوں یا صدر کو اس بارے میں کوئی کارروائی کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں ان کے جتنے محکمے کام کر رہے ہیں، ہماری نظر میں ان کا وجود غیر قانونی ہے۔ مقبول بٹ لبریشن فرنٹ کے حوالے سے شہرت رکھتے تھے۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ لبریشن فرنٹ کشمیر پر آزادی کے لیے قتل کرنے کا الزام بے معنی تھا کیونکہ اس طرح کی چھوٹی موٹی کارروائیاں گوریلا سرگرمیوں کے دوران ناگزیر ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف جاپان میں لاکھوں افراد کو ایٹم بم سے ہلاک کر دینے کو جائز تصور کیا جاتا ہے اور دوسری طرف آزادی کے لیے کسی شخص کا ایسا جرم بھی ناقابل معافی گردانا جاتا ہے جو بے معنی بات ہے۔ مقبول بٹ کے تختۂ دار پر لٹکانے کے اس واقعہ سے دو باتیں سامنے آتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کشمیری نوجوانوں میں آزادی کا جذبہ موجود ہے اور پاکستان کی حکومت کو اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

جہاں تک کشمیریوں کا تعلق ہے، ان کی سوچ واضح ہے۔ اگر بھارتی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ وہ کشمیر کو سیکولر سٹیٹ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی تو مقبول بٹ کی قربانی اس بات کو واضح کرتی ہے کہ کشمیریوں نے بھارت کا سیکولر تصور مسترد کر دیا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں کو کشمیر کے معاملے میں اپنی پالیسی تبدیل کرنا ہوگی۔ میں 1962ء سے

یہ کہہ رہا ہوں کہ کشمیر کے بارے میں ہماری پالیسی واضح ہونی چاہیے مگر پاکستان کی حکومت کے اپنے مسائل ہیں۔

مہاترے کے قتل سے پہلے مقبول بٹ کو آزاد کر دینے کا مطالبہ کرنے والوں نے الٹی میٹم کی مدت بھی پوری نہیں ہونے دی۔ ادھر بھارتی کابینہ کے ہنگامی اجلاس اور پاکستان آنے والے بھارتی صحافیوں کی اندرا کے بارے میں آراء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بھارت کو متحد رکھنے کے لیے یا تو ایک بڑے حکمران کا وجود ضروری ہوتا ہے یا پھر خوف و ہراس کی فضا پیدا کر کے اور نفرت کے ہتھیار کو کام میں لا کر ہندو رہنماؤں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا اقدام بھی اس کی ایک کڑی ہو سکتا ہے۔

میں پاکستان کی سیاسی جماعتوں اور موجودہ حکومت سے یہ مطالبہ کروں گا کہ کشمیر کے بارے میں مشترکہ قومی پالیسی وضع کی جائے۔ گلگت اور بلتستان کو آزاد کشمیر اسمبلی میں نمائندگی دی جائے اور آزاد کشمیر میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ لوگ اپنی تحریک چلا سکیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ کشمیری نوجوان اپنے اپنے طور پر ایسی تنظیمیں بنائیں اور انفرادی سطح پر ایسے کام کریں جن سے مقبوضہ کشمیر میں موجود بھارت کی بڑی فوج کا صحیح مقابلہ ممکن ہو سکے۔

مقبول بٹ کو بھارتی حکومت نے جن حالات میں اور جس جرم میں پھانسی کی سزا دی ہے اس پر میرا ردعمل وہی تھا جو ہر کشمیری کا ہے۔ اس واقعے نے ایک بار پھر ہم لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں تھوڑا سا پس منظر بیان کروں گا۔ کشمیر کی تحریکِ آزادی تو 1931ء میں شروع ہوئی تھی اور کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے۔ اس جنگ نے مختلف وقتوں میں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ دہلی کی جیل میں مقبول بٹ کے مسکراتے ہوئے تختہ دار پر جانے کے تازہ ترین واقعے نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ کشمیری اپنے نصب العین کی

خاطر جان کا نذرانہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ خیال باطل ہو جاتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ 13 جولائی 1931ء کو سری نگر میں 22 مسلمان کشمیری نوجوانوں نے شہید ہو کر جس تحریکِ آزادی کا آغاز کیا تھا، وہ مقبول بٹ کی شہادت سے ایک بار پھر دنیا بھر میں موضوع بحث بن گئی ہے۔ اس وقت پوری ریاست میں آگ پھیلی ہوئی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی فوجیں صورتِ حال پر قابو نہ پا سکیں اور اس نے وائسرائے ہند سے اپیل کی اور وائسرائے نے کشمیر آرڈر پاس کیا جس کے تحت برطانوی فوج کی گورا پلٹنیں کشمیر بھی گئیں۔ کشمیر میں مارشل لاء نافذ ہوا اور ریاست کے مختلف علاقوں میں گولیاں چلیں۔ اس طرح سیاسی ایجی ٹیشن جاری رہی۔ 1947ء میں اس تحریک نے جنگِ آزادی کی صورت اختیار کر لی۔ ریاست بننے کے بعد قبائلی اور رضا کار امداد کو پہنچے۔ مسئلہ اقوام متحدہ میں پہنچا۔ ادھر جموں کے ڈوگرہ مہاراجہ کے اشارے پر تقریباً دو لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ چند لاکھ پاکستان پہنچے اور آزاد حکومت قائم ہو گئی۔ مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کی کارروائی کو اس زاویئے سے دیکھنا چاہیے کہ آزاد کشمیر کی حکومت کا بنیادی مقصد یہ تھا اور ہے بھی کہ پورے کشمیر کی ریاست کو آزاد کرا کر وہاں پر مقامی باشندوں کی مرضی کے مطابق جیسا کہ سلامتی کونسل میں بھی طے ہو چکا ہے، ان کے مستقبل کا فیصلہ کیا جاتا مگر بدقسمتی سے آزاد کشمیر کی حکومت کو وزارت امور کشمیر کے تحت ایک ضلعی ادارے کی صورت دے دی گئی۔

ہرارے کانفرنس

ہرارے کانفرنس ناوابستہ ممالک کی سہ سالہ چوتھی کانفرنس تھی۔ ان کے طریقۂ کار کے مطابق 3 سال کے بعد ایک چھوٹی کانفرنس میں ناوابستہ ممالک تحریک سے متعلقہ ممالک کے سربراہ شرکت کرتے ہیں۔ اس مرتبہ سب سے زیادہ یعنی ایک سو ایک ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں عموماً نمائندگی ان ممالک کو ملتی ہے جو اس کے باقاعدہ ممبر ہوں مثلاً پی ایل او، سواپو، زمبیا اور پولیسارو فرنٹ۔ دوسرے الفاظ میں یہ

غریب ممالک کی ایک کانفرنس تھی ۔ امیر ممالک یا تو مغربی بلاک میں ہیں یا مشرقی بلاک میں ۔ اس ناوابستہ تحریک میں ایک حد تک غریب ممالک ہی شریک ہیں ۔

اس کانفرنس میں مختلف ممالک کا جہاں ایک دوسرے سے رابطہ رہتا ہے وہاں اس کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں ۔ خصوصاً ایسے مسائل زیر بحث لائے جاتے ہیں جن کا تعلق عموماً پسماندہ ممالک سے ہے ۔ مثلاً اس مرتبہ جو سب سے اہم مسئلہ زیر بحث آیا وہ جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے خلاف پابندیاں عائد کرنے کے متعلق تھا ۔

اس کارروائی میں ایک فیصلہ یہ کیا گیا کہ نسل پرست حکومت کے خلاف اقتصادی پابندیاں عائد کر کے اس کی اقتصادی ناکہ بندی کی جائے اور اس کے لئے بڑی طاقتوں سے کہا جائے ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امریکہ کی کانگرس نے اس کانفرنس کے بعد ایک قانون پاس کیا جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جنوبی افریقہ کے خلاف پابندی عائد کرے لیکن صدر ریگن نے اس قانون کو مسترد کر دیا ۔ اب امریکہ کے قانون کے مطابق کوئی ایسا قانون جسے کانگرس پاس کر دے اور صدر مسترد کر دے تو پھر اسے دوبارہ کانگرس میں پیش کیا جاتا ہے اور اگر دوبارہ کانگرس پاس کر دے تو وہ قانون نافذ ہو جاتا ہے اور صدر کی رائے بے اثر ہو جاتی ہے ۔ اس سال بھی ایسا ہی ہوا ۔ صدر ریگن نے اس پر اعتراض تو کیا لیکن کانگرس نے دوبارہ اسے پاس کر کے صدر کی ویٹو کو مسترد کر دیا ۔ میرے خیال کے مطابق یہ ہمارے کانفرنس کی بہترین کامیابی ہے کہ اس کی اپیل پر امریکہ میں یہ قانون پاس ہوا ۔ یہ کانفرنس تو آزاد ممالک اور آزادی کی سرگرم تحریکوں کے لئے بہت ضروری پلیٹ فارم ہے ۔

پاکستان نے اس کانفرنس میں کوئی خاص رول ادا نہیں کیا ۔ پاکستان کو چاہئے تھا کہ ترقی پذیر ممالک کے لئے کوئی تحریک پیش کرتا لیکن پاکستان نے ڈپلومیٹک سطح پر کوئی کوشش نہیں کی ۔

ہم باضابطہ رکن یا ممبر کی حیثیت سے شامل نہیں ہوتے تھے۔ ہماری جماعت جموں وکشمیر لبریشن لیگ نہ تو ناوابستہ تحریک کی ممبر ہے نہ ہمیں کسی نے دعوت دی۔ یہاں ممبر شپ کا طریقہ کار یہ ہے کہ اگر کوئی تحریک اس کانفرنس کی ممبر بننا چاہے تو وہ درخواست دیتی ہے یہ درخواست ایک خاص کمیٹی کے سامنے پیش ہوتی ہے۔ وہ اس پر بحث کرتی ہے کہ اس درخواست کو قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اس کے بعد یہ درخواست اور سفارشات کھلے اجلاس میں ہوتی ہیں۔ یہاں خوب بحث ہوتی ہے اور پھر فیصلہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے کوئی درخواست پیش نہیں کی تھی کیونکہ ہماری جماعت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آزادیٔ کشمیر کے لیے ابھی تک ہم نے مسلح جدوجہد کا فیصلہ نہیں کیا۔ اب دوسرا طریقہ یہ رہ جاتا ہے کہ ہم عالمی رائے عامہ کو بیدار کریں۔ سیاسی دباؤ ڈالیں' سیاسی بیداری اور تحریک پیدا کر کے دنیا کو کشمیر کے مسئلے سے روشناس کرائیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ حکومت بھارت نے شملہ معاہدہ کے بعد بڑی مکاری سے ساری دنیا کو یہ تاثر دے رکھا ہے کہ اب مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اسے کسی دوسرے فورم میں نہ اٹھایا جائے۔ بھارت اس کا بہت برا مناتا ہے کہ پاکستان کی حکومت اس مسئلے کو کسی بین الاقوامی فورم میں اٹھائے۔ ہم نے اس سال یہ محسوس کیا اور قدرتی بات یہ ہوئی کہ باقی تحریک آزادی کی جماعتوں نے مل کر 27 جولائی کو برمنگھم (انگلینڈ) میں ایک آل پارٹیز کشمیر کانفرنس طلب کی۔ اس میں 12 کشمیری نمائندے شریک ہوئے تھے۔ وہاں ہم نے ایک 6 نکاتی پروگرام طے کیا۔ اس میں سب سے اہم بات یہی تھی کہ بھارت کے اس تاثر کو زائل کرنے کے لئے کہ مسئلہ کشمیر کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں یا اگر ہے تو بھارت اور پاکستان کے درمیان ہے بین الاقوامی طور پر اس مسئلے کو اٹھایا جائے۔

ہم لوگ بین الاقوامی رائے عامہ کو اپنے حق میں بیدار کرنے اور منظم کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ اس موقع پر مجھے بین الاقوامی کشمیر کانفرنس کا ترجمان مقرر کیا گیا۔

چنانچہ میں نے اس ضمن میں برطانیہ کا دورہ کیا کچھ لوگوں نے امریکہ کا دورہ کیا۔ اس دوران ہرارے کانفرنس ہونے والی تھی میں نے ذاتی طور پر ہرارے جانے کا فیصلہ کیا میں نے سوچا کہ اگر اس وقت درخواست اور ٹیلی گرام کے چکر میں پڑے تو بات نہیں بنے گی۔ وقت بہت کم تھا۔ لہٰذا وہیں پہنچ کر قسمت آزمائی کی جائے چنانچہ میں ذاتی طور پر ہرارے پہنچ گیا۔ اب بھارت والے پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں میں پاکستانی وفد میں شامل تھا۔ آپ یہ بات حکومت پاکستان سے پوچھیں کہ میں پاکستانی وفد میں شامل تھا یا نہیں۔ کبھی کہتے ہیں میں خلیجی ممالک کے وفد میں شامل تھا' کبھی کوئی الزام لگاتے ہیں۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی ملک نے اپنے وفد میں شامل نہیں کیا' نہ ہی میں کسی وفد میں شامل تھا۔ مجھے کسی حکومت کی تائید حاصل نہ تھی۔ دنیا کے کسی ادارے اور حکومت نے میری پائی برابر بھی امداد نہیں کی اور کسی حکومت یا کسی تنظیم نے مجھے کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے میری کوئی مدد نہیں کی۔

بس یہ قدرت کی طرف سے ہو گیا۔ کچھ دوستوں نے وہاں کوشش کی' مدد کی اور ہم باضابطہ اس کے نمائندے بن گئے۔ میں نے لبریشن لیگ کی طرف سے درخواست دی تھی۔ ہماری نمائندگی مستقل نہیں ہے' اسی سیشن کے لئے تھی۔ ہم نے باضابطہ طور پر درخواست نہیں دی۔ اب 13 اور 14 نومبر کو ہمارا کنونشن ہو رہا ہے۔ اس میں ہم فیصلہ کریں گے۔

ہرارے میں یہ حالت تھی کہ چند ممالک کے سوا کسی کو مسئلہ کشمیر کا علم ہی نہیں تھا۔ کئی ممالک کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کشمیر ہے کہاں۔ ظاہر ہے جب پاکستان نے یہ مسئلہ اٹھایا ہی نہیں تو دنیا کو اس کا کیا معلوم۔ یہ میرے باہر جانے پر جو بھارت چیخا ہے' اس کی بڑی وجہ بھی شملہ معاہدہ ہے۔ میں باضابطہ ممبر نہیں تھا۔ میں نے وہاں اپیل لکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کی تھی۔ انہوں نے دیکھی' وہ متاثر ہوئے' بھارت کو یہی صدمہ تھا کہ وہ ننگا ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ جو غیر جانبدار کانفرنس ہے' یہ تو نو آبادیات کے خلاف ہے۔ یہی ہمارا

مسئلہ ہے۔نہرو نے یو این او کے سامنے تسلیم کر لیا کہ کشمیر سے فوجیں نکل جائیں گی لیکن نہ نکلیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اس وقت جو سوال ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح آپ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ افغانستان سے روسی فوجیں نکل جائیں ہمارا مطالبہ ہے کہ کشمیر سے بھارتی فوجیں نکل جائیں۔ اب اس پروپیگنڈے کا بھارت کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔خدا جانے پاکستان کی خارجہ پالیسی کیا ہے۔ میں کہتا ہوں ہماری خارجہ پالیسی فکر سے بالکل آزاد ہے۔اس کی کوئی سوچ نہیں کوئی سمت نہیں۔

کسی بھی ملک کے خارجہ مسائل کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جیسے پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی بھارت سے خطرے کا احساس، کشمیر، حیدر آباد اور جونا گڑھ وغیرہ کے مسائل۔دوسرے مسائل جو ہماری جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً ہم اس علاقے میں ہیں اور ہمارے ایک طرف روس، دوسری طرف چین، دائیں بھارت، بائیں افغانستان جنوب میں بحیرۂ عرب ہے اور جنوب مشرق میں ایران۔ ان حالات میں ہمارے اطراف میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی خارجہ پالیسی کا دارومدار اس کے اندرونی تشخص، اندرونی استحکام اور اندرونی قوت پر ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک میں اندرونی استحکام نہیں، اگر کسی ملک نے یہ فیصلہ ہی نہیں کیا کہ جانا کس طرف ہے اور کرنا کیا ہے؟ اس صورت میں خارجہ پالیسی کی کوئی بنیاد ہی نہیں بن پائے گی۔ کچھ نرم و نازک شاخ کی طرح جو اس طرف جھک جاتی ہے جس طرف ہوا چلتی ہے۔آپ بھی اپنے آپ دائیں بائیں اور آگے پیچھے ڈولتے رہیں گے اور حالات کے ریلے کے سامنے خود کو بے بس پائیں گے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو 1971ء سے پہلے ہماری جو بھی خارجہ پالیسی تھی بالخصوص 1965ء اور 1971ء کے درمیان، وہ سرے سے ناکام رہی۔ اس لیے کہ 1971ء میں ہمارا ایک بازو ہم سے چھن گیا اور بھارت کے حملے کے وقت کوئی بھی عملاً ہماری مدد کو نہ آیا۔

لہٰذا پہلی بات جو اس سلسلے میں کہی جا سکتی ہے، یہ ہے کہ خارجہ پالیسی کا انحصار اندرونی قوت، استحکام اور سیاسی نظام کی کامیابی پر ہوتا ہے ورنہ دوسری صورت میں کوئی فوجی معاہدہ، کوئی یقین دہانی کام نہیں آتی۔ اب خارجہ مسائل میں کشمیر سے بھارت تک اور اب افغانستان میں روس کی موجودگی۔ یہ سارے مسائل ایسے ہیں کہ اگر ہم اندرونی طور پر مستحکم ہوں اور اپنے لیے معقول منصوبہ بندی کریں اور سمت کا تعین کریں تو یقیناً بدلتے ہوئے حالات میں ایسے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں کہ ہم ان سے فائدہ اٹھا سکیں لیکن اس وقت تک کے لیے خود کو نہ صرف برقرار رکھنا بلکہ پہلے سے بہتر پوزیشن میں لانا ضروری ہے۔ فوری مسائل میں ایک کشمیر کا مسئلہ ہے جسے پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ کہا جاتا رہا ہے۔ اگر ہم حقیقت پسندی سے کام لیں تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس مسئلے کو ہم اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے ایجنڈے میں بھی شامل نہیں کروا سکے۔ اس طرح گذشتہ دورِ حکومت میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران بھی مسئلہ کشمیر ایجنڈے میں شامل نہیں تھا حالانکہ دونوں بار فلسطین کا مسئلہ پوری شدت سے زیرِ بحث آیا۔

ایک اور مثال لیجیے۔ افغانستان پر روسی جارحیت کے ہم مخالف ہیں اور تمام مسلمان ممالک بھی ہمارے ساتھ ہیں لیکن ان ممالک کی طرف سے روس کا سفارتی اور تجارتی بائیکاٹ ہونا چاہیے تھا اور ببرک کارمل سے تو مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس پروگرام کے برعکس ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ ببرک کارمل سے کسی سطح پر بات کر لی جائے اور روسیوں سے مذاکرات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میری رائے میں ہم اس کے لیے مجبور ہو گئے ہیں تو صرف اس لیے کہ ابھی مسلم ممالک میں اجتماعی طور پر اتنی قوت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ روس کے مقابلے میں آ سکتے۔ لہٰذا قوت پیدا کرنا آزادانہ خارجہ پالیسی کے لیے مقدم ہے اور اس کے بغیر ہم جو کچھ چاہیں گے اس پر بات ہی کر سکیں گے ہمارا عمل مجبوراً اس کے خلاف ہوگا۔

ماضی میں واپس جائیے۔ آپ یہ بات بھول جاتے ہیں اور پاکستان میں عام خیال یہ ہے کہ روس ہمارا دشمن ہے۔ کشمیر کا مسئلہ جب یو این او میں گیا تو روس نے اسے ویٹو نہیں کیا تھا یہی وجہ تھی کہ قرارداد پاس ہوئی۔ جتنے کمیشن پاکستان اس سلسلے میں آئے روس ان کے ساتھ تھا روس نے کسی کے راستے میں روڑے نہیں اٹکائے۔

وزیراعظم نے بیان دیا ہے قومی اسمبلی میں بھی اور آزاد کشمیر میں بھی بیان دیا۔ دیکھئے بھارت کے ساتھ کسی معاہدے کا کیا اعتبار۔ اس نے تو شملہ معاہدے کے بعد سیاچین پر قبضہ کرلیا ہے اور کشمیر کی تمام پارٹیاں اس پر متفق ہیں کہ شملہ معاہدہ ہم پر لاگو نہیں ہوتا کیونکہ ہمارا کوئی نمائندہ اس میں شامل نہیں تھا۔

پاکستان اسمبلی میں تو کوئی حزبِ اختلاف ہے ہی نہیں۔ پاکستان میں جنرل ضیاء نے جو نیا فلسفہ نکالا ہے' وہ عجیب قسم کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کے بغیر جمہوریت قائم ہوسکتی ہے۔ ان کا مطلب ہے کہ ہر شخص ذاتی حیثیت میں منتخب ہوکر آیا ہے' اس لیے اسمبلی کے اندر حزبِ اختلاف نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ حکومت کی جو پارٹی ہوگی' اس کا نام حزب اللہ ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت کے مخالف حزب الشیطان ہوئے اور ابھی چند دن ہوئے انہوں نے یہ بیان دیا ہے کہ جمہوریت صرف کوڑا کرکٹ اور گند فراہم کرتی ہے۔

میں جنرل صاحب سے سوال کرتا ہوں کہ جمہوریت نے بھارت میں جو لیڈر پیدا کئے' کیا وہ بھی کوڑا کرکٹ تھے' انگلستان میں مسز تھیچر کوڑا کرکٹ ہے' امریکہ میں ریگن کوڑا کرکٹ ہے؟ فرانس' سپین' سویڈن جہاں بھی جمہوری حکومتیں ہیں' کیا وہ کوڑا کرکٹ ہیں؟

بات یہ ہے کہ ان کی غلط سوچ کی وجہ سے پاکستان میں حزب اختلاف کو موقع نہیں ملا۔ بہر حال میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارا تھوڑا بہت واسطہ ایم آر ڈی سے ہے۔ کم از کم جمہوریت کی بحالی' مارشل لاء کے خاتمے اور عوامی حقوق کی بحالی اور خاص طور

پر بنیادی حقوق جو ہیں مثلاً مہنگائی' رشوت ستانی' لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال اور قتل و غارت گری میں جو زیادتی ہو رہی ہے' اس میں یقیناً ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

بدقسمتی سے قیامِ پاکستان کے بعد ہماری لیڈرشپ قومی نارگٹ اور قومی نصب العین کو واضح نہ کر سکی اور اس کا نتیجہ فکری ابہام کی صورت میں نکلا۔ ہمیں کہاں جانا ہے؟ کس سمت کا رخ کرنا ہے اور مشترکہ مقاصد کیا ہیں؟ ان سوالوں پر سوچا نہیں گیا اور ہماری سوچ میں قومی طرز کی بجائے اپنی ذات، اپنے فائدے اور اپنے حوالے سے ہر کام کا رجحان پیدا ہو گیا جو آج تک چل رہا ہے حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ ایک ملک آپ اجتماعی کوشش سے حاصل کرتے ہیں مگر اس کے قیام کے فوراً بعد اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے اور انفرادیت غالب آ جاتی ہے۔ کیا اس خاکے میں کسی بھی قسم کا کوئی رنگ بھرا جا سکے گا؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ میری رائے میں پاکستان کے مسائل اس کے جغرافیائی حالات، وسائل یا حدود و رقبے سے متعلق نہیں بلکہ قوم کے اجتماعی کردار کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہیں یا قومی سطح کی لیڈرشپ کی عدم موجودگی کا۔

ہم اس صورت حال کا مقابلہ بھارت سے بھی کر سکتے ہیں کیونکہ بھارت اور پاکستان ایک ہی وقت پر آزاد ہوئے تھے لیکن یہ بھارت کی خوش قسمتی تھی کہ گاندھی کے قتل کے بعد بھی انہیں نہرو جیسا لیڈر ملا جو تحریکِ آزادی میں برس ہا برس سے پیش پیش تھا اور 18 سال تک بھارت کی حکومت چلاتا رہا۔ آج بھارت میں جو کچھ بھی ہے' اس میں نہرو کی 18 برس کی محنت اور سوچ کا دخل سب سے زیادہ ہے۔ اس کے برعکس قائداعظمؒ قیامِ پاکستان کے چند ماہ بعد بیمار ہو کر کوئٹہ چلے گئے اور 13 ماہ بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیاقت علی خان اگرچہ ان کے پائے کے لیڈر نہ تھے اور ان میں شخصی کمزوریاں بھی تھیں تاہم ان کی شکل میں بھی قوم کو جو قیادت مل سکتی تھی' وہ صرف 4 برس تک چلی اور پھر لیاقت علی خان گولی کا نشانہ بن گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قدرت ہمیں موقع دیتی اور قائداعظمؒ یا کم از کم

لیاقت علی خان جیسا ایک لیڈر بھی پندرہ بیس سال تک کے لیے مل جاتا تو پاکستان کا نقشہ آج اس طرح کا نہ ہوتا۔

روزنامہ نوائے وقت نے ایک مرتبہ سیاست دانوں سے یہ سوال پوچھنے کا سلسلہ شروع کیا کہ سیاست دانوں سے کیا غلطیاں سرزد ہوئیں تو میں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ سب سے پہلی بات جس کی طرف میں آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس سلسلے کے جو چند انٹرویو میں نے پڑھے ہیں ان سے ایک طرح کی مایوسی ٹپکتی ہے جبکہ تحریک پاکستان کے ایک ادنیٰ کارکن اور بعد میں پاکستانی سیاست سے یکسر الگ ہو کر کشمیری سیاست میں جانے کے باعث مجھے دونوں حیثیتوں میں جو کچھ دیکھنے کا موقع ملا ہے اس کے پیش نظر میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ بعض لوگوں میں بلاوجہ مایوسی اور بددلی ہے۔ ایسا کوئی بھی مسئلہ نہیں جسے حل نہ کیا جا سکے۔ البتہ محنت کے ساتھ ساتھ دیانت داری اور صحیح سمت کا تعین بہرحال ضروری ہے۔

بعض لوگ سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتے ہیں کہ پاکستان بنانے سے پہلے ہمارے ذہنوں میں کچھ اس قسم کا تصور تھا جیسے یہاں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی اور کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی جو حقیقت سے یکسر مختلف بات ہے۔ ایسے ہی لوگ آج ملک میں کوئی مسئلہ کوئی مشکل دیکھتے ہیں تو فوراً سوچنے لگتے ہیں کہ شاید پاکستان بنانے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی یا ہم اس قابل ہی نہیں تھے کہ ملک چلا سکتے۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تحریک میں صفِ اوّل کے کسی لیڈر کے ذہن میں ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ پاکستان کے قیام کے بعد سارے دکھ دور ہو جائیں گے لہٰذا آج کے مسائل اور مشکلات کو اس طرح دیکھنا چاہیے کہ محدود مالی وسائل سے جغرافیائی مسائل تک اور انسانی کمزوریوں سے لیڈر شپ کے بحران تک آپس میں کس طرح رہنا ہے اور بنیادی معاملات سے معاشرہ کس طرز پر بنانا ہے۔ مسائل ملک کو درپیش ضرور ہیں کیونکہ پاکستان ایک آزاد ملک کی

حیثیت سے ہمیں ملا تھا اور ہم کس طرح اسے بنانا چاہتے تھے' اس کا انحصار ہم پر تھا۔ پاکستان کی آج جیسی بھی شکل ہے اس کے ذمہ دار نہ ہم تھے نہ تحریکِ پاکستان کے قائد یا نظریۂ پاکستان کے خالق یا خود نظریۂ پاکستان۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ خود تحریکِ پاکستان کا بھرپور آغاز 1940ء کے بعد ہوا اور 1947ء میں پاکستان بن گیا۔ درمیانی مدت ایسی ہنگامی تھی کہ تحریکِ پاکستان کے فکری پہلوؤں پر کام کرنے کا زیادہ موقع نہ ملا حالانکہ قائد کے ذاتی سٹاف میں ہونے کی وجہ سے مجھے معلوم ہے کہ وہ فکری سیل کے قیام بالخصوص نوجوانوں میں تحریکِ پاکستان کے مقاصد واضح کرنے کے بارے میں بہت فکر مند تھے مگر انہیں اس کی مہلت ہی نہ ملی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحریکِ پاکستان کے مقاصد، نظریۂ پاکستان یعنی دو قومی نظریے کی تشریح کے لیے کام نہ ہو سکا اور عوام بالخصوص کارکنوں کو اس کام کے لیے تیار نہ کیا جا سکا۔

نظریۂ پاکستان یا دو قومی نظریے کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن اکثر سیاست دانوں یا دانشوروں کی طرف سے محض یہ سن کر کہ نظریۂ پاکستان کی تشہیر نہ ہو سکی یا دو قومی نظریہ ذہنوں میں واضح نہ کیا جا سکا' یوں لگتا ہے جیسے وہ حکومت کے حوالے سے بعض کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مثلاً کیا یہ حقیقت نہیں کہ پاکستانی عوام 1947ء میں بھی اور آج بھی پاکستان کے مقصد سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان کیا تھا اور دو قومی نظریے کا کیا مطلب ہے۔ جونا گڑھ، حیدر آباد، کشمیر اور رن کچھ کے واقعات کے بعد 1965ء اور 1971ء کی دو جنگوں اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے ہماری غلطیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت کے براہ راست حملے کے علاوہ بھارت میں مسلمانوں کے خلاف آئے دن کے فسادات کے بعد دو قومی نظریہ کوئی ایسی اجنبی شے نہیں جس کے لیے پاکستانی مسلمانوں کو لیکچر دینا پڑے۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارے سیاست دانوں یا ان لوگوں نے جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور تھی، پاکستان کے

مقاصد کی تکمیل اور نظریۂ پاکستان کے مطابق ریاست کی تعمیر کے سلسلے میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں جن کا خمیازہ آگے چل کر ہمیں بھگتنا پڑا۔

میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ پاکستانی عوام آج بھی لیڈروں کی نسبت نظریۂ پاکستان زیادہ صاف دلی کے ساتھ جانتے ہیں کیونکہ وہ اس مسئلے کو اپنی سیاست یا غرض کا شکار نہیں بناتے۔ تاہم اپنی اس رائے پر بھی اصرار ہے کہ اس نظریے کے مطابق ریاست کو کیسے بنانا ہے۔ اس حکومت میں شامل افراد کو کیا کرنا ہے اور باہم رہنے والوں کو کن باتوں پر نظر رکھنا ہے۔ اس سلسلے میں تحریکِ پاکستان کے لیڈروں بالخصوص مسلم لیگی قیادت پر بہر حال بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہیں اپنے ورکروں کو ایک صحیح لائن دینا تھی اور انہیں پاکستان کے مسائل کے بارے میں ان کی رہنمائی کرنا تھی۔ پاکستان کے خلاف الزامات کے سلسلے میں انہیں جوابوں سے مسلح کرنا تھا اور حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کے لیے پولیس یا فوج کی بجائے انہی کارکنوں سے مدد لینی تھی جو نہ لی گئی۔ نہ کوئی ایسا لیڈر تیار کیا گیا اور نہ تحریک کے مقاصد اور پاکستان کے مسائل کے سلسلے میں کوئی قومی ٹارگٹ مقرر کیا گیا اور نہ اسکے حصول کے لیے کوئی پروگرام بنایا گیا۔ اتفاقی طور پر کوئی مشکل اگر قوم پر آئی تو وہ متحد بھی ہوئی اور مشکل کے مقابلے میں ڈٹی بھی لیکن اس میں لیڈرشپ کا کمال نہ تھا بلکہ یہ وقت کی ضرورت تھی۔ تاہم اس مشکل کے ختم ہوتے ہی کارواں کے دل سے خوفِ زیاں جاتا رہا۔ حالانکہ عام دنوں میں بھی قوم کو کوئی واضح سمت دکھا کر لیڈرشپ اپنے خلوص کا یقین دلا کر مشترک قومی مقاصد کی طرف بڑھ سکتی تھی۔

سب سے پہلی غلطی ہمارے سیاست دانوں کی تھی جو عوام کی طاقت کو ساتھ لے کر چلنے کی بجائے اپنے گرد و پیش میں واقع افسر شاہی سے متاثر ہو گئے اور رفتہ رفتہ انہیں سیاست میں آنے کا موقعہ دیا۔ میں یہاں اس امر کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ ہماری نوکر شاہی کی اپنی تاریخی روایات ہیں۔ انگریز نے یہ سول افسر ایک غیر قوم پر حکمرانی کے لیے

بنائے تھے لہٰذا ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع میں ایک طرح سے والیانِ ریاست کی طرح تھے۔ یہی اختیارات اوپر چیف سیکرٹری تک جاتے تھے اور نیچے پٹواری اور پولیس والے تک پہنچتے تھے۔قیامِ پاکستان کے بعد انہی افسروں کوحکومت چلانے کا موقع ملا۔ادھر سیاست دان جمہوری روایات سے نا آشنا اور نا تجربہ کار تھے۔نتیجہ یہ نکلا کہ عوامی طاقت کی مدد سے عوام کے نمائندوں نے افسر شاہی سے اختیارات حاصل کرنے کی بجائے الٹا ان کا دستِ نگر بننا قبول کر لیا اور جلد ہی حکومت میں ملک غلام محمد، سکندر مرزا، چودھری محمد علی اور مشتاق احمد گورمانی جیسے سول افسر نظر آنے لگے جو اپنی جگہ پر کتنے ہی لائق کیوں نہ ہوں، خود کو کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ سمجھتے ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ افسروں کا نقطۂ نظر سیاست دانوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ افسر ڈنڈے کے زور سے حکومت چلاتا ہے اور وقتاً فوقتاً عوامی جذبات کی سٹیم خارج کرتا یا کرواتا ہے۔افسر نما حکمرانوں نے جس جمہوری عمل کو روکا تھا اُس کے نتیجے میں پاکستان پر افتاد در افتاد در آئی اور افسر شاہی نے اس وقت مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو حکومت میں آنے سے روکنے کے لیے جمہوریت کو بار بار پس پشت ڈالا۔کاش! ہمارے لیڈر اتنے سادہ لوح نہ ہوتے کہ انتظامیہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر بنگالیوں کا راستہ روکتے بلکہ آئین بنا کر فوراً انتخابات کرا دیتے تو یقیناً پاکستان کے دوٹکڑے نہ ہوتے لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس پاکستان میں جس کا نعرہ لا الہ الا اللہ تھا اور جس کے لیڈر علماء اور دانشور اپنی تقریروں میں رسول کریم ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع کے اقتباس پیش کرتے تھے کہ کسی کالے کو گورے پر، کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے، وہی بنگالیوں کو چھوٹے قد کا، کالا، بھات کھانے والا اور نا جانے کیا کچھ کہا کرتے اور یہ دعویٰ کہ بنگالی فوج میں بھرتی ہونے کے قابل ہی نہیں حالانکہ ان ہی قابل لوگوں نے بعد میں افسر شاہی کے چھکے چھڑا دیئے۔کیا یہ نظریۂ پاکستان کی عملی شکل تھی؟ کیا یہی وہ مقصد تھا جس کے حصول کے لیے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا؟ اگر اسلامی یگانگت ٗ مساوات اور بھائی

چارے سے کام لیا جاتا تو بنگالیوں کو جو آبادی میں سب سے زیادہ تھے' ایسی کوئی شکایت نہ ہوتی کہ وہ ہمارے نمبر ایک دشمن کی فوج کو خوش آمدید کہیں اور وہی بنگال جہاں سے تحریک آزادی کا آغاز ہوا مغربی پاکستان سے اس حد تک بدظن نہ ہو جاتا کہ اس نے اپنے بدترین دشمن سے مدد لینے ہی کو ذریعۂ نجات سمجھا۔ میری رائے میں یہ سب نظریۂ پاکستان پر عدم اعتماد کا نتیجہ تھا ورنہ جو ریاست عوام کی رائے سے بنی تھی اس میں ان کی رائے کو پس پشت ڈال کر اختیار و اقتدار کو ملک کے ایک حصے بلکہ ایک طبقے تک محدود رکھنا کہاں تک روا ہو سکتا ہے؟ نظریۂ پاکستان پر عدم اعتماد نے یہاں پر سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی کی سوچ پیدا کی اور ظلم یہ ہے کہ ایک حصہ گنوا کر ہمیں شعور نہ آیا۔ حالت یہ ہے کہ چند برس پہلے جب ملک میں مارشل لاء تھا تو ہماری جمہوری حکومت ملک کے ایک صوبے بلوچستان پر فوجی ایکشن میں مصروف تھی۔

میں اس رائے سے متفق ہوں کہ پاکستان کے قیام کا مقصد ہی مسلمان کو ہندو کے ظلم سے نجات دلانا تھا اور قیامِ پاکستان کے بعد استحصالی طبقے کے صرف ناموں کی تبدیلی سے عوام کے مسائل حل نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت قائد اعظمؒ اور تحریک کے متعدد دوسرے اکابر کا تعلق مالی اعتبار سے درمیانے درجے سے تھا اور وہ اپنی محنت کے بل پر یہاں تک پہنچے تھے۔ وہ نہ خود استحصالی طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور نہ ہی اس نظام کو پسند کرتے تھے۔ میری رائے میں ظلم اور استحصال کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ جمہوری اداروں کا استحکام ہے' دوسرا طریقہ پہلے استحصالی کو ختم کر کے دوسرے استحصالی کو اس کی جگہ لے آتا ہے۔ مسلسل اور بار بار انتخابات اور حکومت میں عوام کے عمل دخل سے ایک قدرتی اور تدریجی عمل سے معاشرے میں عدل و انصاف اور مساوات قائم کی جا سکتی ہے۔ اس کی دوسری شرط منافقت کے خاتمے سے منسلک ہے۔ یعنی یہ کہ ہم جو کہیں' وہی کریں۔ گذشتہ دنوں مجھے ایک عالم صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اسلامی نظام کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے اور علماء

کانفرنس میں بھی گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تین مرغ کھا کر چار بوتلیں سیون اپ کی پی جاتے ہیں۔

آپ ہی بتایئے کہ بات کریں ہم اس رسول ﷺ کی جو دنیا بھر کی دولت سمیٹنے کی طاقت اور اختیار رکھتے تھے لیکن شام کو سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ گھر جاتے تھے اور پیٹ پر پتھر باندھ کر جنگ کے لیے خندق کھودتے تھے اور عمل ہمارا یہ ہے کہ عالم ہونے کے ناتے سہولتیں، مراعات، کاریں اور پلاٹ مانگیں۔ یہی کیفیت اہل سیاست اور دانشوروں کی ہے۔ سوشلزم سے اسلام تک اور جمہوریت سے عوامی حکومت تک ہم نے سب کچھ اصطلاحیں گھڑ رکھی ہیں اور ان کا ورد بوقت ضرورت کرتے رہتے ہیں۔ رسول خدا ﷺ نے ہمیں انسانوں کے مابین مساوات اور وسائل رزق کی منصفانہ تقسیم و معاشرے میں عدل، حاکم کے عوام کے سامنے جوابدہ ہونے اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کو مشورے سے طے کرنے کا حکم دیا ہے۔ انہی اشاروں پر ہم اسلامی نظام کو استوار کر سکتے ہیں اور جمہوری نظام کی کسی ایسی شکل کو اپنے لیے منتخب یا وضع کر سکتے ہیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔ اس کے برعکس ان ہی اغراض و مقاصد کے لیے اسلام کا نام استعمال کرنا بذات خود ایک برائی ہے جس کا انجام غلط نکلے گا۔

آج کے حالات میں اگر ہم سرے سے ملکی معاملات کو درست کرنے کا فیصلہ کریں تو اس کام کو کہاں سے شروع کرنا ہوگا' مختصراً بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے مستقبل کے بارے میں عوام کے عدم تحفظ کا خاتمہ کرنا ہوگا اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ قومی سطح پر جیسی بھی قیادتیں موجود ہیں اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے جیسے بھی لوگ ملتے ہیں' ان سے قومی سمجھوتہ ہو اور ان سے یہ طے پائے کہ ہم ملکی امور کو کیسے چلائیں گے اور عوام کے مسائل کو کیونکر حل کریں گے۔ نیز عوام کی مرضی معلوم کرنے اور انہیں اختیار میں شریک کرنے کا کونسا پروگرام قابلِ عمل ہے اور کب سے اس پر عمل درآمد شروع ہوگا۔ ایسے کسی

قومی سمجھوتے کی عدم موجودگی میں بے یقینی کا احساس موجود ہے اور ملکی معاملات میں ہم کسی مستقل حل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم یہ عہد اور اس عہد کے لیے مسلسل مہم کہ ہم جو فیصلہ کریں گے اس پر دیانت داری سے عمل کریں گے۔ آئین اور قانون اور معاہدے کتابوں تک محدود نہیں رہیں گے۔ نیز اسلامی اصولوں، رواداری، مساوات، انصاف اور عدل سے ہم سوسائٹی کو بہتر بنانے کے لیے خود قربانی دیں گے اور یہ نہیں ہوگا کہ جہاں ہماری جیب یا ہمارے اختیارات پر ہاتھ پڑا ہم نے ہر منصوبے کو سبوتاژ کرنا شروع کر دیا۔ میری رائے میں ان دو اصولوں سے ہم ایک نئے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان فطرتاً جمہوریت پسند نہیں اور ہمارے مشرق میں تو بالخصوص مزاج اس کے خلاف ہے۔ فطرت کے قانون میں بھی غیر جمہوری نظام رائج ہے۔ مثلاً جنگل میں شیر کی حکمرانی ہے۔ فضا میں عقاب کی اور سمندر میں وہیل مچھلی کی اور گیدڑ، لومڑیاں، کبوتر اور چڑیاں اور چھوٹی مچھلیاں تو کوئی حیثیت نہیں رکھتیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور سوچنے کے لیے ذہن دیا ہے۔ جنگل کے قانون کو ختم کرنے کے لیے ہی پیغمبر دنیا میں آئے اور زبردستوں کے ظلم سے نجات دلانے کے اصول اور قانون وضع کرتے رہے۔ جمہوریت بھی انسانی ذہن کی ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ سوچ کا مقام ہے جس میں ایک شخص کو صرف اس لیے دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں مل جاتا کہ یہ حق اس کے باپ کو حاصل تھا یا اس کے پاس ڈنڈے کی طاقت ہے اور وہ سب کے سر توڑ سکتا ہے۔ دراصل جمہوریت کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ دوسروں کی بات کو تحمل سے سنا جائے۔ اختلافِ رائے پر تیغ پا ہونے کی بجائے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے اور دوسروں کے لیے قربانی دی جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ ساری باتیں ناپید رہیں۔ ابتدائی دور میں پنجاب میں جہاں ممتاز دولتانہ

اپنے سیاسی دوستوں کی بجائے انسپکٹر جنرل قربان علی خان کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتے اور ان کو چچا کہہ کر بلاتے تھے۔ سرحد میں خان قیوم خان سے کہا گیا کہ اپنا جانشین دیں تو انہوں نے کسی سیاسی لیڈر کی بجائے انسپکٹر جنرل پولیس سردار رشید کو وزیرِ اعلیٰ بنوا دیا۔ یہی کیفیت دوسرے صوبوں کی تھی اور آخری دور میں یعنی موجودہ مارشل لاء سے قبل بھی حکمران پارٹی نے چار میں سے دو صوبوں کی منتخب لیڈرشپ کو قید کر رکھا تھا اور وہاں گورنر راج قائم کیا ہوا تھا۔ مخالف لیڈروں کا راستہ روکنے کے لیے پولیس والے راستے میں کھڑے ہو جاتے تھے اور متر ر صاحب کو اٹھا کر کسی ریسٹ ہاؤس میں لے جاتے جہاں سے اگلے دن رہا کر دیا جاتا۔ دہشت طاری کرنے کے لیے مخالفوں کو پولیس اغوا کرتی اور پاکستان کے کسی ہائی کورٹ کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے آزاد کشمیر میں نظر بند کر دیتی۔ یہ تھا وہ مزاج جو جمہوریت کو عمل میں نہ آنے دیتا تھا اور یہ مزاج قیامِ پاکستان سے اب تک اسی طرح باقی تھا اور شاید آج بھی ہے۔

اس کے باوجود میں جمہوریت کو پاکستان کے لیے قابلِ عمل نظام سمجھتا ہوں' اس لیے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں اور اگر ماضی میں ہم نے جمہوری قوانین بنوائے اور آئین بنایا تو اس پر عمل نہیں کیا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ نظام خراب یا ناقابلِ عمل تھا۔ جمہوریت کے سوا دوسرے ہر نظام میں حکومت کو تبدیل کرنے اور انتظامیہ پر نظر رکھنے کا کوئی مناسب بندوبست نہیں ہوتا اور یہ صورت حال ملک کو بالآخر تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ انسانی شعور کی اس بلندی کے زمانے میں غیر جمہوری معاشروں میں بھی مسائل کو وقتی طور پر دبایا جا سکتا ہے۔ عوامی خواہشات پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے اور جہاں جہاں ناسور پیدا ہو رہے ہیں' انہیں ڈھانپا جا سکتا ہے مگر زیادہ دیر تک نہیں۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جمہوریت کی سطح بھی وہی ہوگی جو عوام کی ذہنی سطح ہوگی۔ اگر عوام اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور دلیل سے کام لینا جانتے ہیں تو جمہوریت میں بھی سب کے

لیے لچک اور سب کے لیے گنجائش ہوگی۔لیکن اگر ایسا نہیں ہےتو جمہوری نظام کے تحت آنے والاحکمران بھی آہستہ آہستہ شارٹ کٹ کے طور پر غیر جمہوری اقدامات کرتا رہے گا اور رفتہ رفتہ جمہویت کا سبق صرف کتابوں میں رہ جائے گا اور ملک میں آمرانہ اور فاشی طریقے رائج ہوجائیں گے۔

جمہوریت کی کامیابی کے لیے تعلیمی معیار کا بلند کرنا ضروری ہے لیکن کون سی تعلیم کا۔کیا کتابی تعلیم واقعی جمہوریت کا معیار بلند کرنے میں مدد دے گی؟میری رائے اس کے برعکس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کو چلانے کے لیے جو خصوصیات بعض غیر تعلیم یافتہ اور سادہ مزاج دیہاتیوں میں ہوتی ہیں وہ بعض اوقات شہری تعلیم یافتہ طبقے میں نہیں ہوتیں۔تعلیم کتابیں پڑھنے کا نہیں بلکہ شعور کو بلند کرنے کا نام ہے اور اس کے کئی طریقے ہیں۔عوامی شعور کو تقریر وتحریر اور ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن کے علاوہ براہ راست رابطے کے ذریعے بلند کیا جا سکتا ہے۔دیہات میں رہنے والا جو شخص اپنے اور اپنے اہل خانہ کی بہتری کے لیے سوچ سکتا ہے وہ یقیناً اپنا نمائندہ منتخب کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔البتہ اس میں کچھ کمی ہےتو آپ اس کی کمی تعلیمی اور سیاسی شعور دے کر پوری کر سکتے ہیں اور بار بار کا تجربہ خوداس کا استاد بن جاتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ جمہوریت اس لیے نہیں چل سکتی کہ یہاں تعلیم کم ہے غیر جمہوری نظام کی حمایت کرنے کا ایک بھونڈا طریقہ ہے جسے آج کے زمانے میں،کوئی نہیں مانے گا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آزادیٔ تقریر وتحریر بنیادی حق ہے جو ایک جمہوری ملک میں ہر شہری کو ملنا چاہیے۔اس کے بعد کچھ روایتی اور اخلاقی پابندیاں آتی ہیں۔اس کے علاوہ مارشل لاء کی ہدایات اور پابندیاں اخبارات پر قطعی عائد نہیں ہونی چاہئیں۔پاکستان بننے کے بعد پاکستانی اخباروں نے جو ترقی کی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔اس میں شک نہیں کہ جدید مشینیں آ گئی ہیں۔اخبارات کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے دوسری طرف میں دیکھتا ہوں

کہ اخبارات میں سطحیت بہت آ گئی ہے۔مثلاً یہ خبر ہوگئی کہ یوم آزادی نہایت جوش وخروش سے منایا جائے گا۔یہ چھ کالمی سرخی آ گئی ۔یہ تو کوئی خبر نہ ہوئی۔جب یوم آزادی منایا جائے گا اور جس طرح منایا جائے گا اس کے بعد خبریں آنی چاہئیں۔آپ اکثر اخبارات میں دیکھتے ہیں' لکھا ہوتا ہے''اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے'' یہ بھی کوئی خبر نہیں۔جہاں تک فنی بہتری اور وسعت کا تعلق ہے'صحافت نے بہت ترقی کی ہے۔مگر جہاں تک صحافت اور خبریت کا تعلق ہے' اس میں تنزل ہی ہوا ہے۔اگلے روز مجھے کسی نے بتایا کہ نوائے وقت کراچی کے دفتر کے پاس ایک بینک میں ڈاکہ پڑا تو نوائے وقت نے شہ سرخی دے دی تو ضیاءالحق صاحب نے اعتراض کیا کہ آپ کیا خبریں دیتے ہیں یہ کوئی خبر ہے'مگر میرا خیال ہے کہ اگر اخبار یہ خبر دے کہ ہر مسلمان پانچ وقت نماز پڑھے تو شاید اسے شہ سرخی بنا چاہئے جو ایک صحافی کی نظر میں کوئی خبر نہیں۔

میں شروع ہی سے اس بات پر زور دے رہا ہوں اور حکومت پاکستان سے بھی مطالبہ کیا' اسمبلی میں بھی' ویسے بھی تحریک چلائی' اخبارات میں مضامین لکھے کہ آزاد کشمیر حکومت کا سٹیٹس' اس کی آئینی حیثیت متعین ہونی چاہئے لیکن اس سوال پر کوئی شخص کام نہیں کرتا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ حکومت پاکستان کو اس سلسلے میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ قاسم علی شاہ یا اسی طرح کے جو وزیر وزارتِ امورِ کشمیر میں مقرر کیے جاتے ہیں' انہیں کشمیر اور کشمیر کے مسئلے کا پس منظر تک معلوم نہیں ہوتا۔مثال کے طور پر ایک ہمارے وزیر تھے حبیب اللہ خان۔جب میری پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بلا جھجک اعتراف کیا کہ میں نے گزشتہ بیس برس سے اخبارات ہی نہیں پڑھے یوں مجھے مسئلہ کشمیر کا علم ہی نہیں ہے۔اگر اس قسم کے وزیر حکومتِ پاکستان میں آ جائیں تو آپ خود ہی مسئلے کی نوعیت کا اندازہ کر لیں۔

ویسے تو آپ جانتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے حوالے سے کشمیر کا مسئلہ

اڑتیس برس پرانا ہے لیکن دراصل یہ پچاس سال پرانا مسئلہ ہے تو اگر ایسا وزیر حکومت پاکستان میں امورِ کشمیر کا سربراہ بن جائے جسے نہ کشمیر سے واقفیت ہو نہ اس کے پس منظر سے نہ تاریخ سے تو ایسے سربراہ کیا کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے بے شمار پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کی حیثیت کو متعین نہیں کیا جا رہا۔ ہمارا جو مطالبہ ہے وہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ حکومت پاکستان سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرے اور اس بات کو طے کرے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ کشمیر کی حیثیت وہی ہو جو 14 اگست 47ء کے وقت ہری سنگھ حکومت میں تھی۔

کشمیر کی آزادی کے سلسلے میں پاکستان کی پالیسی غلط ہے۔ جب مسئلہ یو این او میں گیا تو حکومت پاکستان ہی کشمیریوں کی نمائندگی کرتی رہی اور اس نے کسی کشمیری کو ساتھ لے جانے کا نہ سوچا۔ اس کا زیادہ تعلق حکومت پاکستان کی خارجہ پالیسی سے ہے۔ میں آج بھی آپ سے کہتا ہوں کہ حکومت پاکستان کی خارجہ پالیسی صحیح لائن پر لائیں۔ کشمیری لیڈروں کے اختلافات میں ختم کروا دیتا ہوں۔ پاکستانی خارجہ پالیسی نے جہاں ایک طرف ہمیں بے بس کر دیا ہے وہاں دوسری طرف وہ خود بھی کچھ نہیں کرتے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں جو ہر ارے گیا ہوں وہ امر بھی حکومت پاکستان کے لئے تکلیف دہ ہے بھارت سے بھی زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان نے کشمیر کے متعلق عجیب سی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ آج سے بارہ چودہ سال پہلے آسٹریلیا میں ہمارے ایک سفیر تھے ان کا نام مسٹر اقبال تھا۔ ایک مرتبہ وہ مجھے ملے اور کہا میں نے آسٹریلیا میں کمال کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگے یہاں جو بھارت کا سفیر ہے اس کے ساتھ مل کر ہم نے یہ طے کیا ہے کہ کشمیر کا نام آسٹریلیا کے اخباروں میں نہیں آئے گا اور میں ان کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ تو بھارت کی خواہش ہے کہ دنیا کو اس مسئلے کا علم نہ ہو۔ آپ کی کوشش تو ہونی چاہئے کہ ہر روز کشمیر کا نام دنیا کے سامنے آئے۔ یہ جو خارجہ پالیسی ہے اس کی وجہ سے بھی معاملات بہت الجھ گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ

ہم آپس میں لڑتے بھی ہیں۔ ہمارے اختلافات بھی ہیں لیکن یہ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ کشمیر آزاد نہ ہو۔

پاکستان کے مستقبل کا انحصار کشمیر کا ہی مسئلہ ہے۔ اگر اس وقت بھی پاکستان کے اہل فکرونظر نے ماضی کے تلخ تجربات سے سبق حاصل نہ کیا اور صحیح راہیں منتخب نہ کرنے کی فاش غلطی کے مرتکب ہوئے تو اس کا نتیجہ پاکستان کی مزید رسوائی' بدنامی اور جگ ہنسائی کا باعث بنے گا اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان کو سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

کشمیر کے مسئلے پر پاکستان میں جس قدر جذباتی وابستگی ہے' اس تناسب سے صحیح غور و فکر کا فقدان بھی موجود ہے۔ جذبات کے ایک ریلے میں اور 1947ء میں قائداعظمؒ کی کامیابی کے بعد اولین کوشش میں ریاست کا ایک حصہ آزاد ہو گیا لیکن ستمبر 1948ء میں ادھر قائداعظمؒ کی آنکھ بند ہوئی' ادھر 3 ماہ بعد یعنی یکم جنوری 1949ء کو عارضی متارکۂ جنگ کا اعلان ہو گیا۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ پاکستان کے مدبرین کو یہ بھی سوچنا تھا کہ اگر بھارت اپنے وعدوں پر قائم نہ رہا تو ہمارے سامنے کیا لائحہ عمل ہوگا۔ بھارتی لیڈروں کا نبض شناس اور بھارتی لیڈروں کی چالوں کو سمجھنے والا قائداعظمؒ کے بعد کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند برس اس خوش فہمی میں گزرے کہ بھارت واقعی ریاست سے اپنی فوجیں واپس بلا کر اقوامِ متحدہ کے ناظم کے تحت رائے شماری کروانے کا وعدہ پورا کرے گا۔ اندرون خانہ شکست خوردگی کی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی حکومتوں نے اس مسئلے پر سوائے وقتی پراپیگنڈہ کے کوئی توجہ نہیں دی۔ کشمیری لیڈر بھی اپنی پاکستان سے وابستگی دکھانے کے شوق میں اصل منزل کو بھول کر وزارتِ امورِ کشمیر کے دفتروں کے چکروں اور افسروں کے ساتھ ساز باز میں لگے رہے اور اس طرح اصل مسئلے کے بنیادی محرکات قوم کی

نظروں سے اوجھل ہو گئے اور کشمیر ایک سیاسی نعرہ بن کر رہ گیا۔ چونکہ دلوں میں چور تھا اور عزم اور ہمت جواب دے چکی تھی' اس لیے نہ تو نئی راہیں تلاش ہوسکیں اور نہ ہی ان کے لیے صحیح کوشش کی جا سکی۔

میں نے ذاتی طور پر 1970ء میں اور جموں و کشمیر لبریشن لیگ نے جماعتی طور پر 1972ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کو مناسب طور پر چلانے اور اس کے اصل پس منظر کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے نیز حق خودارادیت کے اصولوں کو اجاگر کرنے کے لیے اور سب سے بڑھ کر بھارت کی چالوں کا جواب دینے کے لیے لازمی ہے کہ آزاد حکومت کو پوری ریاست کی عوامی اور قانونی حکومت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن وہی لوگ جو نجی طور پر بحث و مباحثہ کے بعد خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اقدام ضروری ہے، علی الاعلان ہمیں غداری، علیحدگی پسندی اور پاکستان دشمنی کا مرتکب ٹھہراتے رہے ہیں۔ ان کے بنیادی دیوالیہ پن اور ذہنی اور فکری وجود اور مقصد سے لاپروائی کا عالم یہ تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سلامتی کونسل کی قراردادیں حرفِ غلط کی طرح مٹ چکی ہیں، ان کی طرف سے مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے کوئی تجویز سامنے نہ آئی اور عمل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے پاکستان کے پریس کے ایک بہت بڑے حصے نے بھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے زحمت گوارا نہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پاکستانی سیاست میں فکر کے دھارے جو رخ اختیار کر رہے ہیں' ان میں کشمیر کے مستقبل تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

شملہ کانفرنس میں معاہدے کے بعد جو عارضی توقعات بعض حلقوں میں پیدا ہو گئی تھیں' وہ بھی آہستہ آہستہ اب کافور ہوتی جا رہی ہیں اور پاکستان کی موجودہ حکومت بھی متضاد ہے۔ صدر بھٹو صاحب کے اعلانات تو بہت ہیں لیکن ابھی ان کی عملی شکل کا خاکہ سامنے نہیں آیا بلکہ بعض عناصر ایسے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی ہو رہی

ہے جو تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی جگہ موجودہ آزاد کشمیر پر ہی تکیہ کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں ۔

پاکستان کی موجودہ پوزیشن سے انکار نہیں مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اپنے مشن یا مقصدِ آزادی سے دست بردار نہیں ہو سکتے ۔تحریکِ پاکستان کے بنیادی نظریات سے انحراف کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے' اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اس انحراف کی ایک شکل ان اصولوں سے انحراف کی ہے جو قائداعظمؒ نے ریاستوں کے بارے میں وضع کئے تھے ۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صوبہ جات بنگال، آسام، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کی پوزیشن اور ریاستوں کی پوزیشن میں فرق نہیں تھا تو یہ تاریخی بددیانتی اور کھلا جھوٹ ہے ۔ پاکستان سچائی، انصاف، جمہوریت اور حق خود ارادیت نیز نظریاتِ وحدت کی بنا پر بنا تھا اور اگر اب ہم ریاستوں کے بارے میں سچائی اور خود ارادیت سے گریز کرتے ہیں تو یہ خود تحریکِ پاکستان سے انحراف کے مترادف ہوگا ۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ فضول اور بے معنی بحث میں الجھنے کی بجائے بنیادی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے گلگت اور بلتستان کے شمالی علاقوں کو آزاد کشمیر میں شامل کر کے ایک نئی حکومت تشکیل کی جائے اور اس حکومت کو پوری ریاست کا آئینی حکمران مانتے ہوئے خود بھی اس کی امداد کی جائے اور دیگر ممالک سے بھی امداد دلائی جائے ورنہ کشمیر کا جو حشر ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی، پاکستان اس طوفان سے بچ نہ سکے گا جو اہلِ کشمیر کے موقف اور حقوق سے ہٹنے کے نتیجے میں ہوگا ۔

1981ء میں بریگیڈئیر حیات جب آزاد کشمیر کے صدر نامزد ہوئے تو ان کے دور میں میر پور خاص کے حالات بڑے خراب تھے ۔عوام کو بے شمار شکایتیں تھیں ۔میر پور ترقیاتی بورڈ سے شکایت تھی ۔ امن و امان نہیں تھا ۔میر پور کی سلگتی ہوئی صورتِ حال پہلے افواہوں کے ذریعے پھیلی پھر بالآخر پردہ اٹھا ۔

اس حوالے سے میں کہوں گا کہ یہ حکومت غیر نمائندہ اور غیر آئینی ہے ۔بریگیڈئیر

حیات کا دعویٰ ہے کہ ان کی تقرری آئین کے مطابق ہے اور صدرِ پاکستان نے بجا طور پر انہیں صدر منتخب کیا ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ وہ کس آئین کی بات کرتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے آئین میں تو ایسی کسی نامزدگی کی گنجائش نہیں۔ آئین میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر صدر کا عہدہ کسی وقت خالی ہو تو اسے انتخابات کے ذریعے پر کیا جائے۔ یہ بات درست ہے کہ صدرِ پاکستان آزاد کشمیر کونسل کے سربراہ ہیں مگر انہیں صدر نامزد کرنے کا اختیار نہیں۔

مجھ سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ آپ منتخب حکومت پر اصرار کیوں کرتے ہیں۔ دیگر کسی نظامِ حکومت کے تحت معرضِ وجود میں آنے والی حکومت عوام کے مسائل حل نہیں کر سکتی۔

میں نے یہ سوال کیا کہ کیا محض مسائل حل کر دینے والی حکومت کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جیل کی چاردیواری میں ہی ایک قیدی کی ساری ضروریات پوری کر کے آپ اسے خوش رکھ سکتے ہیں؟ وہ ساری زندگی جیل کی زندگی پر صابر اور شاکر رہ سکتا ہے؟

بریگیڈیئر حیات کا دعویٰ ہے کہ ان کی حکومت نے آزاد کشمیر کے عوام کے لیے جو ترقیاتی کام کیے ہیں' ان سے کسی کو انکار نہیں۔

انگریزوں کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ ہمارے راج کی برکتیں لامحدود ہیں۔ ہم سڑکیں، ریلوے، عمارتیں، سکول، شفاخانے اور نجانے کیا کیا کھول رہے ہیں۔ کیا ان کی دلیل تسلیم کر کے برصغیر کے عوام ان کی غلامی میں رہتے۔ آج ہم آزاد کشمیر میں انتخابات پر زور دیتے ہیں تو محض اس لیے کہ منتخب حکومت کے ساتھ عوام کا اپنا لگاؤ ہوتا ہے اور اپنے آپ کو کاروبارِ حکومت میں شریک سمجھتے ہیں۔ منتخب اور جمہوری حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عوام جس وقت چاہیں' اس حکومت کو ہٹا کر نئی حکومت منتخب کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس آزاد کشمیر کی موجودہ حکومت تمام معاملات کو اپنی مٹھی میں بند کر کے بیٹھی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا کبھی بریگیڈیئر حیات نے آزاد کشمیر کا

سالانہ بجٹ عوام یا ان کے نمائندوں سے منظور کروایا ہے۔ کیا وہ لوگوں کو اپنی حکومت پر تنقید کی اجازت دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بریگیڈیئر صاحب کو نہ آزاد کشمیر کی تاریخ کا علم ہے نہ جغرافیے کا۔ انہیں وہاں کے باشندوں کی امنگوں کا کیسے علم ہوگا۔

ہم مطالبہ برائے مطالبہ کے قائل نہیں۔ میں ذاتی طور پر تحریکِ پاکستان کا ایک کارکن ہوں۔ قائداعظمؒ کی ذات سے میری وابستگی جذباتی حد تک رہی۔ وہ اس لیے کہ کشمیر کے بارے میں میرا موٴقف وہی ہے جو سلامتی کونسل کی قراردادوں میں درج ہے۔ خدا کے لیے آزاد کشمیر کے مسائل کو التوا میں نہ رکھئے۔ دنیا کے سامنے کشمیریوں کا کیس خراب ہو جائے گا۔

ہمیں حکومت کی مجبوریوں کا احساس ہے۔ اگر حکومت واقعی مخلص ہے اور اسے آزاد کشمیر کے عوام کا مفاد عزیز ہے تو عوامی اور سیاسی نمائندوں کے ساتھ بیٹھ کر صورت حال کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ہمیں کوئی اعتماد میں لے۔ اپنی مجبوریاں تو سمجھائے۔ صرف اسی صورت میں ہم وقتی طور پر کوئی درمیانی راہ نکالنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

میں نے بریگیڈیئر حیات کا انٹرویو بڑے غور سے پڑھا ہے۔ انہوں نے بعض کشمیری لیڈروں پر سنگین الزامات عائد کیے ہیں اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان کے پاس مکمل ثبوت موجود ہیں۔ میرا موٴقف یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر الزامات کی تردید یا تصدیق نہیں کر سکتا۔ بریگیڈئیر صاحب کو ان کے خلاف مواد سامنے لانا چاہیے۔ اگر یہ درست نکلا تو ہم بھی اس حرکت کے خلاف مزاحمت کریں گے لیکن اگر یہ محض پراپیگنڈہ ثابت ہوا تو پھر کیا کیا جائے۔ الزام تو مجھ پر بھی لگا تھا کہ میں شیخ مجیب الرحمان کی طرز پر آزاد کشمیر کو خود مختار ریاست بنانا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بھی بھارت کے ساتھ گٹھ جوڑ کا الزام لگا تھا مگر کوئی شخص ثبوت سامنے نہ لا سکا۔

رہی بات آخری حل کی۔ میں مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یاد

رکھئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھیں۔ میر پور کے حالیہ واقعات پر روشنی ڈالیں۔ بریگیڈیئر حیات نے جان بوجھ کر تصویر کا غلط رخ پیش کیا ہے۔ وہ پاکستان کی حکومت کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈر پاکستان کی اندرونی صورت حال کا غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں حالانکہ ایسا نہیں میر پور کے واقعات کا پس منظر سراسر مقامی ہے۔ موجودہ ہنگاموں میں سیاست دان اور سیاسی ورکر پیش پیش نہ تھے بلکہ ریڑھی والے، مزدور، رکشا ڈرائیور، دکاندار، وکیل، طالب علم، غرضیکہ معاشرے کے تمام طبقے شامل تھے۔ یہ تمام افراد مسلسل محرومیوں اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ 290 دن تک شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ پھر جزوی ہڑتال رہی اور اب بھی مسلہ دبا نہیں۔

میر پور کے عوام کے ساتھ موجودہ حکومت کا سلوک غلط چلا آ رہا ہے۔ اس شہر سے کوئی مشیر نہیں لگایا گیا۔ اس سے شہریوں کا احساس ہے کہ وہ معاملاتِ حکومت میں کسی طرح بھی شریک نہیں۔ جلتی پر تیل کا کام میر پور ترقیاتی ادارے کے قیام نے کیا۔ پاکستان کے کسی بھی ایسے شہر میں ڈویلپمنٹ اتھارٹی قائم نہیں کی گئی جس کی آبادی ستر ہزار کے لگ بھگ ہو۔ اس قسم کے ادارے کی تشکیل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شہریوں کو اس کے اخراجات کے لیے مزید ٹیکسوں کا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس ادارے نے واٹر ریٹ میں اضافہ کیا۔ ہم اس اضافے کے خلاف نہیں لیکن تباہ کن اضافے کا بوجھ شہریوں کی ہمت سے باہر ہے۔

میر پور کے شہریوں کے غم و غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 75-1974ء میں 600 کے قریب پلاٹ مختلف لوگوں کو الاٹ کئے گئے۔ اس وقت زمین کی قیمت 45ہزار روپے کنال تھی۔ یکا یک تمام الاٹمنٹیں منسوخ کر دی گئیں اور لوگوں سے کہا گیا کہ وہ موجودہ قیمت کے حساب سے دوبارہ پلاٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا

ہے۔ پھر بیرونِ وطن محنت مزدوری کرنے والوں سے کہا گیا کہ میر پور میں پلاٹ حاصل کرنے کے لیے ایک خاص رقم جمع کروائیں اور اب دو سال گزر گئے ہیں لیکن ان پلاٹوں کے نقشے تک تیار نہیں ہوئے۔ لوگ مایوس ہو گئے۔

ایم ڈی اے (منگلا ڈویلپمنٹ اتھارٹی) کے چیئر مین کا رویہ بھی لوگوں کے ساتھ اچھا نہیں۔ وہ کسی کے سامنے جواب دہ تو ہیں نہیں۔ اس لیے لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ وہ ان کی نگہداشت بہتر طور پر نہیں کر رہے۔ یہی وہ عوام ہیں جن سے آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اب بھی اگر ترقیاتی ادارے کو توڑ دیا جائے اور میر پور کے شہریوں کی دیگر مشکلات کا ازالہ کیا جائے تو حالات سدھر سکتے ہیں۔ اگر میری باتوں کو بریگیڈیئر حیات نے چیلنج کرنا ہے تو بہتر ہے کہ وہ خواجہ عزیز الدین کی انکوائری رپورٹ شائع کریں یا جرنلسٹ نیازی کا بیان شائع کریں۔ لوگوں کو حقیقت کا علم ہو جائے گا۔

یہ بات کہ آزاد کشمیر میں انتخابات کے سلسلے میں یہ معاہدہ موجود ہے کہ پاکستان میں عام انتخابات کے دس روز بعد آزاد کشمیر میں انتخابات ہوں گے۔

جناب خورشید نے جواب دیا۔ اگر چہ اس معاہدے پر میرے دستخط نہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اور خود مجھ سے بھی اسلام آباد کے ذمہ دار افراد کی بات چیت ہوئی' اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اصل معاہدہ یہ تھا کہ پاکستان میں 90 دن کے اندر انتخابات ہوں گے اور اگلے دس روز بعد آزاد کشمیر میں گویا ہم نے ایک سو ایک دن میں انتخابات کروانے ہیں۔ یہ سو دن تو کبھی کے گزر چکے اور وعدہ پورا نہ ہوا۔ لہٰذا اب معاہدہ بھی ختم۔ اب تو فی الفور انتخابات ہونے چاہئیں۔

جہاں تک ملک کی اندرونی اور بیرونی صورت حال کی خرابی کے باعث پاکستان میں انتخابات کے التوا کا تعلق ہے تو ہمیں پاکستان کی صورتِ حال سے نتھی نہ کیجئے۔ ذرا ماضی پر نگاہ دوڑائیے۔ 1977ء میں مسٹر بھٹو کے خلاف پاکستان کا ہر شہر حشر کا منظر پیش کر

رہا تھا مگر آزاد کشمیر میں گڑبڑ کے کوئی آثار نہ تھے اور اب میرپور میں کیا نہیں ہوا۔ بچہ بچہ سرتاپا برسرِ پیکار تھا لیکن پاکستان کے حالات میں ہلکا سا ارتعاش بھی نہ ہو سکا۔

جہاں تک آزاد کشمیر کی عوام کے مطمئن ہونے کا تعلق ہے تو ان کے پاس عوام کی خواہشات معلوم کرنے کا کونسا طریقہ ہے۔ یہ سیدھے سادے انتخابات کیوں نہیں کرواتے اور خود مستعفی ہو کر سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں الیکشن لڑیں۔ اگر عوام نے انہیں منتخب کر لیا تو شوق سے حکومت کریں۔ آئزن ہاور بھی ووٹ لے کر امریکہ کا صدر رہا۔ ایوب خان نے بھی بالآخر انتخابات کے ذریعے عوامی سرٹیفیکیٹ حاصل کیا۔

آزاد کشمیر میں انتخابات کی ایک تاریخ اور ایک پس منظر ہے۔ پہلے آزاد کشمیر میں جو حکومت 1962ء کے تحت بنی اس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے تحت' ہماری کوشش یہ رہی کہ پارلیمانی طرز کی حکومت ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ویسی حکومت آج تک آزاد کشمیر میں قائم نہیں ہوئی۔ موجودہ حکومت جو 1947ء کے عارضی الیکشن کے تحت ہے، اس کے اختیارات بھی محدود ہیں لیکن بہر حال ہماری یہی کوشش ہے کہ اس آئین کے تحت انتخابات ہو جائیں کہ اختیارات، کردار، تشخص اور حکومت کے رول میں توسیع بعد میں بھی کر دی جاتی ہے لیکن اس مرتبہ جو انتخابات ہو رہے ہیں' اس میں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ پہلے تو یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ پاکستان میں انتخابات کے فوراً بعد آزاد کشمیر میں بھی انتخابات ہوں گے مگر ایسا نہ کیا گیا۔ بالآخر 3 اپریل کو آزاد کشمیر میں انتخابات کا اعلان کیا گیا اور 15 مئی کو انتخابات کی تاریخ مقرر کی گئی لیکن انتخابات کے شیڈول کا کوئی اعلان نہیں ہوا۔ انتخابات کے شیڈول کا اعلان تین چار روز بعد کیا گیا۔ سب سے حیرت انگیز بات ان انتخابات میں یہ ہے کہ شیڈول کے اعلان کے بعد ایک نیا قانون سامنے آیا۔ اس قانون کے تحت یہ طے پایا کہ آزاد کشمیر میں انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوں گے۔ انتخابات کی تاریخ مقرر کرنے اور انتخابات کا شیڈول کے اعلان ہو جانے کے بعد یہ حیرت انگیز تبدیلی تھی کیونکہ نہ

تو کسی کو اس کا علم تھا اور نہ ہی عوام کو اس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آزاد کشمیر کی سیاسی پارٹیوں سے اس سلسلے میں کسی قسم کا مشورہ بھی نہیں کیا گیا۔ ہمارا ہمیشہ یہ موٴقف رہا ہے کہ آزاد کشمیر کے سیاسی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی لانا مقصود ہو تو اس سلسلے میں آزاد کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لیا جائے کیونکہ اعتماد میں نہ لینے کی وجہ سے بعض اوقات ایسی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں جن کا بڑا اثر پڑتا ہے اور بالخصوص عوام کی نفسیات اور جذبات پر۔ مقبوضہ کشمیر کے علاقوں میں، گلگت اور بلتستان میں، کشمیری مہاجرین میں جو پاکستان میں رہتے ہیں، ان پر غلط قسم کے تاثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت کی نظریاتی اساس کو قائم رکھا جائے۔ یہ آزاد کشمیر کی حکومت صرف آزاد علاقوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ پوری ریاست کی ایک نمائندہ حکومت کی حیثیت رکھتی ہے جس میں مقبوضہ کشمیر کی نمائندگی ہے۔ مہاجرین کی نمائندگی بھی موجود ہے جو آزاد علاقے میں نہیں رہتے اور گلگت اور بلتستان کی بھی نمائندگی ہونی چاہیے۔ آزاد کشمیر کی حکومت کا براہ راست انتظام صرف 4 اضلاع پر مشتمل ہے لیکن ہم سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اعلان ایک ایسے وقت پر ہوا جس سے پورے نظام میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ اس نئے قانون کا مطلب یہ تھا کہ متناسب نمائندگی ہو اور کوئی بھی پارٹی جو کہ 5 فیصدی ووٹ ہر یونٹ میں حاصل نہیں کر سکتی اور تین نشستیں حاصل نہیں کر سکتی، اس پارٹی کو نمائندگی سے محروم کر دیا جائے۔ اس کی رجسٹریشن ختم کر دی جائے گی۔ اس پر ہم نے احتجاج کیا۔ میں نے اپنی طرف سے اور قومی اتحاد کی طرف سے جس کا میں صدر ہوں، احتجاج کیا اور پاکستان کے صدر سے ملاقات کی۔ چنانچہ پہلا قانون واپس لے لیا گیا۔

پہلے قانون کے واپس ہو جانے کے بعد پھر نئی خبریں آئیں کہ کوئی نیا آرڈر نہیں آ رہا ہے۔ یعنی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لوگ انتخابات کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ٹیمیں میدان میں اتر آئی ہیں۔ کھیل شروع ہو چکا ہے اور کھیل کے قوانین میں بنیادی تبدیلیاں کی

جا رہی ہیں ۔اب جو دوسرا مسودہ میرے سامنے آیا' ان میں کہا گیا تھا کہ متناسب نمائندگی تو ختم ہو گئی ۔متناسب نمائندگی کے بعد سیاسی پارٹیوں پر کنٹرول کا ایک نیا حربہ استعمال کیا گیا۔اب کہنے کو آزاد کشمیر میں سیاسی پارٹیوں کی بنیاد پر انتخابات ہو رہے ہیں لیکن سیاسی جماعت کی کیا تعریف ہے؟ وہاں دو تین قوانین ہیں۔ پہلا قانون تو یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن ضروری ہے ۔دوسرے رجسٹریشن میں حکومت جس کو چاہے رجسٹر کرے، جس کو چاہے نہ کرے۔ چنانچہ ایک اختلاف تو یہ پیدا کیا گیا کہ رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ جماعتوں میں۔ اس کے بعد دوسرا جو آرڈیننس جاری کیا گیا ہے' اس آرڈر میں یہ نہیں تھا کہ اگر کوئی پارٹی آزاد کشمیر کے چار اضلاع اور کشمیری مہاجرین جو پاکستان میں ہیں' جو صوبہ جموں اور وادیٔ کشمیر کی نشستیں ہیں' ان کو دو یونٹ تصور کر کے ہر یونٹ میں پانچ فیصدی ووٹ حاصل نہیں کرتیں۔ اس جماعت کے جو منتخب شدہ ممبر بھی اپنی نشستوں سے محروم ہو جائیں گے اور جماعت کی رجسٹریشن منسوخ ہو جائے گی۔ یہ اس قدر غیر سیاسی قانون ہے کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔اس کی مثال دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملتی مثلاً اس میں یہ ہے کہ اگر ایک جماعت آزاد کشمیر کے ضلع میرپور اور مظفر آباد میں 28 نشستوں پر جیت جاتی ہے لیکن وادیٔ کشمیر میں وہ 35 فیصدی کو پورا نہیں کر سکتی تو اس کے 28 ممبرز بھی اپنی نشستوں سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ جمہوریت کے واضح قوانین کے خلاف ہے۔ اگر کوٹلی میں بیٹھا ہوا ایک آدمی اپنے نمائندے کو منتخب کرتا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں کہ پشاور یا کراچی میں بیٹھے ہوئے کسی کشمیری نمائندے کو 5 فیصدی ووٹ لے کر دے ورنہ اسے نشست سے محروم کر دیا جائے گا۔ گویا کوٹلی میں رہنے والے شخص کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق نمائندہ منتخب کر سکتا ہے۔ اسے اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ قانون آزاد کشمیر کے آئین کے بھی خلاف ہے کہ اس میں تو یہ درج ہے کہ اس میں انتخابات براہ راست ہوں گے لیکن یہ انتخابات براہ راست نہیں۔ آج جو بھی پارٹیاں

میدان میں ہیں، ان میں کوئی جماعت اگر جموں کے مہاجرین میں یا کسی 4 اضلاع میں اپنا 5 فیصد کوٹہ یا اجتماعی طور پر ساڑھے بارہ فیصد کوٹہ پورا نہیں کر سکتی تو وہ یقیناً اپنی تمام نشستوں سے محروم ہو جائے گی۔ چنانچہ اس میں ایک اور خرابی یہ ہے کہ بعض جماعتیں محدود ہیں۔تو ہمارا کہنا یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کو قانون میں تبدیلی کرنا تھی تو یہ ضروری تھا کہ کم ازکم رائے عامہ کو تیار کرنے کے لیے پانچ چھ ماہ قبل قانون کا مسودہ پیش کر دیا جاتا۔لوگوں سے رائے لینا چاہیے تھی۔ انتخابات کا یہ مطلب نہیں کہ آپ انتخابات کروائیں مگر نہ ووٹر کو قانون کا پتہ ہو نہ پارٹیوں کو نہ عوام کو اور نہ ہی دانشوروں کو قانون سمجھ آئے۔ چنانچہ اس قانون کی زد میں تین چار چھوٹی چھوٹی پارٹیاں آئیں بلکہ زیادہ پارٹیاں آئیں کیونکہ یہ پارٹیاں محدود تھیں۔ ایک پارٹی ایسی تھی جو صرف ضلع مظفر آباد تک محدود ہے۔کچھ علما کی جماعتیں ہیں جو کہ عوامی قسم کی نہیں ہیں اور 3 سے زیادہ نشستیں حاصل نہیں کر سکتیں اور کسی صورت میں بھی ضلع یا یونٹ سے 5 فیصدی کوٹہ پورا نہیں کر سکتیں تو گویا اس نئے قانون کا منصوبہ یہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی سیاسی پارٹیوں کو اس طریقے سے ختم کر دیا جائے۔

ہم لوگ خود بھی چاہتے ہیں کہ قومی حیثیت کی جماعتیں قائم کی جائیں۔ہم بھی اس حق میں ہیں کہ پارٹیاں چھوٹی موٹی ایک ضلع کی، ایک برادری کی، ایک تحصیل کی نہیں ہونی چاہئیں لیکن اس کے لیے ایک سیاسی طرز ایک سیاسی عمل ہونا چاہیے مگر یہ قانون جو اس طریقے سے میدان میں لایا گیا کہ جب لوگوں نے کاغذات نامزدگی بھی داخل کر دیئے۔ اس کے بعد صورت یہ پیدا ہوگئی کہ 7-8 جماعتوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ الیکشن میں حصہ نہ لیں۔اس طرح ان کو زبردستی الیکشن کے میدان سے نکال دیا گیا اور ہم نے اس بات کو پسند نہیں کیا چنانچہ ہم نے حکومتِ پاکستان سے احتجاج کیا اور ہماری ایک ملاقات وزیراعظم جونیجو سے ہوئی۔انہوں نے ترمیم کی کہ چھوٹی جماعتیں اپنے آپ کو بڑی جماعتوں میں ضم کر دیں تو الیکشن لڑ سکتی ہیں۔ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ الیکشن کا یہ طریقہ کار

غلط اور غیر جمہوری ہے۔ اگر یہ طریقہ ضروری تھا تو اس کو آئندہ کے لیے لاگو کرنا چاہیے تھا۔ اس کو موجودہ انتخابات میں لاگو کرنا درست نہیں ہے۔

اصل بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی اور وہ یہ ہے کہ ووٹروں کی فہرستیں کہیں بھی درست نہیں۔ مثلاً مہاجرین جو پاکستان میں مقیم ہیں' ان کی فہرستیں کاغذی حد تک غلط ہیں۔ اس طرح صوبہ جموں اور وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے مہاجرین کا معاملہ ہے۔ ان باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ صرف یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ کسی طرح الیکشن کرا دیئے جائیں۔ بہر حال ہم لوگوں کی کوشش ہے کہ ہر صورت میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کریں اور ہم بھرپور طریقے سے انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہ بات میں اپنی طرف سے اور قومی اتحاد کی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ دوسرا یہ سوال کہ تحریکِ آزادی پر اس کے کیا اثرات ہونگے۔ مقبوضہ کشمیر میں تو سیاسی طور پر اثرات مرتب ہوں گے اور یہ کہ لوگوں کی مرضی کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیے جو کہ ہمارا موقف بھی ہے۔ لہٰذا اس حد تک تو بات درست ہے مگر تحریکِ آزادی کے بارے میں حکومت ہمارا کوئی پروگرام نہیں بنا سکتی۔ آزاد کشمیر کی حکومت کی کوئی مسلمہ حیثیت نہیں ہے۔ آزاد کشمیر کی حکومت تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سوال کو بین الاقوامی طور پر اٹھانے یا برصغیر میں اٹھانے کے لیے نہ تو اپنے پاس وسائل رکھتی ہے اور نہ ہی اس کو اختیارات دیئے گئے ہیں۔ اس زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تو ان انتخابات کے نتیجے میں جو حکومتِ آزاد کشمیر بنے گی' اس کے اثرات تحریکِ آزادیٔ کشمیر پر گہرے طور پر مرتب نہیں ہوں گے۔ ہاں اگر حکومت کو با اختیار بنایا جائے تو منتخب حکومت اثرات ڈال سکتی ہے۔

آزاد کشمیر میں جمہوری عمل ناگزیر ہے' اس لیے کہ 1931ء سے لے کر آج تک اہلِ کشمیر کی تمام تر کوشش اور جدوجہد اس نقطے پر مرکوز ہے کہ ریاست کے مستقبل اور اقتدارِ اعلیٰ کے مالک یہاں کے عوام ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے لاکھوں کشمیریوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا کیونکہ اہلِ کشمیر کو کامل یقین ہے کہ تمام سامراجی قوتوں کو عوام

کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ کشمیر کا آزاد خطہ جسے کشمیر کے نہتے عوام نے بے سروسامانی کی حالت میں مہاراجہ کشمیر اور بھارتی فوجوں سے آزاد کروایا تھا' آج صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں عوام بنیادی پیدائشی حقوق سے محروم ہیں۔ اس صورتِ حال سے آزاد کشمیر میں زبردست بے اطمینانی اور مایوسی کی فضا پائی جاتی ہے اور نوجوان عناصر ہم سے پوچھتے ہیں کہ آزادی حاصل کرنے کے چھتیس سال بعد بھارتی مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانا تو درکنار، ہم لوگ بنیادی حقوق، آزادی کی بحالی اور جمہوری اداروں کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیا یہی آزادی جو آج ہمیں حاصل ہے، مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کے جذبۂ آزادی کو ابھار سکتی ہے۔ آزاد کشمیر کی موجودہ صورتِ حال سے مقبوضہ کشمیر میں تحریکِ آزادی اور پاکستان کے وسیع تر مفادات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

آزاد کشمیر میں ایک غیر نمائندہ، غیر جمہوری اور غیر آئینی انتظامیہ کو مسلط کرنا بھارت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے۔ آزادی کی روح سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے آزاد کشمیر میں علاقائی اور برادری ازم کے تعصب کو ہوا دی جا رہی ہے اور کرپشن' بدعنوانیوں' دھاندلیوں اور سرکاری خزانہ کی رقوم کو خرد برد کیا جا رہا ہے۔ ان پر پردہ ڈالنے کے لیے نام نہاد تعمیر و ترقی کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ آزادی اور بنیادی پیدائشی حقوق کو تعمیر و ترقی کے نام پر کوئی بھی باغیرت قوم قربان نہیں کر سکتی۔ حکومت کی نا اہلی اور انتظامیہ کی ناکامی کا واضح ثبوت بڑھتی ہوئی رشوت ستانی ہے۔ آزاد کشمیر کی انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ منشیات اور شراب انتظامیہ اور پولیس کی سرپرستی میں فروخت ہو رہی ہیں اور بدعنوان افسروں کی پشت پناہی ہو رہی ہے۔ صرف بجلی کے محکمہ میں کروڑوں روپیہ کا غبن ہوا ہے۔ وقت آنے پر ان لوگوں کا بھی محاسبہ ہوگا۔

اگر آزاد کشمیر میں انتخابات جمہوری بنیادوں پر ہوں گے تو نفسیاتی طور پر اس کا اثر مقبوضہ کشمیر کے لوگوں پر اچھا پڑے گا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ لوگوں کی رائے سے

مستقبل کا فیصلہ کیا جائے۔ اس حد تک انتخابات درست ہیں لیکن جہاں تک تحریک
آزادی کو آگے بڑھانے کا تعلق ہے میرا خیال ہے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ اس لئے
کہ آزاد حکومت بے اختیار ہے۔ یہ بات ایسے ہی ہے کہ لاہور میونسپل کارپوریشن کے
انتخابات ہوں اور یہ کہا جائے کہ مسئلہ افغانستان حل ہو جائے گا۔ گلگت اور بلتستان پر روسی
حملے کا خطرہ ہے اس میں آزاد کشمیر حکومت کی نمائندگی بھی نہیں ہے۔ اگر وہاں کچھ ہوتا تو
آزاد حکومت کیا کر سکتی ہے۔ گلگت اور بلتستان کے لوگوں کو حق رائے دہی بھی نہیں ہے۔
ان کی نمائندگی نہ آزاد کشمیر میں ہے نہ پاکستان میں' نہ ہی کسی صوبے میں ہے' نہ ہی ان کی
اپنی کوئی منتخب حکومت قائم کی گئی ہے۔ میں نے بار بار مطالبہ کیا ہے کہ ان کو بھی آزاد
حکومت میں حق ملنا چاہیے جس کے ساتھ وہ منسلک ہیں لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں
دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تحریک آزادئ کشمیر کے کچھ پہلو ہیں۔ اس کے نفسیاتی' بین
الاقوامی' ڈپلومیٹک پروپیگنڈا اور عسکری پہلو بھی ہیں۔ ان معاملات میں آزاد کشمیر کی
حکومت کو کوئی اختیار نہیں۔ آزاد کشمیر کی حکومت صرف یہ کہہ سکتی ہے کہ آزاد کشمیر کے لوگ
یہ چاہتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے مسئلے کو لوگوں کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے۔ لیکن اس
سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیں تو اس کا کوئی اختیار نہیں۔

انتخابات کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اگر ان میں کوئی تبدیلی کرنی تھی تو کم از
کم 3 ماہ پہلے اس بات کا اعلان کر دیتے تو کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی لیکن بار بار وزیر امور کشمیر
اور حکومتِ پاکستان نے یہ یقین دلایا کہ انتخابات 1973ء کے آئین کے مطابق ہوں
گے لیکن جب تاریخ مقرر ہو گئی' کاغذات نامزدگی داخل کروا دیئے گئے تو پورا ڈھانچہ تبدیل
کر دیا گیا۔ اس کے لئے نہ تو سیاسی جماعتیں' نہ ووٹر' نہ عوام' نہ ہی امیدوار تیار تھے۔ پاکستان
میں ہونے والے انتخابات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ پاکستان میں سیاسی جماعتیں ہی
نہیں تھیں۔ پاکستان میں مارشل لاء ہے۔ پاکستان میں امیدوار ذاتی حیثیت سے سامنے

آئے۔ کسی کا کوئی منشور ہی نہیں تھا۔ آزاد کشمیر میں حالات کا فرق ہے۔ سیاسی جماعتیں یہاں موجود ہیں' مارشل لاء نہیں' آئین موجود ہے۔ اس لئے جو یقین دہانی کروائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ پرانے آئین کے تحت انتخابات ہوں گے۔ عین وقت پر جو تبدیلی کروائی گئی' ہمیں اس پر اعتراض ہے۔ ہم اس سے نہیں گھبراتے کہ ہم پانچ فیصد یا بارہ فیصد ووٹ حاصل نہیں کرسکیں گے۔ جو اختلافات پیدا ہو رہے ہیں' وہ حل ہو جائیں تو اس کا اثر خوشگوار ہوگا۔
دھاندلی کی ابتداء ووٹوں کی فہرستوں سے ہی کر دی گئی تھی۔ آزاد کشمیر میں ووٹوں کی فہرستیں غلط بنائی گئیں اور ہمارے احتجاج کے باوجود انہیں درست نہ کیا گیا۔ الیکشن کمشنر نے پہلے یہ اعلان کیا کہ کل ووٹ ساڑھے سترہ لاکھ ہیں جبکہ 1985ء میں کل ووٹ ساڑھے نو لاکھ تھے۔ دو سال میں آٹھ لاکھ ووٹرز کا اضافہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر جب ہم نے احتجاج کیا تو پانچ لاکھ ووٹ کاٹ دیئے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ پانچ لاکھ ووٹرز کون تھے جو پہلے شامل کئے گئے اور پھر کاٹ دیئے گئے۔ وہ پانچ لاکھ کس کے اشارے پر ووٹرز بنائے گئے۔ یہ افراد کون تھے؟ ان کی عمریں کتنی تھیں؟ یہ لوگ رہتے کہاں تھے۔ اگر یہ ووٹر جعلی نہیں تھے تو پھر ہمارے احتجاج پر کاٹ کیوں دیئے گئے اور اگر یہ ووٹ جعلی تھے تو یہ ووٹر بنائے کیوں گئے؟ ہمارے ان سارے سوالات کا جواب حکومتِ آزاد کشمیر کے پاس نہیں ہے۔
پھر پولنگ سکیم میں بھی دھاندلی کی گئی۔ زیادہ تر پولنگ سٹیشن ایسے دیہاتوں میں بنائے گئے جہاں کا کوئی مقامی امیدوار مسلم کانفرنس سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ جہاں جہاں ہمارے امیدواروں کا اثر ورسوخ تھا وہاں پولنگ سٹیشن بنانے سے دانستہ طور پر احتراز کیا گیا۔ اس طرح ہمارے ووٹرز کو پریشان کیا گیا۔ پھر ہمارے ہاں ووٹ ڈالنے کا جو بھی نظام اور طریقہ کار رائج کیا گیا' اس میں ووٹر حضرات سے ووٹ خریدنے میں آسانی پیدا ہوگئی۔ اس طرح حکومتی امیدواروں نے کھلے عام ووٹ خریدے اور ووٹ کی پرچی اپنے اپنے ہاتھوں سے بیلٹ بکس میں ڈالی۔ اس طریق کار پر بھی ہم نے اعتراض کیا لیکن ہمارے

مطالبے کوتسلیم نہ کیا گیا۔ پولنگ کے لیے جو عملہ متعین کیا گیا تھا' اس عملے کی تقرری میں بھی آخری دن تک تبدیلیاں کی گئیں اور سرکاری امیدوار کو اس کی پسند کا عملہ دیا گیا تاکہ وہ ان کے تعاون سے اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکے۔

اکثر مقامات پر پولنگ افسروں کو دو دو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو ووٹوں کی پرچیاں پہلے سے ہی فراہم کر دی گئی تھیں کہ وہ حکومتی امیدوار کے بیلٹ بکس میں یہ پرچیاں ڈال کر ان کو شکست سے بچا سکے۔ کئی پولنگ سٹیشنوں پر اس طرح کی پرچیاں پکڑی گئیں۔ پریزائیڈنگ افسروں کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ عوام کا فیصلہ چاہے کچھ بھی ہو' وہ صرف سرکاری امیدوار کی کامیابی کا اعلان کریں گے۔ ایسے کئی پولنگ سٹیشن ہیں جہاں ہمارے ووٹرز کی تعداد زیادہ ہے لیکن فیصلہ ہمارے خلاف سنایا گیا اور یہ کہا گیا کہ آپ الیکشن ٹربیونل کے پاس جائیں۔ ظاہر ہے کہ الیکشن ٹربیونل سالہا سال تک کوئی فیصلہ نہیں کرتا اور یوں حکومت نے اپنے ناکام امیدواروں کو بھی بلدیاتی اداروں کے اندر بھجوا دیا۔

بھارتی وزیراعظم کے اس بیان پر کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے' حکومتِ پاکستان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ پاکستان کی کچھ سیاسی پارٹیاں اب اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کچھ کہہ رہی ہیں کہ یہ پنجاب کا مسئلہ ہے۔ کوئی اسے سرحد کا مسئلہ قرار دے رہی ہیں یعنی کہ اس کا پاکستان کے وجود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ پاکستان کی وجہ سے ہے۔ اب جن سیاسی پارٹیوں کا یہ موقف ہے کہ اس کا پاکستان کے مسئلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں' ان کا اثر ہماری تحریکِ آزادی پر پڑے گا۔ حکومتِ پاکستان کو چاہئے کہ وہ آزاد کشمیر کے نمائندوں کو اعتماد میں لے کر کوئی اقدام کرے اور بر وقت کرے اور خاص طور پر بھارت کے بیانات سے مرعوب نہ ہو اور اپنے بنیادی موقف یعنی لوگوں کی مرضی کے مطابق آزادی سے رائے شماری کرائے جانے پر قائم رہے۔

یہ بات پاکستان کے موجودہ آئین کے آرٹیکل نمبر 257 میں بھی درج ہے کہ

پاکستان نے کشمیر کے مسئلے پر کمزوری دکھائی تو پاکستان کا دفاع اور معیشت خطرے میں ہوگی اور پاکستان کو کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ پاکستان کے تحفظ' آزادی' مستقبل اور عزت و آبرو کی بات ہے یہ صرف ہماری آزادی کی بات نہیں۔

مجموعی طور پر پاکستان کی حکومت اور عوام دل سے کشمیریوں کے ساتھ ہیں لیکن ماضی میں وزارتِ داخلہ اور امور کشمیر کے اندر ایسے افسروں کی بھرمار رہی ہے جنہوں نے اپنی حماقتوں سے مسئلے کو مزید پیچیدہ کر دیا۔ ایک طرف انہوں نے آزاد کشمیر میں جمہوری ادارے نہ قائم ہونے دیئے تو دوسری طرف وقتاً فوقتاً اس مسئلے کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہے۔ صرف ایک مثال دوں گا۔ آزادیٔ کشمیر کی تحریک کو مقبوضہ کشمیر میں ایک دفعہ دولاکھ روپے کی ضرورت پڑ گئی۔ آزاد حکومت کی طرف سے روپیہ دینے کا فیصلہ ہوا کیونکہ کشمیری بھائیوں کی مدد ہم پر فرض تھی۔ جن ذرائع سے یہ روپیہ وہاں پہنچایا گیا، وہ بد دیانت تھے۔ دو سال بعد معلوم ہوا کہ وہاں دولاکھ میں سے صرف 5 ہزار پہنچے۔ مسئلہ کشمیر کے لیے صَرف کیے جانے والے روپے سے لوگوں نے صحت افزا مقام پر کوٹھیاں بنوائیں' کاریں خریدیں اور مغربی ممالک کے دورے کیے۔ یہ شکایت حکومت سے ہے نہ پاکستانی عوام سے، شکایت ان نااہل اور بددیانت افسروں سے ہے، جو مسئلہ کشمیر کو بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں قیامِ امن کا انحصار مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل پر ہے۔ اقوامِ متحدہ کی منظور کردہ قراردادوں اور حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر کشمیر کا تنازعہ بلا تاخیر حل ہونا چاہیے۔ بھارتی وزیر خارجہ کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی نہیں کہ کشمیر کے بارے میں اقوامِ متحدہ کی قراردادیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ کشمیری عوام تاشقند اور شملہ معاہدوں کے پابند نہیں ہیں۔ ریاستی عوام کسی ایسے معاہدے کو تسلیم نہیں کریں گے جس میں وہ خود شامل نہ ہوں۔ میری جماعت جموں و کشمیر کے مشرقی، مغربی اور شمالی حصوں کو ایک وحدت تسلیم کرتی ہے۔ ہم پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستی اور خوشگوار تعلقات کے مخالف نہیں لیکن کشمیری عوام

کے حق خود ارادیت کی قیمت پر یہ دوستی قائم نہیں ہو سکتی۔ ہم پاکستان کو مضبوط، خوشحال اور مستحکم دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس کے تحت ہم نے پاکستان کے الیکشن سیل کو کچھ تجاویز دی تھیں۔ ان میں کہا تھا کہ پاکستان کا مفاد اس بات میں ہے کہ قومی حکومت کے قیام سے قبل قومی سطح پر سیاسی سطح پر سیاسی تصفیہ ہونا چاہیے۔ میں نے کراچی اور لاہور میں مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں، وکلا اور صحافیوں سے ملاقات کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سب مکاتبِ فکر کے لوگ سیاسی تصفیہ کے حق میں ہیں کیونکہ مارشل لا کے زیرِ سایہ کوئی حکومت قومی حکومت نہیں کہلا سکتی جب تک وہ عوام کے منتخب کردہ نہ ہوں۔ اس وقت کی بین الاقوامی صورتِ حال اور پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی حالات کے مدنظر سیاسی تصفیے کو اولیت دینی چاہیے۔ ملک زیادہ عرصے تک مارشل لاء کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ فوج کو سول معاملات سے ہٹ کر اپنے اصل فرائض کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ کسی بھی غیر متوقع صورت حال کا مقابلہ کر سکے۔

آئندہ انتخابات کی تاریخ اور طریق کار کا تعین بھی سیاسی تصفیے میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے آئین میں کسی بنیادی تبدیلی کا کام بھی آئندہ کی منتخب پارلیمنٹ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ آزاد کشمیر کی موجودہ حکومت کو اپنی غیر جانبداری برقرار رکھنے کے لیے ان شکوک اور شبہات کو دور کرنا چاہیے جو اس کے کردار کے بارے میں عوام میں پیدا ہو رہے ہیں کہ یہ حکومت آزاد کشمیر کی کسی ایک سیاسی جماعت کے کہنے پر کام کرتی ہے۔ محاسبہ کسی جانبداری اور امتیاز کے بغیر ہونا چاہیے۔ آزاد کشمیر میں بے روزگاری اور مہنگائی کے مسئلے شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ حکومت کو ان مسائل کے حل پر بھی توجہ دینا چاہیے۔ مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم پاکستان میں قومی حکومت کے قیام کے لیے سرگرمی سے مصروف رہے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ کوشش قومی اتحاد کی کوشش سے شروع کی تھی یا پس منظر میں کوئی اور ہاتھ کارفرما تھا۔ انہوں نے مفتی محمود سے جو معافی مانگی تھی وہ کس بنیاد پر تھی؟ ہم

پاکستان کی داخلی سیاست میں عملی حصہ لینے کے مخالف ہیں۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق سے اپیل کی کہ وہ ذاتی طور پر مداخلت کر کے پاکستان میں صحافیوں کے مسئلے کو حل کریں۔ ہم آزادیٔ رائے کے حامی ہیں۔ صحافیوں کو کوڑے لگانے کے بھی ہم سخت مخالف ہیں۔

لائن آف کنٹرول کے جو الفاظ ہیں' یہ ہمارے اوپر لاگو نہیں ہوتے۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کی ایک اصطلاح ہے جو ہم پر لاگو نہیں ہوتی اور نہ ہم شملہ معاہدہ کو مانتے ہیں' نہ تاشقند معاہدے کو کیونکہ ان دونوں معاہدوں کے وقت کشمیریوں کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا اور جو حکومت پاکستان وہاں گئی تھی' وہ بھی کشمیریوں کی نمائندہ نہیں تھی نہ ہی کشمیریوں کا نمائندہ ان میں موجود تھا۔

یہ سیز فائر لائن کی جو اصطلاح ہے' وہ یو این او کی قرارداد میں استعمال ہوئی ہے۔ وہ قرارداد اپنی جگہ موجود ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لہٰذا شملہ معاہدہ جو ہے' وہ اس قرارداد کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر شملہ معاہدے کے ذریعے وہ اس قرارداد کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یو این او میں جانا پڑے گا لیکن بات یہ ہے کہ اگر یو این او میں نہیں جاتے اور لائن آف کنٹرول پر ہی زور دیتے ہیں تو بالآخر یہی اصطلاح ہو جائے گی۔ ہم لائن آف کنٹرول کے مخالف اس لئے بھی ہیں کہ سیز فائر کا مطلب یہ ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہیں' وہاں ہی سیز فائر ہے گویا لائن مستقل نہیں بنتی۔ اگر آپ چار قدم آگے بڑھ گئے تو وہاں لائن بن گئی۔ اگلے روز اس میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے مگر لائن آف کنٹرول کا مطلب یہ ہے کہ لائن تبدیل نہیں ہوگی۔ اس لئے ہمارا یہ خیال تھا کہ لفظ سیز فائر لائن استعمال ہونا چاہیے۔ باقی رہا یو این او کے مبصر تو وہ پہلے بھی زیادہ موثر نہیں رہے تھے۔ ان کا کام صرف رپورٹ کرنا ہوتا ہے۔ انکا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ سیز فائر لائن کی کس نے پابندی توڑی ہے۔ بھارت نے یا پاکستان نے خلاف ورزی کی ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ مبصر وہاں کیوں نہیں گئے جبکہ وہ تو وہیں موجود ہیں۔

مسئلہ کشمیر کا عدم جارحیت سے تعلق نہیں ہم کشمیر کو ہندوستان کا حصہ نہیں مانتے۔
میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات استوار ہونے چاہئیں ہم مسائل کے پر امن حل کے حق میں ہیں۔ہندوستان کو چاہئے کہ وہ کشمیر کے عوام سے رائے شماری کا وعدہ پورا کرے۔

بات یہ ہے کہ بین الاقوامی معاملات اور سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی۔ پر امن ذرائع سے مسئلے کے حل کے امکان کو میں رد نہیں کرتا۔میں سیاست دانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلے پر نہرو کی ہٹ دھرمی کے خلاف مزاحمت کریں کیونکہ نہرو خود کہتے تھے کہ میں کشمیری ہوں' اس لئے یہ میرا جذباتی مسئلہ ہے۔

ہماری اطلاعات کے مطابق بھارت نے دو ہزار مربع میل پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس طرح بھارت نے شملہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ہم کشمیری شملہ معاہدہ کو نہیں مانتے۔اگر آج بھارت سیاچین پر قبضہ کرتا ہے تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔

ہماری ہر حکومت نے تنازعۂ کشمیر کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے آبرومندانہ تصفیہ کی ضرورت ظاہر کی لیکن جو اقدامات ہونے چاہئیں وہ نہیں کئے گئے اور کشمیر کی تحریکِ آزادی کو منظم کرنے اور آگے بڑھانے کے لیے مناسب مواقع اہلِ کشمیر کو فراہم نہیں کئے گئے۔بعض اوقات منفی طرزِ فکر بھی غالب آ گئی مثلاً ایوب خان نے جن کے لیے میرے دل میں بڑی عزت ہے، ایک موقع پر اخبار نویسوں سے یہاں تک کہہ دیا کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو گا تو ہمیں فائدہ نہیں ہو گا' نقصان ہی ہو گا۔دراصل ایوب خان جنگ سے بہت گھبراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جنگ قومی مفاد میں نہیں۔یہ بات صحیح تھی لیکن جنگ کے علاوہ دوسرے طریقے بھی اختیار کئے جا سکتے تھے اور کشمیری رہنما اس بارے میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے' اس کی انہیں اجازت نہیں دی گئی۔

یہ سوال غلط مفروضوں پر مبنی ہے کہ میں کشمیری تھا اور مجھے کشمیر ہی سے دلچسپی تھی

اس لیے میں کشمیر کا لیڈر رہا مگر پاکستان کو غلام قسم کی لیڈر شپ کے حوالے کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ میرا تعلق کشمیر سے ہے۔ اگر میں نے اپنا زیادہ وقت کشمیر کی سیاست کو دیا ہے تو وہ بھی تکمیلِ پاکستان ہی کا ایک حصہ ہے۔ اگر میں آپ پر یہ الزام لگاؤں کہ ہمارے دوسرے پاکستانی بھائیوں نے موجودہ پاکستان پر ہی قناعت کر لی۔ پاکستان پر اپنی جغرافیائی اور نظریاتی وسعتوں کو پھیلانے کے سلسلے میں جو فرائض عائد ہوتے تھے' ان سے وہ پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر جب جوناگڑھ نے پاکستان سے الحاق کیا اور اس کے بعد بھارت نے جوناگڑھ پر یلغار کی جو پاکستان کا حصہ بن گیا تھا' اس کے دفاع کے لئے کچھ نہ کیا گیا۔ اس لئے ایک پاکستانی اور ایک کشمیری کی حیثیت سے میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ خود پاکستان کے وقار' عزت اور بین الاقوامی پوزیشن کے منافی ہو گا کہ کشمیر کی آزادی کی تحریک کو ٹھوس بنیادوں پر نہ چلایا جائے مگر اس کے باوجود جب بھی پاکستان میں کوئی بنیادی مسئلہ کھڑا ہوا تو میں نے کبھی اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کی۔ اب موجودہ وقت میں جب میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان ایک نازک دور سے گزر رہا ہے' اگر میں کوئی خدمت کر سکا تو کبھی پیچھے نہیں رہوں گا۔

اس ضمن میں مسلم لیگ کے مختلف گروپوں کا اتحاد ایک قابلِ تعریف قدم ہے۔ اگر مسلم لیگ سابقہ غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے جرأت مندانہ اقدام کرے تو یہ پاکستان کے استحکام کے لئے بہت اچھا ہو گا۔

اصل میں ہم لوگ دقیانوسی قسم کے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ جو بنیادی نظریہ تھا' اس نظریے کے مطابق چلیں اور اگر میں خود کو کشمیر کے مسئلے تک محدود کرتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں تحریکِ پاکستان کے تسلسل کو قائم رکھتا ہوں اور اگر میں یہاں رہتا ہوں کشمیر کے مہاجر کے طور پر تو آج اگر کشمیر کے مہاجرین اور کشمیری لوگوں کا رابطہ کٹ جائے تو اس سے کشمیر کے مسئلے کو بہت نقصان پہنچے گا اور یہی ہندوستان کی کوشش ہے کہ ان

میں کوئی میل جول یا واسطہ نہ رہے۔ مگر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں پاکستان کی سیاست سے لاتعلق نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا جب محترمہ فاطمہ جناحؒ نے ایوب خان کے خلاف الیکشن لڑا تو میں نے کھل کر محترمہ کی حمایت کی تھی کیونکہ یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو مقامی سیاست ہے' میں اس میں شامل نہ ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں باقی اختلافی باتوں کو چھوڑ کر کشمیر کے مسئلے کو قومی مسئلہ سمجھ کر ایک پلیٹ فارم بنائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں جمہوریت کے لیے' عوام کے حقوق کی بحالی کے لیے ہر کشمیری کا حصہ لینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا پاکستانیوں کا اور اگر پاکستان کے یہی حالات رہے تو شاید مجھے بھی اس بات پر غور کرنا پڑے گا کہ میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ پاکستان میں صرف کروں۔

کشمیر کے مسئلے پر رائے شماری اس لئے ناقابلِ قبول حل ہے کہ اس پر پاکستان' ہندوستان اور کشمیری تینوں متفق تھے مگر اس کے اور حل بھی ہیں۔ اگر رائے شماری نہیں ہوتی تو دوسرے راستے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ہمارا یقینِ کامل ہے کہ کشمیر کے تسلی بخش حل کے بغیر نہ بھارت چین سے رہ سکتا ہے اور نہ پاکستان۔

دوسری بات یہ کہ ہم اس مسئلے کو ایک مرحلے تک لے جا چکے ہیں۔ یہ مسئلہ یو این او میں ہے جہاں رائے شماری کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن کشمیر سے بھارت نے فوجیں نہیں نکالیں۔ پہلے یہ کوشش ہونا چاہیے کہ کشمیر سے بھارتی فوجیں نکلیں لوگوں کو اس پوزیشن میں لایا جائے کہ وہ کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اس لئے قبل از وقت ایسے مسائل اٹھانے کا فائدہ نہیں ہوگا۔

میرے نزدیک ایک سیاست دان کے لئے محبِ وطن ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کو بڑی حد تک بے لوث بھی ہونا چاہیے۔ جو سیاست دان صرف اپنے ذاتی مفادات کے لیے سیاست میں آتا ہے' میرے خیال میں وہ سیاست دان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

جولوگ ملکی اورقومی مفادات کوپیش نظرنہیں رکھتے اوراپنے اصولوں پر سمجھوتہ کر کےصرف اور صرف اقتدار کے حصول کوہی اپنامقصد بنالیتے ہیں' میں انہیں سیاست دان نہیں سمجھتا۔

میں سیاست میں بے خوفی اور جرأت کا قائل ہوں۔ جوشخص بے خوف اور جرأت مندنہیں ہے' وہ صحیح معنوں میں سیاست میں چل نہیں سکتا۔ جہاں تک دھونس اور دھاندلی کاتعلق ہے' مجھے ذاتی طور پر کبھی ان کا سامنانہیں کرناپڑا البتہ یہ بات افسوس سے کہناپڑتی ہے کہ پاکستان میں جوبھی الیکشن ہوا' اس میں دھاندلی ہوئی۔ آزادکشمیر میں صرف ایک بارالیکشن میں دھاندلی نہیں ہوئی۔وہ انتخابات میں نے کروائے تھے اور میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ انتخابات انتہائی غیر جانبدارانہ اورمنصفانہ تھے۔اس کے بعد جتنی بار بھی آزادکشمیر میں الیکشن ہوئے' ان میں کسی نہ کسی رنگ میں ضرور دھاندلی ہوئی۔ اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ہماری کوئی کوشش دھاندلی کا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

پی پی پی میں ہماری شمولیت سے بعض غلط فہمیاں شاید اس لئے پیدا ہوئیں کہ لوگ اس مسئلے کوصرف پاکستان کی عینک سے دیکھتے ہیں۔اس پارٹی میں ہماری شمولیت ذاتی نہیں تھی بلکہ یہ ایک جماعتی فیصلہ تھا۔جس کا پاکستان کی اندرونی سیاست سے کوئی دخل نہیں تھا۔اس کامقصد کوئی عہدہ قبول کرنانہیں تھاہم نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا بلکہ یہ الحاق اس لئے ہواتھا کہ اس وقت پی پی پی کے چیئرمین اور پاکستان کے وزیراعظم مسٹر بھٹو نے کشمیر کے مسئلے کوحل کرنے کے لئے تعاون کی اپیل کی تھی۔ چنانچہ ہماری جماعت نے فیصلہ کیا کہ وزیراعظم کی اپیل کواس وقت مسترد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔یہ ایک عارضی سمجھوتہ تھاجوکہ ساتھ ہی ختم ہوگیا اورلبریشن لیگ جس نے کبھی اپنے اصولوں پر سودابازی نہیں کی' آج بھی اپنے اصولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں سرگرم ہے۔

مقبوضہ کشمیر کی داخلی سیاست

مقبوضہ کشمیر کی داخلی سیاست میں ایک مکتبۂ فکر ایسا ہے جو کشمیر کی قسمت کو بھارت کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ کشمیر کے لیے بھارت میں ایک علیحدہ آزادانہ حیثیت کا بھی طلب گار ہے مگر مقبوضہ کشمیر کے عوام کی اکثریت پاکستان کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرنے کی خواہش مند ہے۔ ایک مکتب خیال یہ بھی ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں کی رضا مندی سے کشمیر کو آزاد اور غیر جانبدار ریاست بنائی جائے اور اس کے تعلقات دونوں سے خوشگوار ہوں لیکن یہ چیز خواب وخیال کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں رائے عامہ یہ ہے کہ بھارت اپنی فوجیں یہاں سے ہٹا لے اور آزادانہ استصواب رائے کے ذریعے کشمیری عوام کو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا حق دے۔ اس وقت تک مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ کشمیر کے تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے کشمیر کے لیے ایک آزادانہ حیثیت تسلیم کرائی جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بھارت میں صوبائی خودمختاری چاہنے والے مختلف صوبوں کے رہنماؤں کے ساتھ رابطہ بھی قائم کیا تھا تا کہ ایک متحدہ محاذ بنایا جا سکے لیکن شیخ عبداللہ کی یہ کوشش نا کام رہی ہے اور کشمیری عوام بھی اس طرح کی کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ وہ آزادی چاہتے ہیں اور رائے شماری چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ 30 برس پہلے جن عوامل اور محرکات کی وجہ سے برصغیر تقسیم ہوا تھا' وہ اب بھی مقبوضہ کشمیر میں موجود ہیں اور بھارتی حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود کشمیری عوام کی وابستگی پاکستان کے ساتھ ہی ہے حالانکہ بھارتی حکومت نے مقبوضہ علاقے میں اقتصادی ترقی کے بڑے بڑے کام بھی کیے ہیں لیکن اس سے بھی کشمیری عوام کا احساس محرومی دور نہیں ہوا اور وہ اپنے آپ کو محکوم اور غلام سمجھتے ہیں۔

باب پنجم

جموں وکشمیر لبریشن لیگ

جموں وکشمیر لبریشن لیگ' ایک جماعت' ایک تحریک' ایک لائحہ عمل

جموں وکشمیر لبریشن لیگ کا قیام 30 ستمبر 1962ء کو مظفر آباد کے مقام پر ایک نمائندہ کنونشن میں عمل میں لایا گیا۔ پیشتر اس کے کہ ان محرکات پر نظر ڈالی جائے جو اس کے وجود کا باعث بنے' یہ مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی سیاسی اور آزاد کشمیر کی آئینی صورت حال پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔

آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا پہلا اعلان 4 اکتوبر 1947ء کو کیا گیا تھا اور اس کے ذریعے ساری دنیا کو اہل کشمیر کے اس عندیے اور نظریے سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ ریاستی عوام مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کو ریاست کی آئینی اور نمائندہ حکومت تسلیم نہیں کرتے۔ یہ اعلان 1931ء کی تحریک آزادی کے بنیادی محرکات کو بدلے ہوئے حالات میں عملی شکل دینے کی ایک مناسب اور بروقت کوشش تھی۔ ریاستی عوام ڈوگرہ آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اس انقلاب کو ایک باضابطہ سیاسی سانچے میں ڈھالنا اور حصول مقصد کی طرف پیش قدمی کرنا ایک قومی ضرورت بن چکی تھی۔ چنانچہ بین الاقوامی قوانین' آزادی کی روایات کے اپنانے اور قومی عزم کے اظہار کا یہ بہترین اور معروف طریقہ تھا۔ صرف بیس 20 دن بعد کشمیری حریت پسندوں نے اپنے پاکستانی بھائیوں کی مدد سے (اس میں کوئی سرکاری امداد شامل نہیں تھی) ریاست کے ایک اچھے خاصے حصے کو آزاد کرا کے 24 اکتوبر 1947ء کو باضابطہ حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ سردار ابراہیم خان اس کے صدر مقرر ہوئے اور میر واعظ محمد یوسف شاہ صاحب بھی ان کی کابینہ میں شامل تھے۔ اس حکومت نے قائم ہوتے ہی آزاد علاقہ جات کا انتظام سنبھال لیا۔ ہری سنگھ کو معزول کر دیا

اور مظفر آباد کی حکومت پوری ریاست کی عوامی نمائندہ اور جمہوری حکومت کے طور پر معرض وجود میں آ گئی مگر اس حکومت کو باضابطہ طور پر قانونی حکومت تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس موقع پر دو اہم باتیں ذہن نشین کرنی ضروری ہیں۔ پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ اس حکومت کے قیام کو پورے پاکستان میں سراہا گیا۔ پاکستانی عوام نے نئی حکومت کو مہاراجے کی جانشین حکومت کے طور پر تصور کرتے ہوئے اس کے صدر کو جو عزت عطا کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ حکومتِ پاکستان نے اس حکومتِ آزاد کشمیر کی کوئی مخالفت نہیں بلکہ آزاد حکومت کی ہر لحاظ سے امداد کرنے کا وعدہ کیا۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ 1931ء کے انقلاب اور بالخصوص 13 جولائی کو جب 22 نوجوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا تو مسلم کانفرنس کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ عوام کا ایک اظہار بغاوت تھا۔ جماعت کی تشکیل دو برس بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی منسلک ہے کہ 1947ء کو جو حکومت قائم ہوئی' وہ نہ مسلم کانفرنس نے قائم کی تھی اور نہ ہی مسلم کانفرنس نے آزاد کشمیر فوج کو ترتیب دیا تھا۔ یہ بھی پاکستان کے تسلیم کرنے کے بعد کشمیریوں کی تحریک آزادی کے ایک مظہر کے طور پر اٹھی۔ مسلم کانفرنس سے باہر جو عناصر تھے اور ناوابستہ عوام سب نے اس آزاد حکومت کی تشکیل میں حصہ لیا۔ جب تک رائے شماری کے معاہدے UNO کی دو قراردادیں 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کو پاس ہوئیں اور جنگ بندی کا اعلان ہوا۔ اس حکومت کا مسلم کانفرنس سے کوئی آئینی تعلق نہ تھا۔ چودھری غلام عباس جب 1948ء میں شیخ عبداللہ سے ایک معاہدے کے تحت پاکستان آئے تو قائداعظمؒ نے ان کو مہاجرین کی آبادکاری کے کام کے سلسلے میں ذمہ داریاں سونپ کر آزاد حکومت کے عملی معاملات میں عمل دخل سے دور رکھا۔

مسلم کانفرنس اگرچہ بہت پرانی جماعت تھی لیکن اس جماعت نے بعض ایسے اقدامات کیے جن سے کشمیر کے حریت پسند اور جمہوری اقدار پر یقین رکھنے والے کارکن

بہت زیادہ مایوس ہوئے۔مثال کے طور پر حکومتِ پاکستان کی وزارتِ امورِ کشمیر یہ فیصلہ کرتی تھی کہ آزادکشمیر کی حکومت کا سربراہ کون ہوگا۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہماری پوری تحریکِ آزادی وزارتِ امورِ کشمیر کے جائنٹ سیکرٹری اور کلرکوں کے تابع تھی۔علاوہ ازیں مسلم کانفرنس نے دس بارہ سال تک اقتدار میں رہنے کے باوجود کشمیر کی تعمیر وترقی کے لئے کوئی قابل ذکر کام نہ کیا۔آزادکشمیر میں انتخابات تک نہ کروائے گئے اور جمہوری نظام کی توسیع کے لئے کوئی کام نہ کیا۔مسلم کانفرنس عوام کا اعتماد حاصل کئے بغیر صرف وزارتِ امورِ کشمیر کے ساتھ سودے بازی کے ذریعے اقتدار پر قابض رہی۔اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہم نے ایک نئی سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس کی۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ جنگ بندی یکم جنوری 1949ء کو عمل میں لائی گئی۔اس وقت کسی ''مجاہد اول'' کا نام نہیں سنا گیا تھا۔جنگ بندی کے بعد بدقسمتی سے ہر کام الٹ ہوتا گیا۔پہلی بات تو یہ ہوئی کہ ایک معاہدے کے مطابق رولز آف بزنس وضع کئے گئے جن کے تحت یہ قرار پایا کہ ''آزادکشمیر کا صدر وہ شخص ہوگا جس کو آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل جس کے ارکان کی تعداد آئین کے تحت 300 ہونا چاہے تھی اور جن میں صوبہ کشمیر کے 60 فیصدی ارکان تھے منتخب کرے گی۔

مسلم کانفرنس وہی اصل اور آئینی متصور ہوگی جس کو وزارتِ امورِ کشمیر کا جائنٹ سیکرٹری تسلیم کرے گا۔

اب اس دوران مجاہدین نے گلگت اور بلتستان میں بھی ڈوگروں کو شکست دے کر آزادی حاصل کر لی تھی۔ایک معاہدے کے تحت عارضی طور پر ان علاقوں کو پاکستان کی عارضی انتظامی تحویل میں دے دیا گیا۔اس معاہدے پر آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی طرف سے چودھری غلام عباس اور آزاد حکومت کی طرف سے سردار ابراہیم خان صدرِ حکومت کے دستخط تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادکشمیر حکومت کے زیرنگیں جو علاقہ جات براہ راست آئے

ان میں کوئی بھی ضلع مکمل نہیں تھا۔صرف مظفر آباد قریب قریب مکمل آزاد ہوا۔

پونچھ جو پہلے جاگیر کہلاتی تھی' اس کی دو تحصیلیں پلندری اور راولا کوٹ اور کچھ حصہ تحصیل حویلی اور مینڈھر آزاد ہوا اور اسے ضلع پونچھ بنا دیا گیا۔ضلع میر پور جس میں کوٹلی بطور تحصیل شامل تھا' کا کچھ حصہ بھی مقبوضہ کشمیر میں ہی رہا۔بہر حال ان کو تین اضلاع قرار دیا گیا۔ان کا رقبہ 5000 مربع میل کے لگ بھگ ہے۔گویا آزاد حکومت کے پاس براہ راست 5000 مربع میل کا رقبہ اور 1941ء کی مردم شماری کے مطابق قریب 8 لاکھ آبادی تھی۔

سرحدی اضلاع گلگت اور بلتستان کا رقبہ تقریباً 27 ہزار مربع میل اور اس وقت آبادی 4 لاکھ سے کم تھی مگر یہ دونوں اضلاع پاکستان کا حصہ نہیں ہیں۔پاکستان کی سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق اور سلامتی کونسل میں پاکستان کے موقف کی بنا پر اور تاریخی اعتبار سے یہ سرحدی اضلاع آزاد کشمیر کا حصہ ہیں۔

آزاد حکومت کی حیثیت میں تبدیلی

24 اکتوبر 1947ء کو قائم ہونے والی حکومت اگرچہ باغی حکومت تھی لیکن بین الاقوامی قانون کے تحت وہ کشمیر کی نمائندہ اور آئینی حکومت بن چکی تھی۔رولز آف بزنس نے سب سے پہلے اس حکومت پر کاری ضرب لگائی۔

1- مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل جو کہ صدر کا انتخابی ادارہ تھی ایک نوکر شاہی کے پرزے کی تابع مرضی ہو کر رہ گئی۔

2- صدرِ حکومت کے تمام اختیارات چیف ایڈوائزر کے تابع کر دیئے گئے۔اس چیف ایڈوائزر کی تقرری میں صدرِ حکومت کا کوئی دخل نہیں تھا۔

مسلم کانفرنس کے کارکنوں اور لیڈروں کی درجہ بدرجہ فہرستیں تیار کی گئیں اور جائنٹ سیکرٹری وزارتِ امورِ کشمیر نے ان کے وظائف مقرر کئے جو 50 روپے سے 500 روپے ماہوار تک تھے اور اس طرح اچھے اچھے سیاسی کارکن وزارتِ امورِ کشمیر کے رحم وکرم پر

چھوڑ دیئے گئے۔

مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کو بھی جس کے 200 اراکین کے بارے میں خیال تھا کہ اس کو عام رکن منتخب کریں گے بالکل بے دست و پا کر دیا گیا اور ایک قرارداد کے ذریعے جنرل کونسل کے تمام اختیارات 21 نامزد ارکان کی ورکنگ کمیٹی کے حوالے کر دیئے گئے۔ گویا اب صدرِ حکومت کو بھی وہ 21 ممبر منتخب کرتے تھے جو کہ خود نامزد کئے جاتے تھے اس صدرِ مسلم کانفرنس کی طرف سے جس کو جائنٹ سیکرٹری بہ نفس نفیس پسند فرماتے تھے۔ یہ تھی وہ صورتِ حال جبکہ مجھے یکم مئی 1959ء کو آزاد حکومت کا صدر انہی رولز آف بزنس کے تحت مقرر کیا گیا۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ 1949ء سے 1959ء تک چند کوششیں آزاد کشمیر کو جمہوری بنانے کے لئے کی گئیں مگر ان تمام کوششوں کو سازشوں اور طاقت سے دبا دیا گیا۔ وہ ایک الگ داستان ہے۔ میں ایک غیر جانبدار صدر کی حیثیت سے آیا اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد جمہوری اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کی تو بہت سے ''بڑے'' ناراض ہو گئے۔ چنانچہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ آزاد کشمیر کے ڈھانچے کو جمہوری شکل دی جائے۔ اولاً ان رولز آف بزنس کو ختم کیا جائے جن کی وجہ سے وزارتِ امورِ کشمیر نے پورے سیاسی عمل پر گرفت حاصل کر لی تھی اور دوسرے یہ کہ ایک نئی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی جائے جو کشمیری عوام اور بالخصوص آزاد کشمیر میں بسنے والے اور مہاجرین کے درمیان تعلق قائم رکھتے ہوئے تحریک آزادئ کشمیر کو اصل ڈگر پر ایک آبرومندانہ اور پروقار طور سے واپس لائے اور ان کی نظریاتی اساس کو مضبوط کرے۔

پاکستان میں ایوب خان کے مارشل لاء کی وجہ سے یہ عمل سست رہا مگر قدم قدم چل کر بالآخر محدود طریقے پر ہی سہی مگر پہلی بار رولز آف بزنس کے خاتمے کے بعد آزد کشمیر میں ایک منتخب انتخابی ادارہ قائم کیا گیا اور 7 اکتوبر 1961ء کو آزاد کشمیر میں پہلی منتخب

جمہوری حکومت معرضِ وجود میں آئی۔اس میں ایک منتخب صدر کے علاوہ ایک 12 رکنی منتخب سٹیٹ کونسل کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔یہ پہلا منتخب عوامی ادارہ تھا۔

لبریشن لیگ کا قیام

یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ مسلم کانفرنس اپنی پرانی ڈگر کے باعث کسی جمہوری نظام یا ڈھانچے کو فطری طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ مسلم کانفرنس کی حکومت کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ تحریکِ آزادی دب کر رہ گئی تھی۔کارکن بے حس ہو چکے تھے۔گلگت اور بلتستان سے رابطہ کٹ چکا تھا اور آزاد علاقے میں سرے سے کوئی نمائندہ ادارہ موجود نہیں تھا۔ تحریکِ آزادی کے متعلق مسلم کانفرنس کا کوئی واضح لائحہ عمل یا کوئی سوچ نہیں تھی۔

ان حالات میں ایک نئی جماعت کا قیام ناگزیر ہو گیا۔ ریاست میں تحریکِ آزادی کے بے شمار کارکن اور رہنما مسلم کانفرنس کی منجمد پالیسی سے بیزار ہو چکے تھے۔کچھ نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔رولز آف بزنس کے تحت مسلم کانفرنس کو اجارہ داری حاصل تھی۔ اس نے بھی آزاد سیاسی عمل کی راہیں تنگ کر دی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ مہاجرین کشمیر مقیم پاکستان اور خود آزاد کشمیر میں بے شمار سیاسی عناصر نے مجھے ایک نئی جماعت کی تشکیل کا مشورہ دیا اور کئی مہینوں کے بحث مباحثے اور تبادلۂ خیالات کے بعد بالآخر ایک نئی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ ایک نمائندہ کنونشن میں کیا گیا۔ اس کنونشن میں جو 29-30 ستمبر 1962ء کو مظفر آباد میں منعقد ہوا' 2000 مندوبین نے شرکت کی جن میں 9 منتخب سٹیٹ کونسلر اور آزاد کشمیر کے سینکڑوں منتخب یونین کونسلز' تحریکِ آزادی کے کارکن اور دوسرے نمائندے شامل تھے۔جماعت کا نام جموں وکشمیر لبریشن لیگ رکھا گیا۔ایک آئین بھی منظور کیا گیا جس میں تحریکِ آزادی کو مضبوط جمہوری خطوط پر استوار کرنے اور تیز تر کرنے کے لئے آزاد کشمیر کی حکومت کو پوری ریاست کی نمائندہ اور آئینی حکومت کے طور پر تسلیم کرانے کے عزم کا اظہار کیا گیا تا کہ حقِ خود ارادیت اور آزادی جو کہ اہلِ کشمیر کی

سیاسی تحریک کی اصل منزل ہے اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی جائے۔

لبریشن لیگ اور تحریکِ پاکستان

ہم نے اپنی جماعت جموں وکشمیر لبریشن لیگ 1962ء میں بنائی۔ اس میں لفظ لبریشن یعنی آزادی پہلی بار ہماری جماعت کے نام کا حصہ بنا۔ اس سے پہلے مسلم کانفرنس پیپلز کانفرنس، عوامی کانفرنس اور بھی جماعتیں تھیں لیکن لبریشن کا لفظ ہم نے استعمال کرنا شروع کیا۔ ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ آزادکشمیر کے علاوہ گلگت اوربلتستان کے علاقے بھی کشمیر کا ہی حصہ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان سب علاقوں پر مشتمل حکومت آزادکشمیر کو اتنے اختیارات ہوں کہ وہ پوری یکسوئی اور تندہی کے ساتھ پورے کشمیر کی آزادی کی تحریک کو نقطۂ عروج پر لے جائے۔ ہم گلگت اوربلتستان کو بھی آزادکشمیر اسمبلی میں نمائندگی دینے کا اس لیے مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک مشترکہ حکمتِ عملی تیار کر کے جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے اور اگر ایسا ہو جاتا تو ہماری حکمتِ عملی ایک صحیح سمت پر چل پڑتی۔ آزادکشمیر حکومت کو چونکہ اس کا اصل کردار ادا نہ کرنے دیا گیا' اس لیے کشمیری نوجوانوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر سوچنا شروع کر دیا۔ 1965ء کی جنگ کے بعد تاشقند کے معاہدے میں اور پھر 1971ء کی جنگ کے بعد شملہ معاہدے میں کسی کشمیری کو نمائندگی نہیں دی گئی۔ ہم نے اس بنیاد پر ان دونوں فیصلوں کو قبول نہیں کیا۔ میں یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم بھارت اور پاکستان کے درمیان دوستی کے خلاف نہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہوں اور کشمیر دیوار بننے کی بجائے پل کا کام دے مگر ایسا نہیں ہونے دیا جا رہا۔ معاہدہ تاشقند اور معاہدہ شملہ کے باوجود کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔

1964 میں اس ضمن میں آخری کوشش ہوئی جب بھارت نے شیخ عبداللہ کو اس خیال سے پاکستان بھیجا تھا کہ شاید دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر کے تنازعے کا کوئی حل نکل آئے۔ کچھ عرصہ کے لیے یہ امید بھی بندھی کہ بھارت اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرے گا

مگر پنڈت نہرو کے انتقال اور اس کے بعد 1965ء کی جنگ کے بعد بھارتی رہنماؤں نے یہ بہانہ بنانا شروع کر دیا کہ اب اس مسئلے پر بات چیت نہیں ہوگی۔ کیا یہ بات نہیں ہے کہ کشمیر برصغیر کا وہ واحد حصہ ہے جس کے عوام آج تک صحیح معنوں میں آزادی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔ سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے علاقوں نے اپنی مرضی سے 1947ء میں پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ بھارت کے مختلف حصے بھی اپنی مرضی کے مطابق بھارت کا حصہ بنے مگر کشمیر کو اپنی پسند کا حق استعمال کرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔

آج پاکستان میں سب سے زیادہ مظلوم تحریکِ پاکستان اور نظریۂ پاکستان ہے۔ ہر وہ شخص جو تحریکِ پاکستان اور قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کا مخالف تھا' اپنی پرانی خفت کو مٹانے اور اس پر پردہ ڈالنے کے لئے تاریخ کو توڑ مروڑ کر اور واقعات پر پردہ ڈال کر اپنی بڑائی ثابت کرنے میں مشغول ہے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے اور اس کے بے شمار مظہرات ہیں جس کا ہمارے موضوع سے قریبی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں صرف کشمیر کے حوالے سے جستہ جستہ ذکر کروں گا تاکہ مسئلہ کشمیر اور پاکستان کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی کوشش میں مدد مل سکے۔ قریباً چالیس برس گزرنے کے بعد اب دوسری نسل کے نوجوان بھی اس تعلق' اس تاریخ اور حقائق کو جاننے کے لئے مضطرب ہیں اور یہ ان کا حق بھی ہے۔

تحریکِ پاکستان اور کشمیر

تحریکِ پاکستان صرف پاکستان کے علاقوں یا مسلمانانِ برصغیر کی آزادی کی تحریک ہی نہیں بلکہ یہ پورے برصغیر کی آزادی کی تحریک کو صحیح' منصفانہ اور حقیقت پسندانہ ڈگر پر لانے کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آزادی اس شکل میں ہو جس سے برصغیر کی تمام اقوام اور علاقے مطمئن ہوں۔ تحریکِ پاکستان میں جو رہنما شامل تھے' ان میں سے اکثر وبیشتر وہی تھے جو تحریکِ آزادئ ہند میں شامل تھے۔ ان میں قائدِاعظم محمد علی جناحؒ سرفہرست تھے جو گاندھی سے قبل نہرو کے والد موتی لال نہرو کے ہم عصر اور برصغیر میں آزادی کے روح

رواں تھے۔ ان میں مولانا شوکت علی' مولانا محمد علی جوہر کے بھائی نواب اسمٰعیل خان' چودھری خلیق الزماں' حسین شہید سہروردی' مولوی فضل الحق' سردار عبدالرب نشتر' خان بخت جمال خان' محمد ایوب کھوڑو' حاجی عبداللہ ہارون' عبدالمتین چودھری' مولانا جمال میاں' مولانا حسرت موہانی' مولانا ظفر علی خان اور کئی دیگر ایسے بزرگ اور تحریک آزادی کے نام لیوا اور جان نثار بھی شامل تھے۔ انہوں نے خلافت تحریک اور آزادی کی تحریک میں طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں اور انگریزی سامراج کو للکارا۔

قائداعظمؒ کی یہ کوشش کہ پورے برصغیر کو ایک جدید جمہوری اور آزاد ریاست میں تبدیل کیا جا سکے کامیاب نہ ہوسکی۔ انصاف کے حصول' حقوق انسانی کا مکمل اور صحیح تصور اور جمہوری اصولوں کا یہ تقاضہ تھا کہ برصغیر کو تقسیم کر دیا جائے۔ تقسیم کی یہ تحریک ہی تحریک پاکستان بنی۔ قائداعظمؒ ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور انتہائی تجربہ کار قانونی ماہر تھے۔ انہوں نے اس تخیل کو اور مسلمانوں کی امنگوں اور اسلامی ملت کے تصور کو یکجا کر کے جو نظریہ پیش کیا' وہ یہ تھا کہ قومیت کی یہ تعریف اب دنیا کے باقی حصوں میں بھی اپنائی جارہی ہے۔ قومیت کی بنیاد محض ایک علاقہ یا ایک زبان نہیں بلکہ اس میں نظریۂ حیات فلسفۂ زندگی اور عقیدہ بھی شامل ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ ہر قوم کے لئے ایک وطن بنیادی ضرورت ہے اور یہ علاقہ انہی علاقہ جات پر مشتمل ہوسکتا ہے جہاں ان کی اکثریت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں صرف وہی علاقے شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہ اصول جمہوری نقطۂ نظر سے بھی ضروری تھا۔ مسلم لیگ کا یہ دعویٰ ہندوؤں اور انگریزوں نے مسترد کر دیا مگر یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہندوؤں میں کانگرس کے مشہور لیڈر اور مسٹر گاندھی کے سمدھی راج گوپال اچاریہ جو بعد میں ہندوستان کے گورنر جنرل بنے' نے 1944ء ہی میں مسلم لیگ کے مطالبے کو تسلیم کرنے کی تحریک پیش کر دی تھی۔ بعض اچھوت لیڈر بھی اس

کے حامی ہو گئے تھے کیونکہ یہ اصحاب بھی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ برصغیر کی آزادی کا صحیح مفہوم مسلمانوں اور دیگر اقوام کو آزادی سے محروم رکھ کر پورا نہیں ہو سکتا۔

1945ء میں منعقد ہونے والی پہلی شملہ کانفرنس جو لارڈ ویول نے طلب کی تھی اسی سوال پر ٹوٹی کہ آیا مطالبۂ پاکستان مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہے کہ نہیں۔ قائداعظمؒ کے دعوے کو انگریزوں نے مسترد کر دیا اور اس امر کا واضح ثبوت تب ہی مل سکتا تھا اگر انتخابات میں مسلمان مسلم لیگ کا ساتھ دیتے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا تھا۔ ان انتخابات میں اصل مسئلہ یہی تھا کہ پاکستان بننا چاہئے یا نہیں؟

آل انڈیا مسلم لیگ اور دیسی ریاستیں

برصغیر کی سیاست سے بے خبر لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تقسیمِ ہند کا فارمولا جو کہ 3 جون 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پیش کیا' ریاستوں پر بھی لاگو تھا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ برصغیر کے دو حصے سمجھے جاتے تھے۔ برطانوی ہند British India اور دیسی ریاستیں جنہیں بعض اوقات Indian States بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دیسی ریاستیں جن کی کل تعداد 500 سے بھی زیادہ تھی اور جن میں حیدرآباد دکن' جموں و کشمیر' میسور' جوناگڑھ اور گوالیار جیسی ریاستیں بھی تھیں' براہ راست برطانوی حکومت کے تحت نہیں تھیں۔ ہر ریاست کا ایک الگ آئین اور دستور تھا۔ چنانچہ یہ بات 1947ء میں ہی طے پا گئی تھی کہ برطانوی حکومت کے انتقالِ اقتدار کے بعد ریاستیں اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں گی اور برطانوی تاج کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔

برصغیر کی دونوں بڑی جماعتوں یعنی آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگرس کا دائرہ کار بھی صرف برطانوی ہند تک ہی محدود تھا۔ ریاستی عوام سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا اور نہ ہی ریاستوں میں ان جماعتوں کی شاخیں قائم تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آل

انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ قائم کی گئی جس میں مختلف ریاستوں کی مختلف تنظیموں کا الحاق تھا اور اس کا تعلق قائداعظمؒ والی آل انڈیا مسلم لیگ سے تھا۔ دوسری طرف سٹیٹس پیپلز کانفرنس تھی جس کا تعلق انڈین نیشنل کانگرس سے تھا۔ دوسرے الفاظ میں کانگرس پارٹی اور مسلم لیگ کے فیصلوں اور نظریات سے تو ان سیاسی جماعتوں کو اتفاق تھا مگر وہ جماعتی لحاظ سے ان کی پابند نہیں تھیں۔

ریاستوں کے بارے میں قائداعظمؒ نے بالکل واضح پالیسی اختیار کی اور وہ یہ تھی کہ حکمران اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرے۔ اس کے برعکس کانگرس پارٹی نے پہلے تو یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ صرف عوام کی رائے کو مدنظر رکھا جائے گا مگر بعد میں اس نے ریاستی حکمرانوں کی حمایت اور فوج کشی کا سہارا لیا اور اس طرح سے حیدرآباد، جوناگڑھ اور کشمیر میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ ریاست کا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ ہمیں اس وقت اس پہلو پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ مختصراً یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ پاکستان اور آزادیٔ ہند کے قانون اور قائداعظمؒ کی پالیسی اور نظریۂ پاکستان جو کہ جمہوری اساس پر قائم تھا' کے مطابق ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی عوام پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

بھارت کو یہ یقین تھا کہ ریاست جموں و کشمیر کی اکثریت بھارت کے خلاف اور پاکستان کے حق میں فیصلہ کرے گی۔ حیدرآباد میں انہوں نے پہلے نظام حیدرآباد کی خوشامد کی' پھر دھمکیوں سے کام لیا۔ جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو بالآخر فوجی کارروائی کے ذریعے قبضہ کر لیا۔ ٹراونکور اور جوناگڑھ میں بھی ایسے ہی حربے استعمال کیے گئے۔ یہی چال کشمیر میں بھی چلی گئی اور ریاست کے عوام کی بغاوت کو بہانہ بنا کر بھارت اپنے اصل روپ میں آیا اور فوج کشی کر کے بیشتر حصے پر قابض ہو گیا۔

''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا نعرہ

اوپر کی مختصر بحث سے واضح ہو گیا ہو گا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اور قائداعظمؒ نے

ریاستوں کے بارے میں کبھی طاقت کے استعمال کی پالیسی روا نہیں رکھی۔نظریۂ پاکستان کا بنیادی اصول یہی ہے کہ جو بھی صوبہ یا ریاست پاکستان میں شامل ہو وہاں کے لوگوں کی آزادانہ رائے کے مطابق ہو۔یہی وجہ ہے کہ ہماری نظر میں جب تک رائے شماری نہیں ہو جاتی' کشمیر کے وجود اس کے تشخص' اس کی وحدت اور اکائی کی مسلمہ حیثیت ضروری ہے۔ اس کے برعکس اگر شروع سے ہی اس کی نفی کر دی جائے اور اپنے وجود حیثیت اور تشخص کو ہم تسلیم کرنے سے سرے سے ہی انکار کر دیں تو دوسرا مرحلہ کبھی بھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔

''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا نعرہ کشمیری نوجوانوں نے ڈوگرہ راج میں 1941ء-1942ء میں لگایا جبکہ اسے وہاں جرم سمجھا جاتا تھا اور جموں کے ایک مجسٹریٹ نے ایک فیصلے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ریاست کے اندر پاکستان کا نعرہ لگانا بغاوت کے مترادف ہے لیکن اس کے باوجود بھی مسلم سٹوڈنٹس یونین کے جلسوں میں یہ نعرے بلند ہوتے رہے۔اب پاکستان میں بیٹھ کر یہ نعرہ لگانا اس لئے ہمارے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا کہ اس وقت سوال مقبوضہ کشمیر کی آزادی کا ہے۔پہلی توجہ اس کی طرف مذکور ہونی چاہئے۔ وہاں یہ نعرہ لگانے کا مطلب مہاراجے پر عوامی جذبات کو واضح کرنا تھا کیونکہ اس وقت مسئلہ ریاست کے الحاق کا تھا' اب مسئلہ مقبوضہ کشمیر کی آزادی کا ہے۔یہی وجہ ہے کہ لبریشن لیگ کا نام بھی لبریشن لیگ یعنی تنظیم آزادی رکھا گیا ہے اور آزاد حکومت کو تسلیم کرنیکی تجویز کا مطلب بھی ریاست کے تشخص کو قائم رکھتے ہوئے کشمیری عوام کی مرکزیت کو اجاگر کرنے اور انہیں ایک محور کے گرد اکٹھا کر کے تحریک آزادی کو تیز کرنا ہے۔اور جب خود پاکستان نے بھی استصواب کے موقف کو دنیا بھر کے سامنے اپنایا ہے تو یہ تاثر دینا کہ ہم ایک ہی تخیل اور ایک ہی منزل کو لوگوں کی طرف سے قبول کریں گے حق خودارادیت اور آزادیٔ رائے کے اصول کی نفی کرتا ہے۔

جب مقبوضہ کشمیر میں یا پاکستان کے قیام سے قبل ریاست میں یہ نعرہ لگتا تھا تو ان

کی وقعت بڑھ جاتی تھی کیونکہ وہاں جوابی نعرے بھی لگتے تھے۔اس لئے وہاں اس نعرے کی اہمیت نمایاں تھی اب کشمیر کو اگر طاقت کے زور سے یا زبردستی قبضہ کر کے پاکستان کا حصہ بنانا ہے تو یہ تحریکِ پاکستان کے بنیادی اصول کی نفی ہوگی اور اگر پاکستان نے طاقت کے بل بوتے پر کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنا ہے تو پاکستان کو سلامتی کونسل سے اپنا کیس واپس لے کر واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کرنا چاہیے مگر کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہوں نے غیر منطقی موقف اپنا کر تحریکِ پاکستان سے اپنی لاعلمی کا بھانڈا پھوڑا ہے۔

لبریشن لیگ کو یقینِ کامل ہے کہ اہلِ کشمیر حریت اور پاکستان سے وابستگی کے خواہاں ہیں' اس لئے ہمیں اس بات کا ذرہ بھر بھی شائبہ نہیں کہ اہلِ کشمیر جو فیصلہ کریں گے' وہ کشمیریوں کی عزت و آبرو اور پاکستان کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ ہمیں یہ بھی شک نہیں کہ پاکستانی مدبر اور رہنما اتنے گئے گزرے ہیں کہ وہ کشمیریوں کی خواہشات اور امنگوں کا احترام نہیں کریں گے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر پر اصولی جھگڑا یہی ہے۔

ہاں اگر یہ نعرہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' ہوسِ اقتدار کی خاطر لگایا جا رہا ہے تو اس کی وقتی افادیت بھی اب ختم ہو چکی ہے۔ یہ حقیقت ان واقعات سے عیاں ہے جو پاکستان میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔

تحریکِ پاکستان کے اصولوں سے انحراف

دراصل پاکستان خود ہی لیاقت علی خان کے قتل کے بعد سے اپنی راہ سے بھٹک گیا جس کا واضح ثبوت مارشل لا' آمریت اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے فراہم کیا ہے۔ اپنی راہ سے بھٹکنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کہ ہر جگہ نت نئے نعرے بلند ہونا شروع ہو گئے۔ انتخابات نہ کروانا' فوجی حکومت قائم کر کے مارشل لا لگانا اور جمہوری نتائج کو تسلیم نہ کرنا یہ وہ سنگین اقدامات ہیں جو تحریکِ پاکستان کے اصولوں سے انحراف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ

انحراف نہ ہوتا تو آزاد کشمیر حکومت کی بھی وہی پوزیشن ہوتی جو 24 اکتوبر 1947ء کو تھی۔ ظاہر ہے یہ پوزیشن لبریشن لیگ نے تجویز نہیں کی تھی بلکہ تحریکِ پاکستان کے بنیادی نظریات' قائداعظمؒ کی حکمت عملی اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر اختیار کی گئی تھی۔ جب پاکستان میں انحراف کا عمل شروع ہوا تو آزاد کشمیر پر بھی اس کی زد پڑی اور ہمارے اچھے اچھے با اصول رہنما بھی پاکستان کے اندر اس رجحان کو یا تو نہ بھانپ سکے یا پھر خود غرضی کا شکار ہو کر انہوں نے بھی اس روش کو اپنانے میں ہی خیریت سمجھی۔

اس انحراف کا جو شدید نقصان تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو ہوا وہ بیان سے باہر ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں ہی گلگت اور بلتستان کے لوگوں کو اتنے برسوں سے کسی بھی نمائندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس سے بڑا تاریخی ظلم اور نظریۂ پاکستان کے بالکل برعکس عمل اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے عوام کو کسی قابل ہی نہیں سمجھا گیا۔ ہری سنگھ کے زمانے میں کشمیر اسمبلی میں بھی ان علاقوں کو نمائندگی حاصل تھی مگر اس سے بھی ان کو محروم کر کے اس علاقے کو نوکر شاہی کی عشرت گاہ بنا دیا گیا ہے اور ریاستی عوام میں ایک خلیج حائل کرنے کی زوردار کوشش کی جارہی ہے۔ اب تاریخ کے حوالوں اور فرضی قصے کہانیوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ گلگت اور بلتستان تو کبھی کشمیر کا حصہ ہی نہیں تھے۔ تاریخ کو جھٹلانے کے اس عمل کی گھناؤنی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ریاست کی سب جماعتیں اب گلگت اور بلتستان کے عوام کی آزاد کشمیر میں نمائندگی اور ان کے حقوق اور ان کا جائز مقام دلانے میں ہم خیال ہو چکی ہیں۔ اگرچہ درپردہ سازشیں اب بھی جاری ہیں اور وزارتِ امورِ کشمیر کے ملازم اور وزارتِ خارجہ کے لال بجھکڑ جو آج تک پاکستان کا ایک بین الاقوامی مسئلہ بھی حل نہیں کروا سکے' آج بھی اس ڈگر پر چل رہے ہیں۔ اگر پاکستان کے اس علاقے کو کوئی نقصان پہنچا اور تحریکِ آزادی کو ٹھیس آئی تو ان کی ذمہ داری اور اس کے انجام سے انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

تحریکِ پاکستان کا پہلا اصول آزادی، دوسرا جمہوریت، تیسرا اسلامی سماجی انصاف اور عدل۔ یہ تینوں آج ان علاقہ جات میں ناپید ہیں اور یہی مقاصد تحریکِ آزادی کشمیر کے بھی ہیں۔

تحریک کے اصول نظر انداز کر کے گلگت و بلتستان کو ٹیم بنا کر پہلا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اہل کشمیر کی یکجہتی پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ کشمیری عوام کی قوت کو کمزور کرنا اور ان کو ایک دوسرے سے دور رکھنا بھارتی ایجنٹوں کی کوشش تو ہو سکتی ہے، پاکستان اور نظریہ پاکستان پر یقین رکھنے والوں کی نہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کی وحدت

اس وقت ریاست کا معاشرہ جغرافیائی لحاظ سے تین اور آبادی کے لحاظ سے چار حصوں میں بٹ چکا ہے۔ لبریشن لیگ کا موقف یہ ہے کہ ریاست کو ایک بار آزاد کیا جائے اور پھر عوام کی مرضی کے مطابق مستقبل کا فیصلہ حتمی طور پر کیا جائے۔ علاقائی تقسیم میں ایک حصہ جو بھارت کے پاس ہے، اس کی آزادی تک اس علاقے کو باقی آزاد علاقے سے نہیں ملایا جا سکتا لیکن آزاد کشمیر، گلگت و بلتستان کو ایک کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لبریشن لیگ اس مسئلہ کو بنیادی اہمیت کا حامل سمجھتی ہے کہ شمالی کشمیر یعنی گلگت و بلتستان کو آزاد علاقے کے ساتھ ملا کر کشمیری عوام سے یکجہتی اور قوت کا مظاہرہ کیا جائے۔ اس کے بعد تحریک آزادی کے لئے حکمت عملی اور اقدامات وضع کئے جائیں۔ وہاں کے ریاستی باشندوں کو ان کے پورے حقوق دیئے جائیں تاکہ وہ برابر کے شہری ہونے کی حیثیت سے اپنا بھرپور اور موثر کردار ادا کر سکیں۔

جہاں تک کشمیری عوام کا تعلق ہے، مہاجرین تنظیم پاکستان کو نمائندگی دے کر اس حکومت کو کافی حد تک نظریاتی اور نمائندہ بنا دیا گیا ہے لیکن انتظامی تقسیم نے ایک بڑے عنصر کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت پاکستان دیدہ و دانستہ

کشمیری عوام کو تقسیم رکھنا چاہتی ہے جبکہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ضروری ہے کہ اس عارضی تقسیم کو ختم کر دیا جائے۔

آزاد حکومت کو تسلیم کرنے کی تجویز

آزاد حکومت کو تسلیم کرنے کی تجویز پاکستان کو اپنے مربی ہمدرد اور بالآخر اپنی منزل مقصود کے ناتے پیش کی گئی ہے۔ یہ تجویز 1961ء میں اس وقت پیش کی گئی جبکہ پاکستان نے امریکہ کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہمی دفاع اور فوجی امداد کا معاہدہ طے پا گیا تھا بلکہ پاکستان نے امریکہ کے بنائے ہوئے ''بغداد پیکٹ''(CENTO) اور (SEATO) جنوب مشرقی ایشیا کی تنظیم میں شرکت کر لی تھی۔ پاکستان کے اس عمل نے روس کی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ پاکستان کے ان امریکہ نواز اقدامات کا توڑ تلاش کرے۔ چنانچہ فروری 1957ء میں جبکہ سلامتی کونسل میں کشمیر کے اندر بین الاقوامی فوج کی تعیناتی کی قرارداد پیش ہوئی تو روس نے اسے ویٹو (Veto) کر دیا اور امریکی نمائندے نے خوش ہو کر یہ کہا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ روسیوں نے ویٹو کر دیا ہے اور ہم اس سے بچ گئے ہیں''۔ اس ویٹو کے بعد اور اس سے قبل گراہم ڈکسن اور اقوام متحدہ کے دیگر مشن اور کمیشن جب ناکام ہوئے تو یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ اگر کشمیر کے لوگ آزادی چاہتے ہیں تو انہیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ پاکستان اپنی سفارتی جنگ ہار گیا تھا یا یہ کہ اس نے کشمیر کو نظر انداز کر کے ایسے معاہدے کر لئے جو بالآخر خود اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئے۔ چند ہی سالوں میں CENTO اور SEATO بیکار ہو کر رہ گئے کیونکہ یہ سامراجی قوتوں کی توسیع پسندی کے اقدامات تھے اور پاکستان کی حکومت نے ایک نہایت ہی محدود نقطۂ نظر اپنا کر ان کا ساتھ دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ 1959ء میں یکم مئی کو جب میں نے صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا تو جمہوری نظام کے قیام کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بھی میرے ذہن میں تھا۔ چنانچہ میں

نے کافی سوچ بچار کے بعد 1960ء یہ تجویز پیش کر دی۔ جس کے بعد لبریشن لیگ نے اپنے مقاصد میں اسے شامل کر لیا۔

تحریکِ آزادی میں استقلال

لبریشن لیگ کو اس بات پر فخر حاصل ہے کہ اس نے آزاد کشمیر اور کشمیری عوام میں یک جہتی اور نظریاتی وحدت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری کے لئے بھرپور سعی کی۔ لبریشن لیگ نے آزاد کشمیر کی سیاست میں استقامت اور استقلال پیدا کیا۔ تحریکِ آزادی کے صحیح مطالب کی نشاندہی کی اور تحریک کو صحیح ڈگر پر ڈالا۔ ہماری اس تجویز نے دوست، دشمن، ہمدرد اور مخالف سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور سیاسی شعور کی بیداری اور مسائل کی اصل اساس سے آگاہی کا شعور پیدا کیا۔ ہم پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کی گئیں اور مختلف خطابات سے نوازا گیا۔ مگر حقائق، منطق اور سیاسی قوت کی جو نشاندہی لبریشن لیگ نے کی تھی، اس نے تمام سیاسی جماعتوں کو بالآخر یہ تجویز ماننے پر مجبور کر دیا اور ہمیں اس بات کی انتہائی خوشی ہے اور یہ تاریخ میں ایک اہم باب کے طور پر رقم کیا جائے گا جب اگست 1968ء میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس، آزاد جموں و کشمیر مسلم کانفرنس اور لبریشن لیگ نے اس چار نکاتی پروگرام کو اپنایا جس میں یہ شق شامل تھی کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق حل نہیں ہوتا، اس وقت تک آزاد حکومت کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو کہ ریاست کی آزاد اور خودمختار ہری سنگھ کی جانشین حکومت کے ساتھ ہونا چاہئے اور اس طرح لبریشن لیگ پر علیحدگی پسندی اور پاکستان دشمنی کا الزام لگانے والوں نے خود بھی یہی الزام قبول کر لیا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان جماعتوں کے قائدین کے پاس کوئی اور پروگرام نہیں تھا۔ تحریکِ آزادی کے بارے میں وہ خالی الذہن تھے۔ ان کے پاس کوئی متبادل تجویز نہیں تھی۔ اگر ایسی کوئی تجویز ہوتی تو وہ گفت وشنید کے درمیان سامنے آتی مگر یوں

نہیں تھا۔ ان کا سیاسی کھوکھلا پن ظاہر تھا اور وہ اس نظریے کی مضبوطی' اس کی ٹھوس سیاسی' قانونی' بین الاقوامی اساس اور نفسیاتی قوت کو ماننے پر مجبور تھے۔ انہوں نے جب اس معاہدے پر دستخط کیے تو لبریشن لیگ کے قیام کی اہمیت' ضرورت اور اس کے نقطۂ نظر کے درست ہونے کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔

کوئی اور پروگرام

اس کے بعد ریاست میں اور نئی جماعتیں بھی معرضِ وجود میں آئیں مگر ان میں سے کسی نے اس نظریے کی مخالفت نہیں کی بلکہ اکثر و بیشتر نے اس کی افادیت کو تسلیم کیا۔ میرا یہ یقین ہے کہ اگر ہم آزادی کے مطالبے سے دست بردار ہوئے تو یہ کشمیری قوم کی موت ثابت ہو گا اور ہم لوگ صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ تحریکِ پاکستان کے نقطۂ نظر سے کشمیر کی آزادی کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس کو نظر انداز کرنے سے پورے پاکستان کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ پاکستان ہمیشہ بھارت کے دباؤ کے نیچے اور امریکہ کا دست نگر رہے گا اور پاکستان میں جمہوریت کے فروغ میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔

لبریشن لیگ کشمیری اور پاکستانی عوام کو یہ دعوتِ فکر دیتی ہے کہ نظریۂ پاکستان کے فروغ اور کشمیر کے حقِ خود اختیاری کے لئے اس تجویز پر تعصب' خوف اور تذبذب سے ہٹ کر غور کرے اور اگر انہیں یہ تجویز قبول نہیں تو ان کے نزدیک اگر اس مسئلہ کے حل اور اہلِ کشمیر کی تحریکِ آزادی کی تکمیل اور نظریۂ پاکستان کو اس کے منطقی معراج تک پہنچانے کے لئے کوئی متبادل تجویز یا فارمولا ہے تو اسے پیش کیا جائے تاکہ اس پر بھی غور کیا جائے۔

لبریشن لیگ بارہا یہ اعلان کر چکی ہے کہ ہم اپنی منزل یعنی حقِ خود ارادیت اور مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے نصب العین سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ راستے بدلے جا سکتے ہیں' منزل کا تعین کیا جا چکا ہے۔ میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ آج تک کوئی متبادل تجویز جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو' کسی بھی طرف سے ہمارے سامنے یا

ریاستی عوام کے سامنے نہیں آئی۔

آج کشمیر کا نوجوان مضطرب' بے چین اور مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے وسوسوں میں گرفتار ہے۔ اس کے اندر ایک عدم استحکام اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک باعزت اور ایک محفوظ مستقبل کا متلاشی ہے اور یہ اس کا حق ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ دعوتِ فکر' دعوتِ عمل اور دعوتِ اتحاد دیں۔

متبادل ذرائع

میں نے فی الحال عمداً ان متبادل ذرائع کا ذکر نہیں کیا جو کہ وقتاً فوقتاً لبریشن لیگ کے زیرِ غور رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس مطالبے کو دہراتے رہیں اور دوسرے اسے نظر انداز کرتے رہیں اور ہم خاموش ہو جائیں۔ آزادی ایک نعمتِ بے بہا ہے۔ وہ ایک بڑی قیمت مانگتی ہے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مستقبل قریب میں تحریکِ آزادی کے سلسلے میں ہماری تجویز کو قبول نہ کیا گیا تو ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ ہم کسی نئی راہ کی تلاش کے لئے سعی کریں۔ نوجوان اور جوشیلے عناصر مختلف تجاویز مجھ تک پہنچاتے رہتے ہیں مگر ہم نے سیاسی اور قانونی طریقۂ کار کو ہی ترجیح دی ہے۔ لیکن ایسا بھی وقت آتا ہے جبکہ انسان قانون اور آئینی طریقوں کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بھارت کی یہ کوشش ہے کہ وہ مقبوضہ علاقے کو بزورِ شمشیر دبا کر رکھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیز آبادی میں توازن کی تبدیلی کے بعد وہ بزعمِ خود اس جذبہ حریت کو دبانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پاکستان کی حکومتیں اپنی حریت' سلامتی اور تحفظ اس میں سمجھتی ہیں کہ آہستہ آہستہ اس مسئلہ کو دبا دیا جائے یا کشمیری عوام میں پاکستان کے ساتھ جو عقیدت ہے' اس کو ابھار کر تحریکِ آزادی کو ٹھنڈا کیا جائے اور اس سلسلہ میں بعض لیڈروں کو اپنی پاکٹ میں رکھا جائے مگر یہ دونوں حکومتیں سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کچھ وقت اس طرح ضرور گزارا جا سکتا ہے مگر جذبۂ حریت کو کچلا نہیں جا سکتا۔ وقت ان کا نہیں

بلکہ کشمیری عوام ان کی آزادی اور ان کی سالمیت کا ساتھ دے گا۔

سمجھ نہیں آتا کہ جو اقتدار اعلیٰ عوام کو منتقل ہوا تھا' 24 اکتوبر 1947ء کو وہ کیسے وزارتِ امورِ کشمیر کے پاس چلا گیا۔ اس کی وضاحت سردار محمد ابراہیم خان ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن میں جب صدرِ حکومت تھا تو میں نے پاکستان کی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ آزاد کشمیر حکومت کو تسلیم کیا جائے۔ اس سے پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ ہر لحاظ سے پاکستان کا فائدہ ہے۔ میں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا ہے اور اس وقت پاکستان کی حمایت کی ہے جب پاکستان کی حمایت کرنا جرم تھا۔ آج حیرت کا مقام ہے کہ کشمیریوں کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سلامتی کونسل میں پاکستان کے نمائندے پرنس علی خان نے کہا تھا کہ اگر کشمیری خودمختار بھی رہنا چاہیں تو ہم ان کی مخالفت نہیں کریں گے۔ پاکستان کے اس نمائندے کی تقریر کے بعد حکومتِ پاکستان نے قطعاً اس کی تردید نہیں کی لیکن جب میں کہتا ہوں کہ حکومتِ پاکستان اور دوسری حکومتیں ہماری حکومت کو تسلیم کریں تو پاکستان کے افسروں کی جبینوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں یورپ کی کئی حکومتیں لندن کے ہوٹلوں میں قائم رہیں لیکن وہ تسلیم شدہ تھیں۔ باقاعدگی سے کام کرتی تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ حکومتِ آزاد کشمیر و جموں کو تسلیم کرانے میں حکومتِ پاکستان کو کیا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ جب شیخ عبداللہ مظفر آباد آئے تھے تو دو میل کے فاصلے پر مظاہرہ کرنے والے خودمختار کشمیر کے حامی تھے جو نوازے گئے۔ اب بھی حکومتِ پاکستان ایسے لوگوں کو روٹ پرمٹ اور لائسنس دیتی ہے جو خودمختار کشمیر کے حامی ہیں۔

تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور اس کے تقاضے

میں نے بار بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ایک پیچیدہ اور ہمہ گیر مسئلہ بن چکا ہے۔ اس کی بنیاد آزادی اور حقِ خود ارادیت پر ہے۔ ہم کسی ایسے حل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جو کہ حقِ خود ارادیت کے منافی یا متصادم ہو۔ یہ پہلا بنیادی

اصول ہے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کے قانونی، بین الاقوامی، ڈپلومیٹک، عسکری اور پروپیگنڈہ کے پہلو ہیں۔ جب تک ایک ایسا پروگرام وضع نہ کیا جائے جو حق خود ارادیت کے بنیادی اصولوں کے دائرے میں رہ کر ان تمام دیگر پہلوؤں سے اس مسئلہ کو حل کرسکتا ہو تب تک صحیح معنوں میں کشمیر کی آزادی کی طرف کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی پہلو یا بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور پروپیگنڈہ کا موثر جواب کیا ہوسکتا ہے۔

ایک تو حکومتِ پاکستان اپنی جگہ اپنے حلقۂ اثر اور بساط کے مطابق ہندوستان کی چالوں کے تدارک کی کوشش میں مصروف رہتی ہے لیکن کشمیریوں کی طرف سے بین الاقوامی سطح پر اس کے تدارک کا کوئی بندوبست نہیں۔ بظاہر اس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ پاکستان کی طرف سے ہندوستان کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے یا کشمیریوں کی طرف سے لیکن اس کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کشمیریوں کی طرف سے کسی آواز کے نہ اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کشمیر کے مسئلے کو اب آزادی یا حق خود ارادیت کا مسئلہ نہیں سمجھتی بلکہ دنیا کی نظروں میں یہ مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک چھوٹے سے سرحدی تنازعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اول تو بڑی طاقتیں اب اس مسئلہ کا ذکر ہی نہیں کرتیں یا اگر کبھی اتفاقاً کر بھی لیں تو عموماً ان کا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کو دو اچھے ہمسایوں کی طرح اس مسئلے کو آپس میں بیٹھ کر سلجھانا چاہیے۔

لبریشن لیگ یہ سمجھتی ہے اور ذاتی طور پر میری رائے بھی یہ ہے کہ اگر ہم حق خود ارادیت کی بنیاد کو چھوڑ دیں تو ہم کیسے عالمی رائے عامہ کو اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ عالمی رائے عامہ کو ایک محکوم اور سامراج کی شکار قوم سے ہمدردی ہوسکتی ہے لیکن اسے دو آزاد حکومتوں کے سرحدی تنازعہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔

چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آزادئ کشمیر کی خاطر کوئی قدم اٹھانے سے قبل بین الاقوامی

طور پر ہم اس پوزیشن میں ہوں کہ ہم یہ قدم اٹھا سکیں ورنہ پاکستان کی ہمدردی اور کوشش یا دو ایک اسلامی مما لک کی ہمدردی یا کسی اور ملک کی تائید مدعی سست، گواہ چست' سے زیادہ کی حیثیت نہیں رہتی اور یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر کشمیر کا مسئلہ دن بدن اپنی اصلیت تیزی سے کھوتا جا رہا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر کشمیر کے نام سے کوئی مسئلہ ہی نہیں ۔اس لیے ہمارے نزدیک اس کو بین الاقوامی سطح پر اٹھانا لازمی ہے۔

دوسرا پہلو آئینی اور قانونی ہے اور اس ضمن میں بنیادی بات یہ ہے کہ اگر آئینی طور پر کشمیر کا وجود باقی نہیں سمجھا جاتا تو حق خود ارادیت ہی ایک خودی کا تقاضہ کرتا ہے اور خودی سے مراد ایک علیحدہ وجود کی حیثیت ہے اور ایک علیحدہ وجود کا ہونا خود ارادیت کے لیے ضروری ہے۔ہندوستان نے اسی لیے ہری سنگھ کے مصنوعی اور غیر قانونی الحاق کے بعد کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دینے کی جو تحریک چلا رکھی ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیا کو باور کرایا جائے کہ کشمیر کا علیحدہ آئینی وجود نہیں ہے اور اس کے بعد دوسرے مرحلے پر وہ دنیا سے کہتے ہیں کہ جب علیحدہ وجود نہیں تو پھر رائے شماری کی ضرورت نہیں اور آپ اتفاق کریں گے کہ آج بھارتی پروپیگنڈہ بین الاقوامی سطح پر پاکستانی پروپیگنڈہ سے زیادہ ہے۔

ہمارے نزدیک اگر کشمیر کی موجودہ متنازعہ حیثیت کو قائم نہ رکھا گیا اور اس کی کوئی علیحدہ آئینی حکومت نہ بنائی گئی تو اس سے ہندوستان کا موقف مضبوط ہوتا چلا جائے گا اور آئینی لحاظ سے ہمارا موقف کمزور ہوتا چلا جائے گا' لہٰذا ریاست میں بھی ایک آزاد آئینی حکومت کا وجود اگر تسلیم نہ کیا جائے تو آئینی طور پر ہم لوگ کافی پیچیدگیوں میں مبتلا ہوں گے۔عموماً میری اس دلیل کے جواب میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک قانونی بات ہے اور فی الحقیقت اس سے ہماری تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑے گا حالانکہ ایسا سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔ یہ درست ہے کہ مسئلہ کو حل کرتے وقت ہم کو قوت کا بھی استعمال کرنا پڑے گا لیکن تمام لڑائیاں تمام جنگیں اور تمام آزادی کی تحریکیں جب اختتام پذیر ہوئیں تو

بالآخر یہ مسئلہ میز پر ہی حل ہوتا ہے اور اس وقت جس فریق کا آئینی status نہ ہوتو جہاں ایک طرف عوامی مسائل حل نہیں ہوں گے، وہاں انتظامیہ درست نہیں رہ سکتی، وہاں قومی افتخار، قومی عزت، قومی غیرت، قومی امنگوں اور آرزوؤں کا مظہر بھی کوئی نہیں رہتا۔ اس لیے جموں وکشمیر کی آبادی کے اس عنصر کے لیے جو کہ حدِ متارکہ کے مغرب کی طرف ہے' آزاد کشمیر اور پاکستان میں ایک مرکز، ایک محور، ایک قلعہ کا ہونا ضروری ہے لیکن اگر حکومت کی کوئی آئینی اور مسلّم پوزیشن نہ ہوتو یہ عزم اور افتخار کے نشان کی جگہ ذلت اور گراوٹ کی علامت بن سکتی ہے۔ نفسیاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ایک قوم کی آزادئ جدوجہد کے لیے ایسے محرکات کا ہونا ضروری ہے جو کہ قوم کے لیے عزت اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتے رہیں اور اس کے لیے کشش کا باعث ہوسکیں۔ آئینی حکومت کی ضرورت اس لیے ہمارے نزدیک تحریکِ آزادئ کشمیر کا ایک بہت بڑا اقتضا ہے۔

تیسرا پہلو اس مسئلہ کا عسکری ہے۔ ہندوستان کی فوجی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ ہمیں ہر طرح سے کیل کانٹے سے لیس ہونا چاہیے اور عوام کے اندر جذبۂ آزادی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ایک باقاعدہ عسکری قوت تیار ہو۔ فرض کیجئے خدانخواستہ ہمارے پاس آزاد کشمیر کا ایک ٹکڑا نہ ہوتا تو پھر ہم کیا کرتے؟

کیا ہم ہندوستان کے قبضے کو تسلیم کر لیتے یا ہم اپنی آزادی کی تحریک جاری رکھتے اور کس رنگ میں رکھتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ضرور کم ازکم لبریشن لیگ کی طرف سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ایک آزاد حکومت تشکیل کرتے اور یہ عارضی حکومت ریاست کی آزادی کے لیے وہ تمام اقدامات کرتی جو ایک حکومت کو کرنے چاہئیں۔ یعنی سیاسی، آئینی، عسکری اور مالی۔ بالفاظ دیگر ہر لحاظ سے تحریکِ آزادی کو چلانے کی کوشش کی جاتی۔ اب چونکہ خوش قسمتی کے ساتھ ہمارے پاس آزاد علاقہ ہے اور اپنی ایک فوج بھی ہے' اس لیے ہمارے لیے عسکری پہلو کی نگہداشت کے لیے کافی آسانیاں ہیں کیونکہ اگر ہمارے پاس کوئی علاقہ نہ ہوتا

اور والنٹیر فوج کی بھرتی بھی کر لیتے تو اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی اور اس کا وہی حشر ہوتا جو یا سر عرفات کے رضا کاروں کا ہو رہا ہے۔ بصورت دیگر ہم لوگ سوائے مقبوضہ علاقے میں گوریلا کارروائی کے اور کچھ نہ کرتے اور میرے اندازے کے مطابق ہندوستان جیسی بڑی طاقت کو مقبوضہ علاقے میں صرف وہیں کے مسائل سے گوریلا جنگ کے ذریعے شکست نہیں دی جا سکتی۔ مجھے تو دکھ اس بات کا ہے کہ آزاد علاقہ اور اپنی فوج ہونے کے باوجود ہم لوگ جس برتر پوزیشن میں ہیں' اس کا فائدہ اٹھانے کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

عسکری طور پر ہندوستان کو تب ہی مجبور کیا جا سکتا ہے جبکہ ریاست کے اندر مجاہدین کی سرگرمیاں اس کے لیے وبالِ جان بن جائیں اور تب ایسا ہی ممکن ہے جب باہر سے متواتر ہتھیار اور ساز و سامان آ سکے اور آزاد کشمیر کی فوج بھی اپنا دباؤ جاری رکھ سکے۔ یہی وہ صورت ہے جس سے ہندوستان کو ریاست کے اندر لڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں اور بھی خطرات ہو سکتے ہیں لیکن بہر حال ہمیں جنگ آزادی کے سلسلے میں خطرات بھول کر لڑنے کے لیے تیار رہنا ہی پڑے گا اور اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر جنگِ آزادی کی بات ہی نہیں کرنا چاہیے۔

لبریشن لیگ شروع سے ہی چھوٹی چھوٹی عسکری تنظیموں کی مخالف ہے اور اس وجہ سے ہم نے 'البرق' 'الفتح' 'المجاہد' اور اس قسم کی تنظیموں کی حمایت نہیں کی ہے کیونکہ اگر آزاد حکومت کا عسکری نظام درست ہو اور آزاد حکومت صحیح معنوں میں نمائندہ حکومت ہو تو پھر اس قسم کی تنظیموں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی تنظیمیں مخلص بھی ہوں مگر اپنے محدود وسائل اور محدود ذرائع کی بنا پر فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہونے کا احتمال ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ ہماری قطعی رائے ہے کہ اگر آزاد حکومت کو پوری طرح سے آئینی اور با اختیار حکومت تسلیم نہ کر لیا جائے تو کوئی ٹھوس اور معنی خیز قدم تحریکِ آزادی کی طرف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لبریشن لیگ کی کوشش یہی ہے کہ

حکومتِ پاکستان اس حکومت کو پوری ریاست کی آئینی اور بااختیار حکومت تسلیم کرے۔ اس صورت میں ایسے اقدامات ہو سکتے ہیں جن سے یہ مسئلہ حق خودارادیت کی بنیاد پر حل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا لبریشن لیگ کے آئین میں تمام وسائل کو بروئے کار لانے کا جو ارادہ ظاہر کیا گیا ہے، اس میں پہلا قدم آزاد حکومت کو تسلیم کرنا ہے۔

کشمیر کی آزادی کے لیے ہمیں نفسیاتی، سفارتی اور عسکری محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ (نوائے وقت)

قانون ساز اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد کی حیثیت سے ایک بار خورشید صاحب نے پریس والوں کے سوالوں کے جواب اس طرح سے دیئے۔

سوال: آپ کی نظر میں کشمیری عوام کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے اور آپ اس کا کیا حل تجویز کرتے ہیں؟

جواب: ہمارا سب سے بڑا اور اولین مسئلہ مقبوضہ کشمیر کی آزادی ہے کیونکہ جب تک مقبوضہ کشمیر بھارتی تسلط سے آزاد ہو کر دونوں خطوں کے عوام ایک دوسرے سے نہیں ملتے، کشمیری عوام کا مستقبل اندھیروں میں گھرا رہتا ہے۔ چونکہ یہ معاملہ گزشتہ 40 سال سے اٹکا ہوا ہے' اس لیے آزاد کشمیر کے سارے معاملات عارضی بنیادوں پر چلائے جا رہے ہیں۔ یہ بات ہماری حقیقی ترقی اور اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن چونکہ ہم اس بات پر قادر نہیں کہ مقبوضہ کشمیر کو فی الفور آزاد کرائیں' اس لیے یہ عارضی اور فرضی حل ہمیں قبول کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت بھی واضح نہیں ہے جس کی وجہ سے مختلف ادوار میں یہاں نظام حکومت بھی بدلتے رہتے ہیں اور حکومت کی پوزیشن کبھی مضبوط اور کبھی کمزور ہوتی رہی ہے۔ ہمیں ابھی تک ریاست جموں وکشمیر کی

نمائندہ حکومت کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ میری مراد مہاراجہ ہری سنگھ کی وارث اور جانشین حکومت سے ہے۔ ہمارے پاس 32 ہزار مربع میل اور گلگت اور بلتستان کو ملا کر علاقہ موجود ہے مگر ہمیں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے برعکس تنظیم آزادیٔ فلسطین کو جس کے پاس نہ تو علاقہ ہے اور نہ ہی کوئی حکومت ہے، تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سے ہماری تحریک کمزور ہے اور پاکستان کی حکومتوں نے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

سوال: کیا آپ بھی تنظیم آزادی فلسطین کی طرح ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی حکمرانی کو تسلیم کرانے کے حق میں ہیں؟

جواب: ہم پاکستان سے علیحدگی کے حق میں نہیں لیکن ہماری حکومت کو زیادہ سے زیادہ با اختیار بنایا جائے۔ اسمبلی اور کشمیر کونسل میں توسیع کی جائے تا کہ ہم مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو بتا سکیں کہ وہ بھی ہماری جیسی آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آ ملیں۔ 12 اگست 1947ء کو جو معاہدہ آزاد کشمیر اور پاکستان کے درمیان ہوا اسے پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔

سوال: آپ کے خیال میں آزاد کشمیر میں کونسا نظامِ حکومت آپ کی تحریک اور جدوجہد کے لیے مفید ہے؟

جواب: یہاں ہر صورت میں پارلیمانی نظام ہونا چاہیے کیونکہ اسی صورت میں ہم تعمیر و ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ ہمارا معاملہ پاکستان یا دوسرے ممالک سے مختلف ہے۔ ہم ابھی تک حالتِ جنگ میں ہیں۔ یہاں عوام اور قیادت یا حکومت کے درمیان گہرے رابطے کی ضرورت ہے تا کہ جدوجہد اپنے مراحل طے کر سکے۔ یہ گہرا رابطہ صرف پارلیمانی نظام کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ میرا ایوب خان سے بھی ہمیشہ یہ جھگڑا رہا کہ آزاد کشمیر میں 'ون مین ون ووٹ' کی بنیاد پر

پارلیمانی نظام قائم ہونا چاہیے مگر وہ نہیں مانتے تھے۔

سوال: 40 سال گزرنے اور دونوں خطوں کے عوام کے درمیان رابطوں کے فقدان کے بعد بھی آپ کے خیال میں آزادی کا جذبہ توانا اور زندہ ہے۔

جواب: آزادی کا جذبہ دونوں خطوں میں موجود ہے بلکہ گذشتہ چالیس سال میں یہ مزید بڑھا ہے۔ اس وقت مقبوضہ کشمیر میں 12 ڈویژن بھارتی فوج موجود ہے۔ ہندو اور سکھ بھی ہیں۔ اس کے باوجود آزادی کا جذبہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کشمیریوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔

سوال: کس طرح کشمیری عوام کے اس جذبے کو مزید توانا کیا جا سکتا ہے اور کشمیر کی آزادی کا ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جواب: ہمیں سیاسی، نفسیاتی، سفارتی، مالی اور عسکری محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ کشمیر کی قیادت کو یہ آزادی حاصل ہونا چاہیے کہ وہ پاکستان میں اور اس سے باہر عالمی رائے عامہ کو ہموار کریں اور انہیں مسئلہ کشمیر کے نتائج اور عواقب سے آگاہ کریں۔ نفسیاتی محاذ پر کشمیری عوام بالخصوص مقبوضہ کشمیر کے عوام کو یہ یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ ان کا موقف برحق ہے اور آزاد اقوام ان کے حق رائے دہی کو تسلیم کرتی ہیں۔ اس سے وہاں آزادی کی تحریک مضبوط ہوگی۔ اس ضمن میں پاکستان کے دوست ممالک بالخصوص مسلم ممالک کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ فلسطین اور افغانستان کی طرح کشمیر کا مسئلہ بھی عالم اسلام کا مسئلہ ہے اور اسے بھی وہی اہمیت دیں اور بھارت کو مجبور کریں کہ وہ اس کے حل پر آمادہ ہو۔ عالمی برادری کو بھی اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ سفارتی سطح پر ان کوششوں کے حوالے سے پاکستان نے جو جو ذمہ داریاں قبول کی تھیں، وہ بھی اسے نبھانا چاہئیں اور سفارتی محاذ پر ایک پروپیگنڈہ مہم میں ہماری مدد کرنی چاہیے تاکہ ہم اپنا

حق حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ کشمیر کی حکومت اتنے وسائل نہیں رکھتی کہ وہ اس مسئلے کو ایک بین الاقوامی مسئلہ کے طور پر متعارف کرا سکے۔ اس لیے مالی لحاظ سے جب تک اس تحریک کو مضبوط نہیں کیا جاتا یہ سرد خانے کی نظر رہے گی۔ ہمیں بھارت کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی عسکری تیاریاں بھی جاری رکھنی چاہئیں مگر یہ بعد کا مرحلہ ہے۔ اس وقت تو ضرورت اس امر کی ہے کہ مندرجہ بالا محاذوں پر سرگرمی اور ٹھوس منصوبہ بندی کے ساتھ کام شروع کیا جائے تاکہ بین الاقوامی محاذ پر مسئلہ کشمیر کی بازگشت سنائی دے۔ اس کے برعکس ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم نہ تو خود اس مسئلے کو اٹھاتے ہیں اور نہ دوسروں کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر اظہار خیال کریں۔ جب کبھی سربراہی کسی کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ اس غیر سنجیدگی کے ساتھ کہ گویا ہم بھارت کی خوشنودی کو اولیت دیتے ہیں۔

سوال: وزارتِ امورِ کشمیر کا اس سلسلے میں کیا کردار ہے؟

جواب: یہ وزارت محض کشمیری لیڈروں کو قابو میں رکھنے کا کام کرتی ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک انقلابی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بیوروکریسی پر انحصار کیا جا رہا ہے۔ اگر حکومتِ پاکستان اس سلسلے میں سنجیدہ ہو تو وزارت امورِ کشمیر کو وزارت خارجہ کا ایک حصہ بنایا جائے۔ مسئلہ کشمیر کوئی داخلی انتظامی مسئلہ نہیں۔ اس میں دو ممالک ملوث ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ایجنڈا پر یہ مسئلہ موجود رہا ہے۔ اس سے نپٹنے کے لیے وزارتِ خارجہ کی سطح پر اقدامات ہونے چاہئیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ کشمیر کے عوام کو وزارتِ امورِ کشمیر سے سب سے زیادہ شکایات ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں آزاد کشمیر کی حکومت کو خود مختار تسلیم کیا جائے اور اسے مضبوط بنایا جائے لیکن حکومتِ پاکستان اگر اس کو تسلیم نہیں کرتی تو پھر اسے کیا اقدامات

کرنے چاہئیں۔

جواب: اگر خودمختار حکومت کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع ہے تو پھر حکومتِ پاکستان کو چاہیے کہ وہ ہمیں برطانیہ، نیویارک، مڈل ایسٹ، فار ایسٹ اور چین میں 5 کشمیر مراکز کھولنے کی اجازت دے تاکہ ہم وہاں اپنے موقف کے حق میں پراپیگنڈہ کر سکیں۔ اعلیٰ سطح پر ایک امورِ کشمیر سیل بنایا جائے جس میں فوج، انٹیلی جنس، وزارتِ خارجہ، حکومتِ آزاد کشمیر، گلگت بلتستان، وزارتِ اطلاعات و نشریات کی موثر نمائندگی ہونی چاہیے۔ یہ سیل ایسے اقدامات تجویز کرے جن سے تحریکِ آزادی کشمیر کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکے۔ ریڈیو آزاد کشمیر بالکل غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے جبکہ سری نگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن انتہائی طاقتور ہیں۔ ریڈیو آزاد کشمیر کو طاقتور بنایا جائے اور اس پر انقلابی پروگرام نشر کرنے کا اہتمام ہو۔ ٹیلی ویژن کی نشریات بھی شروع کی جائیں۔ جو بھی پاکستانی وفد ملک سے باہر جائیں ان میں لازمی طور پر کشمیر کا صدر یا وزیرِ اعظم یا کوئی اور نمائندہ شریک ہو۔ باہر سے آنے والے وفود کو آزاد کشمیر کا دورہ بھی کرایا جائے تاکہ یہاں کی سیاست، قیادت انہیں اپنے موقف سے آگاہ کر سکے۔ یہ کم از کم اقدامات ہیں جن کے ذریعے ہم اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں مگر ہماری حکومت اس طرف توجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔

سوال: 40 سال کے بعد بھی آپ سمجھتے ہیں کہ کشمیر کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے؟

جواب: ماضی میں بھی ایسے مواقع آتے رہے ہیں جب حکومتِ پاکستان جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کی آزادی کی راہ ہموار کر سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ جب 1962ء میں نیفا کے مقام پر بھارتی فوج بری طرح پھنس چکی تھی

اُس وقت کشمیر کی سرحد پر حملہ کرنے کا مناسب وقت تھا لیکن ایوب خان نے میری بات نہیں مانی۔

جنگ آزادی اور نوکرشاہی

اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں ایک علاقہ ایسا بھی ہے جس کے عوام 1949ء سے لے کر آج تک جمہوری روح سے محروم ہیں تو شاید آپ اس پر یقین نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ گلگت اور بلتستان کے عوام آج بھی جمہوریت کے لیے ترس رہے ہیں اور ان کے لیے ایک ایسا نظام رائج کیا گیا ہے جس کی کوئی توجیہہ کم از کم آزادئ خیال کے اس دور میں ممکن نہیں۔ ایڈوائزری کونسل کے انتخابات کی خبریں سننے میں آرہی ہیں لیکن یہ کونسل اور انتخابات کسی طرح بھی جمہوری نظام کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

گلگت اور بلتستان کی جغرافیائی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پاکستان کے عوام اس علاقے کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ یہ خطہ جو سطح مرتفع پامیر تک پہنچتا ہے، اور جس کو جغرافیہ والوں نے بامِ ایشیا کا نام دیا ہے، پرانے زمانے میں منگولوں، تاتاریوں اور مغلوں کی آماجگاہ تھی اور آج کل اس کے شمالی حصے میں ایک طرف چینی کیمونزم اور دوسری طرف روسی کیمونزم کی نظریاتی سلطنتیں موجود ہیں۔ ابھی گذشتہ برس شاہراہ ریشم کا افتتاح ہوا ہے جس کا مقصد پرانے پیدل راستے کی جگہ ایک نئی سڑک کے ذریعے پاکستان اور چین کو ملانا تھا۔ اس سے قبل ایوب خان کے دور میں ایک مرتبہ پی آئی اے کے ذریعے پنڈی کا شغر پیکنگ ہوائی سروس قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

گلگت اور بلتستان کا علاقہ تقسیم سے پہلے ریاست جموں و کشمیر کا حصہ تھا اور 1948ء میں کشمیر میں جنگ بندی کے بعد سیز فائر لائن کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس میں گلگت ایجنسی جس میں پونیال کوہ گزا، یاسین، اشکون اور چیلاس کے علاقے اور ہنزہ اور نگر کی ریاستیں اور پونچی اور استور کا علاقہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کشمیر کے ضلع

لداخ کی تحصیل اسکردو اور تحصیل کرگل کا بیشتر علاقہ جو کہ حد بندی لائن کے شمال میں واقع ہے سارے کا سارا اس ذیل میں آتا ہے۔ گویا کہ تقسیم سے قبل ریاست جموں وکشمیر میں پورا ضلع گلگت اور ضلع لداخ شامل تھے۔

گلگت اور بلتستان کا کل رقبہ 24000 مربع میل ہے۔ حکومتِ آزاد کشمیر کے عمل دخل میں جو علاقہ آج کل ہے اس میں صرف تین اضلاع میر پور، مظفر آباد اور پونچھ آتے ہیں اور ان میں سے بھی ہر ایک ضلع کا کچھ نہ کچھ حصہ مقبوضہ کشمیر میں رہ گیا ہے۔ حکومتِ آزاد کشمیر کے زیرِ نگرانی علاقے کا کل رقبہ 4294 مربع میل ہے۔ گلگت اور بلتستان برائے ریاست ایک ریذیڈنٹ کے تحت ہیں جسے حکومتِ پاکستان کی حمایت حاصل ہے۔ جہاں تک آزاد کشمیر کی آبادی کا تعلق ہے، یہاں اندازاً 12 لاکھ نفوس آباد ہیں جبکہ گلگت اور بلتستان رقبے میں حکومتِ آزاد کشمیر کے زیرِ حکومت علاقے سے پانچ گنا زیادہ ہونے کے باوجود یہاں کی آبادی اندازاً 4 لاکھ سے زیادہ نہیں۔ کل ریاست جموں وکشمیر کا رقبہ جس میں بھارتی مقبوضہ کشمیر بھی شامل ہے، 84471 مربع میل کے قریب ہے۔ گویا حکومتِ آزاد کشمیر کے صدر کا علاقہ اس کا تقریباً سولہواں حصہ ہے اور اگر گلگت اور بلتستان کو بھی آزاد کشمیر کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ہمارے پاس رقبہ میں زیادہ حصہ آجاتا ہے۔

جب پاکستان میں ضروریاتِ زندگی بہت ارزاں تھیں

گلگت اور بلتستان کے علاقے کو میں بدقسمت کہتا ہوں کیونکہ ذرائع آمد و رفت کی کمی اور ناقص انتظامات کی وجہ سے یہاں عوام کو بے حد مشکلات درپیش ہیں۔ پاکستان کے عوام کو شاید اس امر کا یقین نہ ہو کہ یہاں نمک 2 روپیہ سیر، چینی 4 روپے سیر اور آٹا چالیس روپے من تک بھی فروخت ہوتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں یہ علاقہ پاکستان سے کٹ جاتا ہے اور صرف ہوائی سروس کے ذریعے ضروریاتِ زندگی یہاں پہنچائی جاتی ہیں۔ اگرچہ اب انڈس ویلی روڈ بننے سے کافی سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ گلگت اور بلتستان کا جو تعلق کشمیر کے

ساتھ ہے، اس کے پیش نظر اور بعض وجوہات کی بنا پر اس کے بارے میں زیادہ معلومات سامنے نہیں آئیں۔ تاہم ایک غور طلب امر یہ ہے کہ متنازعہ علاقہ ریاست جموں وکشمیر کا ایک حصہ ہونے کے باوجود آزاد حکومت کے ساتھ کیوں نہیں۔ اس وجہ سے سیاسی بیداری کی جو لہر کشمیر میں آئی اور جس کے نتیجے میں وہاں پہلی بار بالغ رائے دہی کے تحت انتخابات ہوئے' یہاں معدوم ہے۔ گلگت اور بلتستان میں کوئی اخبار نہیں چھپتا اور نہ وہاں کوئی پریس ہے۔ نہ وہاں کوئی سیاسی جماعت ہے اور نہ ہی سیاسی جماعت یا تنظیم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ حکومت کا ڈھانچہ ایک ریذیڈنٹ اور اس کے تحت کچھ پولیٹیکل ایجنٹوں پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر پولیٹیکل سروس کے لوگ ہیں۔ اپنے اپنے علاقے میں عدالتی اختیارات بھی رکھتے ہیں۔ سارے علاقے میں کوئی ہائی کورٹ نہیں ہے۔ چونکہ یہ علاقہ پاکستان میں شامل نہیں' اس لیے پاکستان کے کسی ہائی کورٹ مثلاً پشاور یا لاہور کا بھی یہاں عمل دخل نہیں ہے اور چونکہ یہ علاقہ آزاد کشمیر کے ساتھ بھی منسلک نہیں' اس لیے مظفر آباد کا ہائی کورٹ بھی بے اختیار ہے۔ بالفاظِ دیگر گلگت کا ریذیڈنٹ اور چند پولیٹیکل ایجنٹ یہاں کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں جن کی کوئی بازپرس نہیں اور نہ ہی وہ عوام کے سامنے جواب دہ ہیں۔ سیاسی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے عوام کی مشکلات پاکستانی اخباروں تک کم ہی پہنچتی ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ تمام افسر من مانی کارروائیاں کرتے ہیں اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ ڈویلپمنٹ اور ترقیاتی منصوبوں کے لیے سرمایہ فراہم بھی کیا گیا تو کاغذی کارروائیوں کے بعد ادھر ادھر ہضم کرلیا گیا۔ البتہ آزاد کشمیر، پنڈی اور کراچی کے کالجوں میں پڑھنے والے گلگت اور بلتستان کے کچھ طالب علم سیاسی بیداری سے متاثر ہو کر اپنے علاقے کے لیے سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں گلگت بلتستان لداخ رابطہ کمیٹی کراچی میں موجود ہے۔ اس کے اراکین امیر حمزہ اور شیر ولی صاحب تعلیم حاصل کرنے کے بعد گلگت واپس پہنچے تو بدقسمتی سے انہیں کسی جرم کے بغیر پولیٹیکل ایجنٹ کے حکم سے گرفتار کرلیا گیا اور اب تک وہ بغیر

مقدمہ چلائے نظر بند ہیں۔

یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گلگت و بلتستان کا موجودہ نظامِ حکومت کس طرح معرض وجود میں آیا؟

1947ء میں جب کشمیر میں تحریکِ آزادی نے سیاسی تحریک کا روپ چھوڑ کر براہِ راست جنگ کی شکل اختیار کی تو اس وقت گلگت و بلتستان کے عوام بھی ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف اٹھے۔ فوج کے مسلمان افسر اور سپاہیوں نے اس تحریک میں عوام کا ساتھ دیا۔ انہوں نے کرنل گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر کے پاکستان کا پرچم لہرا دیا اور اس طرح یہ علاقے بغیر کسی خاص کشت و خون کے ڈوگرہ تسلط سے آزاد ہو گئے۔ اس موقع پر مسلمان فوجی افسروں نے حکومتِ پاکستان سے رابطہ قائم کیا جس کی وجہ سے گلگت میں ریذیڈنٹ کے عہدے کو بحال کیا گیا۔ اس طرح سے ریاست جموں و کشمیر کے آزاد علاقے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک جو آزاد کشمیر کے نام سے موسوم ہے، دوسرا گلگت و بلتستان۔ ریذیڈنٹ حکومت پاکستان کی طرف سے انتظامیہ کا کام چلاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں بیوروکریسی نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اس عارضی بندوبست کو جسے آزاد کشمیر کے ساتھ ملحق ہو جانا چاہیے تھا، کسی صحیح نظام پر قائم نہیں ہونے دیا ورنہ اصولی طور پر کشمیر کے اس سارے علاقے میں جو مقبوضہ کشمیر سے الگ کیا گیا تھا، ایک نمائندہ جمہوری حکومت بنا چاہیے تھی جو ایک طرف ریاست کے باقی حصے کو آزاد کرانے کی ذمہ داریاں سنبھالتی اور دوسری طرف ڈوگرہ زمانے کے نظر انداز کیے ہوئے پسماندہ علاقے گلگت و بلتستان کے غریب عوام کی اقتصادی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتی مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اتنے برس گزرنے کے باوجود تحریکِ آزادیٔ کشمیر سیز فائر لائن کے اس طرف اتنی زیادہ جاندار اور مضبوط نہیں ہو سکی جتنی ہونا چاہیے تھی۔

یہ تو تھے عام حالات۔ اس ضمن میں میرا اپنا خیال ہے کہ پاکستان کے مستقبل کے لیے کشمیر کا تسلی بخش اور جمہوری رائے عامہ کے مطابق فیصلہ بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ جب تک یہ علاقہ متنازعہ ہے، کسی بھی بین الاقوامی تعطل کی صورت میں خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ کشمیر کے حل کی صورت اس وقت سلامتی کونسل کی دو قراردادیں ہیں جنہیں بھارت اور پاکستان کی حکومتیں تسلیم کرچکی ہیں جن میں واضح طور پر کشمیر کے لوگوں کے حق خودارادیت کی حمایت کی گئی ہے اور جن میں گلگت اور بلتستان کا علاقہ بھی شامل ہے لیکن جن پر بھارت کی ہٹ دھرمی اور بڑی طاقتوں کے اپنے مفادات کی خاطر عمل نہیں ہو رہا۔

اس لیے بنیادی طور پر سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ آزاد کشمیر، گلگت، بلتستان اور کشمیری مجاہدین کو جو پاکستان میں آباد ہیں، ایک سیاسی نظام سے مربوط کیا جائے اور تحریک آزادی کا ملک کے ان حصوں میں ایک مضبوط مرکز قائم کیا جائے۔ ریاستی معاشرے کے ان تینوں ٹکڑوں میں براہ راست تعلقات قائم ہوں تاکہ سب لوگ متحد ہو کر سوچ سکیں۔

گلگت اور بلتستان کو آزاد کشمیر سے الگ رکھ کر ذہنی طور پر ایسے محرکات پیدا ہی نہیں ہونے دیئے جاتے جن سے تحریکِ آزادی اور اہلِ کشمیر میں اعتماد کا جذبہ فروغ پا سکے اور اگر گلگت اور بلتستان کو باقی کشمیر سے الگ رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عمل درآمد کی صورت میں یہاں کے پانچ لاکھ باشندے حق رائے دہی سے بھی محروم ہو جائیں گے جن کا نقصان بہر کیف پاکستان کو ہوگا کیونکہ یہ باشندے لازماً بھارت کے خلاف ووٹ دیں گے۔ علاوہ ازیں آزاد کشمیر، گلگت اور بلتستان کو علیحدہ علیحدہ انتظامیہ کے تحت رکھنے سے دونوں علاقوں کے مابین رسل و رسائل اور آمد و رفت میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ بدقسمتی سے یہ مسئلہ بھی پاکستان کے اندرونی مسائل کے سبب بیوروکریسی کے تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوا۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ اس معاملے میں حکومتِ پاکستان کے اربابِ اختیار نے کبھی کشمیری لیڈروں یا جماعتوں سے یا

گلگت اوربلتستان کے نمائندوں سے تسلی بخش گفتگو نہیں کی۔ آج کل کے زمانے میں صرف یہ کہہ دینا کہ دفاعی ضرورت کے پیش نظر اس علاقے میں حالات معمول پر نہیں آسکتے، قابل قبول نہیں ہے جبکہ مغربی پاکستان کے بعض دیگر علاقے بھی ہندوستان اور افغانستان سے ملے ہوئے ہیں جن سے پاکستان کے تعلقات یاتو کشیدہ رہے ہیں یا کشیدہ رہ چکے ہیں اور دفاع کا معاملہ بھی کئی بار سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔

مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام نے سماجی اور اقتصادی نظام میں تبدیلی کی ضرورت کو جس شدت سے محسوس کیا ہے اور جس کا واضح ثبوت حالیہ انتخابات ہیں' اس تبدیلی کو روکنے میں گلگت اور بلتستان میں بیوروکریسی کے رجعت پسند عناصر کو حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ریاست نگر میں جو بغاوت ہوئی تھی وہ اس ذہنی تبدیلی کا ثبوت ہے جو وہاں کے عوام میں پیدا ہو چکی ہے اور پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعے ایک ریذیڈنٹ اب زیادہ دیر تک وہاں کے راجگان کو باہم لڑا کر حالات پر کنٹرول نہیں کرسکتا۔

بدقسمتی سے گلگت اوربلتستان کے لیے جمہوری نظام کے مطالبے کے جواب میں وہاں کی انتظامیہ کی طرف سے سوائے اس کے اور کوئی دلیل نہیں دی جاتی کہ انگریزوں کے زمانے میں وہاں کچھ عرصے کے لیے انگریز ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں چند تاریخی حقائق پاکستان کے عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ سے واقفیت نہ رکھنے یا محض سطحی معلومات رکھنے والے لوگ اس قسم کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ اصل واقعات کچھ اور ہیں۔ گلگت اور بلتستان کا علاقہ راجہ گلاب سنگھ کے زمانے سے ہی ریاست جموں و کشمیر کا مستقل حصہ رہا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جسے جدید کشمیر کی ابتدا کہنا چاہیے۔ اس سے قبل بھی اگرچہ ریاست جموں وکشمیر کی شکل یہ نہیں تھی پھر بھی ان علاقوں کا وادیٔ کشمیر اور

ریاست کے دوسرے حصوں سے قریبی تعلق رہا ہے۔

1935ء میں بعض سرحدی معاملات اور دفاعی اخراجات کے پیش نظر گلگت ایجنسی کا علاقہ 64 سال کے لیے حکومتِ ہند کو مہاراجہ کشمیر کی طرف سے پٹہ پر دے دیا گیا تھا اور اسی دور میں انگریز ریذیڈنٹ کا تقرر عمل میں آیا۔ ظاہر ہے کچھ عرصہ کے لیے پٹے پر دینے سے کوئی حکومت اپنے علاقے کی حاکمیت اعلیٰ سے دستبردار نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ 1947ء میں حکومتِ برطانیہ نے جب ہندوستان کی دیسی ریاستوں سے اپنے سارے معاہدے منسوخ کیے تو یہ پٹہ بھی منسوخ کر دیا گیا اور گلگت ایجنسی کا کنٹرول مہاراجہ کشمیر کو واپس کر دیا گیا۔ انگریز ریذیڈنٹ واپس چلا گیا اور اس کی جگہ سری نگر سے ریاستی حکومت کے مقرر کردہ گورنر گھنسارا سنگھ نے لے لی۔ ایک سامراجی طاقت کے نزدیک جیسی کہ سلطنت برطانیہ تھی' دفاعی اخراجات کے تقاضے کچھ اور تھے اور پاکستان جیسی ایک عوامی اور اسلامی جمہوریہ کے نزدیک دفاعی تقاضے کچھ اور۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریذیڈنٹ کا تقرر حکومتِ پاکستان کی جانب سے حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ صرف بین الاقوامی سرحدوں اور دفاعی ضروریات کا خیال رکھتے تو ہم کشمیری جنہوں نے پاکستان کی حفاظت کے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں پاکستان کو کسی مشکل میں گرفتار نہیں دیکھنا چاہتے۔ ریذیڈنٹ کا تقرر اگر دفاعی امور کے لیے ضروری ہو تو ہمارے سر آنکھوں پر لیکن باقی معاملات مثلاً سول نظم و نسق، تعلیم، صحت، پولیس، صحت عامہ، تعمیرات، زراعت، صنعت، امداد باہمی وغیرہ عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں ہوں۔ حکومتِ پاکستان گلگت اور چین کی سرحدات کے متعلق یا گلگت کے شمالی علاقے کے دفاع کے لیے اگر اپنا ریذیڈنٹ وہاں رکھنا چاہتی ہے تو کسی بھی کشمیری جماعت کے دھڑے کا اعتراض نہ ہوگا۔ ہمارا مقصد پاکستان کے لیے مسائل پیدا کرنا نہیں لیکن اگر اس عذر سے گلگت اور بلتستان کے عوام کو آزاد کشمیر میں رہنے والے دیگر کشمیری عوام سے الگ رکھا جائے تو یہ کسی شکل میں

ناقابل قبول نہیں ہے۔ بیوروکریسی کے غلط فیصلوں سے مسئلہ کشمیر کو پہلے بھی خاصے نقصان پہنچے ہیں۔ اگر گلگت اوربلتستان کی پوزیشن یہی رہی تو اس مسئلے کو مزید نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔ ویسے بھی پاکستانی عوام سے یہ ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا انہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ مقبوضہ کشمیر سے جو علاقہ 1947ء کے بعد کشمیری مجاہدین یا مسلمان فوجی افسروں نے حاصل کیا تھا' اس کے صرف پانچویں حصے پر آزاد کشمیر کا صدر حکومت کرتا ہے۔ باقی چار حصے ریذیڈنٹ اور پولیٹیکل ایجنٹ کے تحت ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ کیسے الجھا؟

1947ء سے اب تک اس مسئلہ کو کن لوگوں نے سلجھانے کی کوشش کی اور وہ کہاں تک کامیاب رہے؟ کن لوگوں نے اسے مزید الجھایا؟ کون لوگ مستقبل کے مؤرخ کی نظر میں سزا کے مستحق ہوں گے۔ 1971ء میں پاکستان اور بھارت کی جنگ کے بعد اس مسئلے کو کیسے حل کرنا ہوگا؟

ان سوالوں کا جواب دینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیکھ لیا جائے کہ مسئلہ کشمیر ہے کیا؟ یہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ مختلف لوگ اپنے طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اظہار خیال کرتے رہے اور آج بھی کرتے ہیں۔ عوام کے سامنے خواہ وہ پاکستان کے ہوں یا خود کشمیر کے' مسئلے کی اصل شکل یا روپ کے بارے میں 24 سال کی جذباتی سیاست نے اس قدر پردے ڈال دیئے ہیں کہ مسئلہ اصل شکل میں ان کے سامنے آنے نہیں دیا گیا۔ آیئے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے ان حقائق کا کھوج لگائیں جن سے آنکھیں چرائی تو جاسکتی ہیں لیکن انہیں رد نہیں کیا جاسکتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے:۔

مسئلہ کشمیر کے اوجھل پہلو

ریاست جموں وکشمیر سے مراد جموں وکشمیر کی وہ سالم ریاست ہے جس پر مہاراجہ ہری سنگھ 14 اگست 1947ء کو حکمران تھا اور اس کی آئینی حکمرانی مسلمہ تھی۔ اس وقت جو

علاقے اس ریاست میں شامل تھے۔ آج 3 حصوں میں تقسیم ہو چکے ہیں:۔

1- وہ علاقہ جس پر ہندوستان کا قبضہ ہے، اس میں جموں و سری نگر سمیت وادیٔ کشمیر کے بیشتر حصے شامل ہیں۔

2- وہ علاقہ جس پر آزاد کشمیر کی حکومت قائم کی گئی ہے، اس میں ضلع پونچھ، مظفر آباد اور میر پور شامل ہیں۔

3- وہ علاقہ جسے شمالی علاقے کہا جاتا ہے، اس میں گلگت اور بلتستان کے دو اضلاع اور بعض ایجنسی کے علاقے شامل ہیں۔ یہ علاقے براہ راست حکومتِ پاکستان کے کنٹرول میں ہیں اور یہاں پولیٹیکل ایجنٹ اور ریذیڈنٹ حکومت کرتے ہیں۔

ریاست کا کل رقبہ 84471 مربع میل کے لگ بھگ ہے۔ حکومتِ آزاد کشمیر کا رقبہ 4600 مربع میل اور گلگت اور بلتستان کا رقبہ 24000 مربع میل ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان تینوں حصوں کو پھر سے ایک اور متحد کیا جائے اور اس کے بعد تینوں حصوں کے لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں آزادی کے ساتھ کوئی فیصلہ کر سکیں۔ یہاں پر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک غلط فہمی جو پاکستانی عوام کے ذہنوں میں پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی وہ یہ تھی کہ تقسیمِ ہند کے فیصلے کے مطابق ریاست جموں و کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔ حالانکہ یہ تاثر بالکل غلط ہے اور اس کی ذمہ داری بعض پاکستانی لیڈروں اور آزاد کشمیر کے بعض رہنماؤں مثلاً سردار قیوم اور ان کے سیاسی پیش روؤں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ لوگ تاریخ سے ہٹ کر ایسے بیانات دیتے رہتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب یا تو ہند کی تقسیم کے اصولوں سے ناواقف ہیں یا پاکستانی عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ موٹی سی بات یہ ہے کہ اگر تقسیم کے اصولوں کے مطابق ریاست جموں و کشمیر پاکستان کا حصہ بن گئی تھی تو مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ حقیقت یہ ہے کہ ہند کی تقسیم کے جو اصول وضع کیے گئے اور جنہیں نہ صرف برطانوی

حکومت نے تسلیم کیا بلکہ کانگرس اور مسلم لیگ نے بھی ان پر اتفاق رائے کا اظہار کیا' ہندو مسلم اکثریت کی بنیادوں پر تقسیم سے دیسی ریاستیں مستثنیٰ رکھی گئی تھیں اور ریاستوں کے والیان کو آئینی طور پر مستقبل کے بارے میں اپنا لائحہ عمل اختیار کرنے کا مجاز قرار دیا گیا تھا۔ البتہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن' کانگرس اور مسلم لیگ نے اخلاقی طور پر اور سیاسی طور پر یہ اصول وضع کیا تھا کہ والیان کو آئینی طور پر مستقبل کے بارے میں اپنا لائحہ عمل اختیار کرنے کا مجاز قرار دیا گیا تھا۔ البتہ وہ اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت عوام کی رائے کو ملحوظ رکھیں گے۔ یہ اصول اگر چہ تحریری شکل میں موجود تھا لیکن اس کی قانونی وقعت نہیں تھی۔ یہ محض اخلاقی طور پر کیا گیا تھا اور تقسیمِ ہند کی پالیسی اس کے ساتھ مشروط نہیں تھی۔ چنانچہ خود پاکستان نے اپنے طرزِ عمل سے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اگر ایک ریاست کا والی اپنے عوام کی اکثریت کے برعکس آئینی اور قانونی طور پر ایک فیصلہ کر لےتو اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس کی مثال آپ کو جونا گڑھ سے ملے گی جہاں کی اکثریتی آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی جو پاکستان کے ساتھ شامل ہونا نہیں چاہتے تھے لیکن جونا گڑھ کے نواب نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تو حکومتِ پاکستان نے اس کو قبول کر لیا۔

پہلی سیاسی غلطی

یہ واقعہ بے حد اہم ہے اور میں بار بار اس پر زور اس لیے دیتا ہوں کہ ایک اعتبار سے جونا گڑھ کا پاکستان کے ساتھ الحاق اور پاکستان کا اسے قبول کر لینا اور اس کے بعد پاکستان کا اپنی ذمہ داریوں سے نپٹنے میں لاپروائی اور ناکامی کا مظاہرہ ابتدا ہے۔ دیسی ریاستوں کے بارے میں پاکستان کی اس پالیسی کو جو مشکل ہوئی اور جس کا بہت گہرا تعلق مسئلہ کشمیر سے بھی ہے، ریاست حیدر آباد بھی جہاں آبادی کی اکثریت ہندوؤں کی تھی لیکن حاکم مسلمان تھا، مخمصے میں مبتلا رہی اور بالآخر نظام نے خودمختاری کا اعلان کر دیا لیکن اس فیصلے کو عوامی اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ پاکستان نے نظام کے اس آئینی اور

قانونی حل کو تسلیم کیا اور آزاد حیدر آباد کے ساتھ رابطہ رکھا اور نظام کا ایک ایجنٹ جنرل کراچی میں تعینات ہو گیا جس کی حیثیت قریب قریب ایک سفیر کی تھی ۔ اس مختصر جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ جس طرح حیدر آباد پاکستان کا حصہ نہیں تھا اور جونا گڑھ پاکستان کا حصہ نہیں تھا لیکن جونا گڑھ اور حیدر آباد کو بھارت نے اپنی طاقت اور سیاسی حکمت عملی سے اپنا حصہ بنا لیا اور اللہ تعالیٰ نے پاکستانیوں کو اتنی بھی توفیق نہ دی کہ کشمیر کے معاملے میں کوئی خاطر خواہ فیصلہ کروا سکتی ۔ لہٰذا اب سے ضروری امر یہ ہے کہ یہ غلط فہمی دور ہونا چاہیے کہ تقسیم کے وقت کشمیر خود بخود قانونی طور پر پاکستان کا حصہ بن گیا تھا ۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا ۔ البتہ نظریاتی اعتبار سے پاکستانی مسلمان کشمیر کو اپنا حصہ تصور کرتے رہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تصور کی حیثیت وہی تھی جیسے پاکستانی مسلمان سارے آسام، سارے بنگال اور سارے پنجاب کو اپنا حصہ تصور کرتے تھے لیکن قانونی طور پر آسام کا ایک ضلع ' پنجاب کے سولہ اضلاع اور بنگال کا تقریباً نصف ہی پاکستان میں شامل ہو سکا ۔

مسئلہ کشمیر کو سمجھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی سوچ کی ابتدا اس انداز میں کرے کہ کشمیر آئینی اور قانونی طور پر نہ پاکستان کا پہلے حصہ تھا، نہ اب ہے ۔ البتہ نظریۂ پاکستان کے حامی لوگ ایسی صورتِ حال پیدا نہ کر سکے جس سے کشمیری عوام کی آزادانہ رائے لے کر اس کا پاکستان سے الحاق کیا جائے ۔

پھر ایک بات اور بھی ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کشمیر 1947ء میں آئینی طور پر پاکستان کا حصہ بن گیا ہوتا تو پھر یہاں رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس صورت میں ہمارا نظریہ یہ ہوتا کہ کشمیر بھی ویسا ہی بھارتی مقبوضہ علاقہ ہے جیسا کہ آج کل شکر گڑھ کے کچھ حصے یا سندھ میں بھارتی مقبوضہ علاقے کی پوزیشن بالکل مختلف ہے اور ان علاقوں میں رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ ان علاقوں کو بزور شمشیر حاصل کرتے لیکن کشمیر کو بزور شمشیر حاصل کر لینے سے بھی

مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ایک بار مستقبل کے تعلقات یا ہمسایہ ملکوں سے مراسم کا فیصلہ یہاں کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق اور مرضی کے مطابق طے کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ اور ہماری جماعت لبریشن لیگ ہمیشہ اس امر پر زور دیتی رہی ہے کہ سب سے پہلے کشمیر کی متنازعہ حیثیت کو اجاگر کیا جائے۔ اس کے برعکس اگر یہ تاثر دیا جائے کہ کشمیر کی حیثیت متنازعہ نہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے طے شدہ مسئلہ سمجھا جائے گا اور اگر اسے طے شدہ مسئلہ سمجھا جائے تو پھر پاکستان اور آزاد کشمیر کے لیڈروں کو موجودہ صورتِ حال پر اکتفا کرنا پڑے گا اور یہ امر طے شدہ ہے کہ پورے جموں وکشمیر کے عوام موجودہ صورتِ حال کو تسلیم نہیں کرتے۔

جونا گڑھ کا مسئلہ

علاوہ ازیں ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے جس پر سوچ بچار ضروری ہے۔ جونا گڑھ نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا تو پاکستان نے اس الحاق کو قبول کرلیا اور اس طرح دفاع، وزارتِ خارجہ اور مواصلات کی ذمہ داری اٹھالی کہ الحاق میں یہ تینوں ذمہ داریاں سنبھالنا پڑتی ہیں لیکن بھارت کی طرف سے جونا گڑھ میں گڑبڑ کرائی گئی تو پاکستانی افواج یا پولیس کی طرف سے ایک چوہا بھی اس کے دفاع کے لیے نہ جاسکا۔ پاکستان نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی دو ہی وجوہات ہوسکتی ہیں:۔

1- جونا گڑھ کے معاملے میں حکومتِ پاکستان کا الحاق قبول کرنے کا فیصلہ سنجیدگی پر مبنی نہ تھا۔

2- حکومتِ پاکستان میں اتنی طاقت یا سکت نہ تھی کہ وہ جونا گڑھ کا دفاع کرسکے۔

سیاسی طور پر میرے خیال میں جونا گڑھ کا الحاق قبول کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو یہ ڈراوا دیا جائے کہ اس نے کسی اصول کی بنیاد پر کشمیر کے لیے سمجھوتہ نہ کیا تو اس سے دیگر ریاستوں میں پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے مگر بدقسمتی سے اس پالیسی کو آگے نہ بڑھایا جاسکا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ جونا گڑھ پر قبضہ برقرار رہا اور نہ کشمیر کا فیصلہ ہوا اور نہ بھارت

کو ہٹ دھرمی سے باز رکھا جا سکا۔ البتہ جونا گڑھ کے مسئلے سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ جس طرح بھارت نے جونا گڑھ پر پولیس ایکشن کر کے قبضہ کر لیا تھا، پاکستان کے لیے بھی کشمیر پر اس قسم کا پولیس ایکشن کرنے کا جواز موجود ہے لیکن بد قسمتی سے پاکستان کی حکومت سے یہ بھی نہ ہو سکا۔

سیز فائر لائن کیسے؟

اس کے برعکس پاکستان نے کشمیر میں جو حکمتِ عملی اختیار کی وہ یہ تھی کہ شروع میں آزاد کشمیر کی باغی حکومت قائم ہوئی تو حکومتِ پاکستان نے دل کھول کر اس کی حمایت کی مگر اس پر جذبات غالب رہے اور آزاد کشمیر کی حمایت کرتے وقت پاکستان اور آزاد کشمیر کے تعلقات کے بارے میں کوئی ٹھوس فیصلہ نہ کیا گیا۔ تذبذب کی اس پالیسی میں اس مسئلے کو سلامتی کونسل کے حوالے کر دیا گیا اور ایک غلط فہمی جس کا ازالہ ضروری ہے یہ کہ سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر کو لے جانے والا پاکستان نہیں تھا بلکہ بھارت تھا جس نے پاکستان کے اوپر عسکری جارحیت کا الزام لگایا اور اگر یہ مسئلہ بھارت سلامتی کونسل میں پیش نہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید پاکستان کی طرف سے یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آتی کیونکہ کشمیر کے بارے میں پاکستان میں جذبات تو بہت تھے لیکن کوئی ٹھوس پالیسی موجود نہ تھی بلکہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو چند ایک سرکاری ملازموں اور سرحد کے گورنر خان قیوم پر چھوڑ دیا گیا تھا جنہوں نے اپنے محدود اختیارات سے کام لے کر آزاد کشمیر میں کشمیری مجاہدین کی اتنی مدد کی جتنی وہ کر سکتے تھے۔ بعد میں جب ہندوستانی فوجوں نے پیش قدمی کی تو مجبوراً پاکستان کو اپنی فوج بھیج کر وہ دفاعی پوزیشن اختیار کرنا پڑی۔ یہی وہ دفاعی پوزیشن ہے جسے آج کل حد متارکہ یا سیز فائر لائن کہتے ہیں۔

مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں

سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر کو لے جانے سے یہ فائدہ البتہ ہوا کہ دنیا کشمیر کے مسئلے

سے روشناس ہوگئی اور پاکستانی نمائندوں نے اس وقت کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ کی سرکردگی میں سلامتی کونسل کے سامنے برصغیر کی تقسیم کا پس منظر اور اصول واضح کر کے وہ قراردادیں منظور کروائیں جن میں رائے شماری کا وعدہ کیا گیا تھا مگر ان قراردادوں میں جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے، بھارت کے ہاتھ میں اس قدر گنجائش رکھی گئی تھی کہ وہ جب چاہتا اس مسئلے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتا تھا۔حتیٰ کہ فوجوں کی واپسی کے بعد مشیر رائے شماری کا تقرر بھی بھارتی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کی منظوری سے ہونا تھا۔دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بھارتی فوج نکل جاتی اور پر امن فضا قائم ہو جاتی لیکن آخری وقت پر بھی مقبوضہ کشمیر کا حکمران سلامتی کونسل کے مطابق ناظم رائے شماری کا تقرر نہ کرتا تو یہ ناظم رائے شماری ریاست کے اندر رائے شماری نہ کرا سکتا تھا۔بہر حال یہ ستم اور کمزوریاں اپنی جگہ پر ہیں۔ہندوستان نے اس کا موقعہ ہی نہیں دیا اور ان سے پہلے اپنی روش پر کاربند رہتے ہوئے ایک طرف فوج کی واپسی کے سلسلے میں طویل بحث کے بعد مسئلہ کو الجھایا۔دوسری طرف انتخابات اور مقبوضہ کشمیر کی آئین ساز اسمبلی سے قراردادیں پاس کروا کر اپنے حق میں سیاسی جواز پیدا کر لیا۔نیز جوں جوں وقت گزرتا گیا، پاکستان میں بین الاقوامی مجبوریاں آڑے آتی چلی گئیں اور پاکستان کے ایک حلقے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر پاکستان اب تک کشمیر کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے تو یقیناً مستقبل میں بھی زندہ رہے گا۔اس طرح کشمیر کے مسئلے میں اپنی ذمہ داریوں سے گریز کا جواز پیدا کرنے کی راہیں تلاش کر لی گئیں۔

رائے شماری ہی نہیں؟

اس مسئلے کا ایک اور پہلو ملاحظہ کیجئے۔پاکستانی حکومت نے ہمیشہ ہی رائے شماری کے مطالبے پر زور دیا ہے لیکن وہ رائے شماری کے اصول کی بنیاد کو نظر انداز کرتی رہی۔رائے شماری محض ایک طریقِ کار ہے جس سے آزاد قوم اپنا حقِ خود ارادیت استعمال کرتی ہے۔بجائے اس کے کہ اس امر پر زور دیا جاتا کہ کشمیری عوام اپنا حقِ خود ارادیت استعمال کرنے

کے حقدار ہیں' زیادہ زور طریق کار پر دیا جاتا رہا حالانکہ آزادی سے رائے معلوم کرنے کے اور طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر کشمیر کے وجود کو الگ تسلیم کر کے کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کے بارے میں آزادانہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا تو طریق کار کی اس میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اصل سوال فوجوں کے انخلا اور کشمیری لوگوں کو آزادی سے مل بیٹھنے کا معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم کے لیے حق خودارادیت کا مطالبہ کیا جا رہا ہے' خود اسے تسلیم کیا جائے۔ پاکستان کی کشمیر پالیسی کے بارے میں ایک نکتہ ہمیشہ سے یہ رہا کہ پاکستان نے حق خودارادیت کی مبادیات کو نظر انداز کر کے رائے شماری پر زور دیا جو رائے معلوم کرنے کا محض ایک ذریعہ تھا اور کشمیر کے مسئلے کو اس طرح پیش کیا جیسے کشمیری قوم کا الگ سے کوئی وجود نہ تھا اور اس سلسلے میں تمام ذمہ داری سلامتی کونسل پر ڈال دی اور اس کی کاغذی قراردادوں سے یہ توقع رکھی کہ مسئلہ حل کرنے میں معاون ثابت ہوگی حالانکہ سلامتی کونسل کسی صورت میں عدالت نہیں کہ عدالت کا تصور دراصل اس طاقت کے ذریعے ہوتا ہے جو اس کے پیچھے ہوتی ہے اور جو اس کے فیصلے پر عمل درآمد کرواتی ہے۔ اس کے برعکس سلامتی کونسل کے پیچھے کوئی ایسی طاقت نہیں ہے کہ اگر ایک ملک یا قوم اس کا حکم ماننے سے انکار کر دے تو وہ اپنا حکم منوانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور پھر بدقسمتی یہ کہ جس شخص یا جماعت نے بھی یہ بتلانے کی کوشش کی کہ آپ خودارادیت کی بنیاد کو فراموش کر رہے ہیں' اس پر علیحدگی پسندی کا الزام لگا دیا گیا۔

کشمیریوں کی آزاد حکومت کو تسلیم نہ کرنے کا جو نقصان ہمیں پہنچا' اس کی تفصیل میں جائے بغیر چارہ نہیں۔ ایوب خان نے اپنے دورِ صدارت میں مسئلہ کشمیر کے مسئلے میں حق خودارادیت اور رائے شماری دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھارت کو کچھ دو اور کچھ لو کی پیشکش کی۔ جس کا مطلب ایک طرح سے یہ تھا کہ کشمیر کا مسئلہ حق خودارادیت کا مسئلہ نہیں بلکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک سرحدی تنازعہ ہے جس میں پاکستان کچھ لینا چاہتا ہے اور اس کے بدلے میں کچھ دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ آج بعض لوگ بھارت

کے اس مطالبے پر کہ وہ کشمیر میں سیز فائر لائن میں کچھ ردو بدل چاہتا ہے' اعتراض کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ خود پاکستان کے صدر نے یہ پیشکش کی کہ کچھ دو اور کچھ لو تو بھارت کو یہ حق حاصل کیوں نہیں کہ وہ سیز فائر لائن میں ردو بدل کرنے کا مطالبہ کرے۔ اصل میں دونوں ملک ایسا سوچتے ہیں تو غلطی پر ہیں کیونکہ یہ مسئلہ کشمیر کا ہے' پاکستان یا بھارت کا نہیں۔ اہلِ کشمیر خود کو ایوب خان کے ان اعلانات کے پابند نہیں سمجھتے۔ مجھے یقین ہے کہ بھٹو صاحب کی موجودہ حکومت بھی خود کو ان اعلانات کا پابند نہیں سمجھتی ہوگی۔

ایوب خان کی فاش غلطی

فیلڈ مارشل ایوب خان کا ذکر چلا ہے تو چند باتیں کہنا اور بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایوب خان نے امریکی صدر سے ملاقاتیں بھی کی تھیں اور آئزن ہاور جو امریکہ کے اس وقت صدر تھے' نے یہ پوچھا تھا کہ پاکستان کشمیر کیوں چاہتا ہے؟ جس کے جواب میں فیلڈ مارشل نے امریکی صدر کو بتایا تھا کہ پاکستان کو کشمیر کی ضرورت پانی کے لئے اور شمالی علاقوں کے دفاع کے لئے ہے۔ جواب میں امریکی صدر نے کہا "پانی کا مسئلہ ہے تو منگلا ڈیم میں ہم آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں اور اگر شمالی علاقوں کا دفاع مطلوب ہے تو اسلحے سے مدد کریں گے"۔ ایوب خان مان گئے۔ حالانکہ اگر اس وقت امریکی صدر کو یہ باور کرایا جاتا کہ پاکستان کا بنیادی مسئلہ چند دریاؤں کا پانی حاصل کرنا اور چند پہاڑوں کو قدرتی سرحد کے طور پر حاصل کرنا نہیں بلکہ کشمیر کے عوام کی جدوجہد آزادی میں ان کا ساتھ دینا ہے تو امریکی صدر کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکی صدر کے پاکستانی صدر سے ان مذاکرات کے باعث مسئلہ کشمیر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کیونکہ اہل دنیا پر واضح ہو گیا کہ پاکستان کشمیر کے بارے میں تھوڑا سا علاقہ اور پانی چاہتا ہے ورنہ بیسویں صدی کے اس دور میں دنیا کی کوئی طاقت حق خود ارادیت کے اصولوں سے انحراف نہیں کرسکتی اور ہندوستانی قبضے کے باوجود پاکستان کی طرف سے اس مسئلے کی صحیح نمائندگی کی جاتی تو دنیا کی

رائے کشمیریوں کے ساتھ ہوتی۔ ایوب خان کے رویے سے اس بات کو تقویت پہنچی جس کا شکار پاکستان کی کشمیر پالیسی ہمیشہ رہی ہے یعنی ایک طرف تو مہاراجہ کو الحاق کا مجاز سمجھا گیا تھا اور دوسری طرف رائے شماری پر زور دیا گیا تھا۔ اس کا فائدہ ہندوستان نے یہ اٹھایا کہ یہ تاثر دیا کہ رائے شماری ہوئی بھی تو محض راجہ کے الحاق کے فیصلے کی توثیق کے لیے ہوگی اور اس فیصلے میں ردوبدل نہیں کر سکے گی۔ حالانکہ 1948ء میں جب کہ آزاد کشمیر کی باغی حکومت قائم ہوگئی تھی اور مہاراجہ کی فوجیں بھاگ گئی تھیں تو آزاد کشمیر کی حکومت کو قانونی حکومت تسلیم کر لینا چاہیے تھا اور اسی حکومت کو سلامتی کونسل میں بھی دنیا کے سامنے اپنا حق خود ارادیت خود پیش کرنا چاہیے تھا لیکن پاکستان کے سرکاری افسروں نے اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے خراب کر دیا اور دلائل سلامتی کونسل کے سامنے پیش کرتے رہے جیسے وہ کوئی عدالت ہو جو مقدمے کا فیصلہ کرنے کے بعد پولیس بھیج کر مکان خالی کروا دے گی۔

تحریکِ آزادی افسر شاہی کے پنجوں میں

اس متضاد پالیسی کا خود کشمیریوں پر بھی اثر پڑا اور اکثر لوگوں نے پاکستان میں بھی اور کشمیر میں بھی ذہنی طور پر اس بات کو قبول کر لیا کہ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں تمام اقدامات کی ذمہ داری حکومتِ پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر کشمیری لیڈروں نے اپنے آپ کو پاکستانیوں سے بھی زیادہ حکومت کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کی جس کا مقصد وزارتِ امور کشمیر کی خوشنودی حاصل کرنا تھا اور اقتدار پر اپنا تسلط جمانا تھا۔ نوکر شاہی کے عروج کے دور میں اس قسم کے لوگوں کا رویہ وزارتِ امور کشمیر کی خواہش کے عین مطابق تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیری لیڈر شپ کا ایک بڑا حصہ وزارتِ امور کشمیر کی نوکر شاہی کے تابع ہو گیا اور یوں تحریکِ آزادیٔ کشمیر بھی نوکر شاہی کے تحت آ گئی۔ دوسری طرف پاکستان کے عوام میں ایک عجیب تضاد نے جنم لیا۔ ایک طرف تو لوگ یہ کہتے تھے کہ جب تک کشمیری اپنے لئے کچھ نہ کریں' پاکستان کیا کر سکتا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ کشمیری بے

چارے اپنے لئے بھی کیا کرتے ۔حکومت افسروں کے تحت تھی ۔گلگت و بلتستان پر حکومت پاکستان کا براہ راست کنٹرول تھا اور ہے اور آزاد کشمیر کے چار اضلاع میں حکومت آزاد کشمیر قائم ہے جس میں اگر مجاہدین براہ راست جنگ کے لئے سیز فائر لائن کی طرف بڑھتے تو انہیں گرفتار کر لیا جاتا تھا کہ سیز فائر لائن پاکستان کی طرف سے منظور کی گئی تھی اور اس کی حفاظت پاکستانی حکومت کرتی تھی اور عالم یہ تھا کہ نہ کشمیری سیاسی طور پر کچھ کر سکتے تھے نہ ہندوستان سے لڑ کر کشمیر حاصل کر سکتے تھے ۔

1947ء، 1965ء اور 1971ء کی جنگیں

ان حالات میں پاکستان کو تین موقعے ملے جب وہ کشمیر کی آزادی کا فیصلہ عسکری طور پر کر سکتا تھا۔ 1947ء میں حکومتِ پاکستان نے حکومتِ آزاد کشمیر کی فوجی امداد کی۔ لیکن بھارتی فوجیں آنے پر پاکستان اس مسئلے کی صحیح اساس پر کھڑا نہ ہو سکا اور سلامتی کونسل کی قراردادوں میں الجھ کر رہ گیا۔ 1947ء کی جنگ آزادی پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ اگر اس وقت آزاد حکومت کو تسلیم کر کے اس کی امداد کی جاتی تو کشمیر کی آزادی کی تکمیل ناممکن نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی فوج کے بعض جرنیل کشمیر میں گئے تو ان کی نامکمل حکمتِ عملی کے سبب ہی راجوری اور مینڈھر کے علاقے ہمیں خالی کرنا پڑے اور مجاہدین کو بعض محاذوں پر پسپائی اختیار کرنا پڑی کیونکہ منصوبہ پوری طرح تیار نہ کیا گیا تھا اور نہ اس کے بارے میں پہلے سے غور و فکر ہوا تھا۔

1965ء میں ایک اور بچگانہ کوشش کی گئی اور سرکاری دفتروں میں ایک کاغذی انقلابی کونسل قائم کر کے مجھے گرفتار کر لیا گیا اور اس نام نہاد کونسل کے تحت صدائے کشمیر ریڈیو کام کرنے لگا اور بغیر سوچے سمجھے مجاہدین مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں چلے گئے ۔دکھ کی بات یہ ہے کہ 1965ء کی اس کوشش میں کشمیر کی تحریکِ آزادی کے لئے وہاں کا جغرافیہ مقامی حالات' زبان اور علاقائی تمدن کو بالکل پیشِ نظر نہ رکھا گیا اور نہ کشمیری لیڈروں کو اعتماد میں لیا

گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ پاکستان کو ناکامی ہوئی ۔ بعد میں چھمب کے علاقے میں تسلیم کیا گیا کہ آزاد کشمیر کی فوجوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوجوں نے بھی حملہ کیا تھا۔ اس طرح صدائے کشمیر ریڈیو اور کاغذی انقلابی کونسل کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔ کونسل کے سربراہ کا نام تک معلوم نہیں ہو سکا لیکن آزاد کشمیر کی اصل حکومت کو بے دست وپا رکھا گیا اور وزارتِ امور کشمیر اور انٹیلی جنس کے افسر سری نگر کے محلات پر قبضے کے خواب دیکھتے رہے اور ایک روایت کے مطابق بعض افسروں میں اس موضوع پر بھی لڑائی ہوگئی کہ ان میں سے ہر ایک مہاراجہ کے محلوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

1971ء میں تیسری بار حکومتِ پاکستان کے ہاتھ ایک اور موقعہ آیا۔ عام تاثر یہی تھا کہ اس مرتبہ پاکستان کشمیر پر حملہ کر کے راتوں رات بھارت کو باہر نکال کر پھینک دے گا لیکن عملی طور پر یہ ہوا کہ بھارتی فوج سیز فائر لائن کے اندر گھس آئی اور اس نے سوپور وادی لیپا اور کرگل کے اچھے خاصے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

ان تینوں کوششوں میں ایک جذبہ جو کارفرما نظر آتا ہے وہ محض افراد کی طرف سے خود نمائی ' ذاتی شہرت اور ذاتی پروپیگنڈے کا اور کشمیر کا فاتح بننے اور کشمیر کی فتح کا طرۂ امتیاز اپنی کلاہ پر لگانے کے سوا کچھ نہیں ۔ کشمیری عوام کی آزادی اور ان کے حقِ خود ارادیت کے ساتھ ٹھوس ہمدردی کی کوئی جھلک اس میں موجود نہ تھی ۔

ان تین کوششوں سے ایک اور بات بھی غلط ثابت ہوئی اور وہ یہ کہ کشمیر کو عسکری قوت سے حل کیا جا سکتا ہے ۔ ہمارے خیال میں پاکستان صرف اپنی طاقت سے ہندوستان کی فوجی قوت کو اتنا بڑا نقصان نہیں پہنچا سکتا کہ وہ کشمیر خالی کر دے اور مسئلہ صرف عسکری نہیں' اس کے بے شمار پہلو ہیں اور بنیادی پہلو اس کی سیاسی اساس ہے ہماری رائے شروع سے ہی یہ رہی کہ پہلے اس مسئلے کی بنیاد درست کی جائے یعنی مسئلے کو صحیح سیاسی پس منظر میں دیکھا جائے' پھر تحریک آزادی کو نئی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس طرح جو نئے نئے پہلو

سامنے آئیں گے ان سے نپٹا جا سکتا ہے۔

علاقے اور پانی کی جنگ

آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کو صرف پاکستان کی سیاسی' مالی اور عسکری امداد حاصل نہ ہو بلکہ دنیا بھر کی ان قوتوں کی تائید اور حمایت ملے جو حقِ خود ارادیت کی حامی ہیں۔ اگر آزاد حکومت کی مسلمہ حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا سربراہ ایک آزاد سربراہ کی حیثیت سے آزاد کشمیر کے لئے دنیا کے اکثر ملکوں کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کا مقصد محض پاکستان کو جغرافیائی طور پر حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ برصغیر میں خود ارادیت کے اصولوں کا منوانا تھا۔ ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ بالآخر کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرے گا لیکن اسے جدوجہد آزادی کی حمایت کے ساتھ مشروط نہیں کرنا چاہئے اور پاکستان کی کشمیریوں کے لئے امداد اس خواہش کے بغیر ہونا چاہئے کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ علاقہ اور پانی کی جنگ نہیں' لاکھوں مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت کی جنگ ہونی چاہیے۔

کشمیر کے عوض جنگی قیدی ہرگز نہیں

1971ء کی جنگ کے بعد جو نئی صورت سامنے آئی ہے' اس پر کچھ کہنے سے پہلے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک واقعہ تاریخ سے بیان کروں۔ 1840ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد پنجاب کی سکھ سلطنت میں ایک بحران پیدا ہو گیا۔ رانی جنداں کا معاشقہ ایک سردار لال سنگھ سے تھا لیکن انہیں رنگ رلیاں مناتے دیکھ کر سکھ فوج کے عہدیدار بہت چڑتے تھے اور ان کے خلاف بغاوت کی سوچ رہے تھے۔ رانی جنداں نے اپنے معاشقے کو بچانے اور سکھ فوج کی طاقت توڑنے کے لئے اسے انگریزوں سے لڑوا دیا۔ جنگ میں سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے جنگ کے اخراجات طلب کئے۔ اس پر رانی جنداں نے گلاب سنگھ کو جو جموں میں سکھ سلطنت کا نائب تھا' یہ رقم ادا کرنے کو کہا۔ سکھ

سلطنت کے کہنے پر انگریزوں کو گلاب سنگھ نے تاوان ادا کیا اور اس کے بدلے جموں و کشمیر کی ریاست اسے مل گئی۔

1971ء میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا۔ یحییٰ خان کی ایک نہیں کئی رانیاں تھیں۔ ان رانیوں کو بچانے کے لئے اور اپنی عیش وعشرت برقرار رکھنے کے لئے اس نے پاک فوج کو شرقی پاکستان میں شکست سے دوچار کروایا اور اب ہمارے جو قیدی بھارت میں ہیں ان کے عوض کشمیر کو ایک بار پھر فروخت کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ کشمیر کے عوض جنگی قیدی اور بھارت سے دوستی ملے گی۔ اب اس امر کا فیصلہ خود پاکستانی قوم کو کرنا ہے کہ اسے یہ سودا منظور ہے یا نہیں؟ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس امر کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہر بار جب شکست ہو تو تاوان کے طور پر ہمیں پیش کر دیا جائے۔

آخر حل کیا ہو؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسئلے کا کیا حل ہو؟ اگر بھارت واقعی نیک نیتی سے برصغیر کے مسائل کو ہمیشہ کے لئے حل اور دفاعی اخراجات کو کم کرنا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ شیخ عبداللہ اور مقبوضہ کشمیر کے دیگر کشمیری رہنماؤں سے پابندی ہٹالے اور دونوں حصوں کے کشمیری رہنماؤں کو آمبلی میں ملنے کا موقعہ دیا جائے۔ ہم لوگ مل کر اور اپنے عوام کی مرضی سے کوئی ایسا حل تلاش کر سکتے ہیں جو پاکستان اور بھارت دونوں کو منظور ہو اور جس سے دونوں بڑے ملکوں کے درمیان جنگ کا خطرہ بھی ٹل سکے۔ لیکن اگر بھارت کی طرف سے مذاکرات کی پیش کش محض ڈھونگ ہے اور اس کی نیت ٹھیک نہیں تو مجبوراً ہمیں اپنی آزادی کی جنگ خود سے لڑنا ہو گی۔ پاکستان اگر ہماری ذمہ داری لے سکتا ہے تو بہت خوب ورنہ ہمیں خود موقع دیا جائے کہ ہم اپنی آزادی کے لئے ایک طریق کار متعین کر کے اس پر چل سکیں۔ 1971ء کی جنگ کے ساتھ کشمیر کا ذکر بار بار کیا جا رہا ہے جو ہمارے خیال میں کشمیریوں پر زیادتی ہے۔ اگر پاکستان کو اپنی سیاسی اور فوجی حکمت عملی کی وجہ سے

ناکامی ہوئی ہے تو کشمیر کا مسئلہ اس سے کیوں متاثر ہو۔ کشمیر کا مسئلہ وہاں کے باشندوں کی خودارادیت کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کا سرحدی تنازع نہیں کہ اگر پاکستان چاہے تو کچھ لو اور کچھ دو کے تحت تقسیم کر لے۔ لہٰذا میں بار بار اس پر زور دوں گا کہ 1971ء کی جنگ کو مسئلہ کشمیر سے الگ رکھ کر فیصلے کرنے ہوں گے۔ کشمیر کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں اور ان دونوں کو آپس میں گڈمڈ کرنے کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

بھٹو نے تسلیم کر لیا

گذشتہ دنوں صدرِ پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے روس سے واپسی پر لاہور کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا اور کہا پاکستان اگر مسئلہ کشمیر کو بھول بھی جائے تو کشمیری اسے نہیں بھولیں گے۔ میرے خیال میں ان کا یہ بیان حقیقت پسندانہ ہے اور بنیادی طور پر اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مسئلہ کشمیر کی اساس مختلف ہے اور یہ کوئی سرحدی جھگڑا نہیں۔ ایک طرح سے مسٹر بھٹو نے کشمیر کی جدا حیثیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ ان ہی خطوط پر آزادیٔ کشمیر کی تحریک شروع کرنے کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جن کی طرف میں نے شروع میں توجہ دلائی تھی۔ کشمیریوں کو اب تحریکِ آزادی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا چاہیے۔ گزشتہ 23 برس میں پاکستان کی غلط سیاسی پالیسیوں کے باعث جو صورتِ حال پیدا ہوئی' اس میں تبدیلی پیدا کر کے اپنی تحریک کو صحیح سمت دینا چاہیے۔ گلگت اور بلتستان کے علاقے جو کشمیر کے اٹوٹ انگ ہیں آزاد کشمیر کی حکومت کے ماتحت ہونے چاہئیں اور آزاد کشمیر کی حکومت کو پاکستان کی طرف سے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پوری ریاست کی نمائندہ حکومت تسلیم کرنا چاہیے۔ اس کے بعد کشمیر کی آزاد حکومت کو اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر بیرونی پریس میں مسئلے کو پیش کرنا چاہیے۔

اس کے برعکس اگر پاکستان نے آج بھی ان خطوط پر عمل کرتے ہوئے آزاد کشمیر کی حکومت کو نمائندہ حکومت تسلیم نہ کیا اور گزشتہ 24 برس میں جو جو رکاوٹیں آزادیٔ کشمیر

کے راستے میں پیدا ہوئیں' انہیں دور نہ کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پاکستان نے کشمیریوں کو بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ بھٹو صاحب ایسا نہیں چاہتے ہوں گے۔

پاک بھارت مذاکرات اور کشمیر

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں بنیادی مسئلہ کشمیر ہے اور دونوں ملکوں کے تعلقات استوار نہیں ہو سکتے اور ان میں پائیداری نہیں آ سکتی جب تک کشمیر کے مسئلے کا خاطر خواہ حل تلاش نہ کر لیا جائے۔ یوں بظاہر ایک مسئلہ بنگلہ دیش کا بھی ہے' پاکستان کے جنگی قیدیوں کا بھی ہے۔ بھارت نے پاکستان کے جن علاقوں پر مثلاً شکر گڑھ اور سندھ میں قبضہ کیا ہوا ہے' ان کی واپسی کا بھی ہے لیکن سب کے سب مسئلے سطحی ہیں بلکہ جہاں تک بنگلہ دیش کا تعلق ہے' پاکستان کے صدر بھٹو ایک اخباری انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ بنگلہ دیش کو عملاً تسلیم کر چکے ہیں لہٰذا اس کے بعد کشمیر ہی ایک مسئلہ رہ جاتا ہے جو بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور بھارت کو بھی اس کا احساس ہے۔

گفت و شنید کے موجودہ دور میں بھارت کو پاکستان پر جو فوقیت حاصل ہے' اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نفسیاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ وقت بات چیت کے لئے موزوں نہیں کیونکہ پاکستان میں ابھی تک مشرقی پاکستان کے سقوط کا صدمہ باقی ہے اور یہ احساس موجود ہے کہ پاکستان کا وقار بری طرح متاثر ہوا ہے۔ ایسے ماحول میں گفت و شنید کا تسلی بخش طریقے سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔

پاکستانی نمائندوں میں جب تک یہ احساسِ زیاں موجود ہو گا' وہ صحیح طور پر اپنے موقف کے لئے کام نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مذاکرات کو ابھی سے شروع کرنے کی کیا جلدی ہے۔ جہاں تک قیدیوں کا تعلق ہے' ان کی واپسی میں اگر کچھ تاخیر بھی ہو جائے تو یہ صدمہ ہمیں برداشت کر لینا چاہئے مگر جب تک پاکستانی قوم ذہنی طور پر

اس احساس میں مبتلا ہے کہ ہم شکست کھا چکے ہیں' کانفرنس کی میز پر جانا سودمند نہیں ہوگا۔

پاکستان میں مارشل لاء اٹھنے کے بعد پہلا موقع ملا ہے کہ آزادی کے ساتھ سقوط مشرقی پاکستان اور بنگال میں پیش آمدہ واقعات کا پس منظر سامنے آئے۔نیز ابھی تک حمود الرحمٰن کمیشن جو مشرقی پاکستان میں ہماری فوج کے ہتھیار ڈالنے اور جنگ میں ناکامی کے اسباب کی تحقیقات کر رہا ہے' اس کی رپورٹ آجانے کے بعد ہی پاکستان صحیح معنوں میں بھارت کے ساتھ بات چیت کے لئے نفسیاتی طور پر تیار ہو سکتا ہے۔

پاکستان اور بھارت کی تیرہ روزہ جنگ میں دراصل کوئی طاقت آزمائی نہیں تھی اور میرے خیال میں ہندوستان کو اس امر کا صحیح اندازہ ہو چکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ قیدیوں کے مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا ہے اور جنگی قیدیوں کے خاندانوں کی اس ذاتی پریشانی میں اضافہ کرنے کی فکر میں ہے تاکہ حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالا جا سکے اور ساتھ ہی دو ممالک روس اور برطانیہ جنہوں نے بھارت کی دل کھول کر تائید کی تھی' پاکستان پر مختلف انداز میں دباؤ ڈالنے کی فکر میں ہیں۔انہیں اس امر کا یقین ہے کہ شاید ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کو اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔چنانچہ بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کو تسلیم کرنے میں جلد بازی بھی ان کی اس خواہش کی مظہر ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ چین کی انقلابی حکومت کو دنیا کی بے شمار طاقتوں نے سالہا سال تک تسلیم نہیں کیا تھا۔بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں اگر یہ ممالک چند ماہ اور انتظار کر لیتے تو اس میں کسی بھاری بین الاقوامی بحران کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا بلکہ اگر اب اس مسئلے کو آپ اس پراپیگنڈہ کی روشنی میں دیکھیں جو بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے ہی امریکہ' برطانیہ اور بعض دیگر یورپین ممالک میں کیا جاتا رہا تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ پاکستان مختلف قسم کے دباؤ کا شکار رہو چکا تھا۔اس پر حکومتِ پاکستان اور سیاسی جماعتوں کی حماقتوں اور یحییٰ خان کی خودغرضی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے اور پاکستان کے خلاف یہ بین الاقوامی تاثر ابھی تک زائل نہیں ہوا

اور حقیقت یہ ہے کہ بعض ملکوں نے اس معاملے میں پاکستان کے ساتھ ناانصافی سے کام لیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان میں اس امر کا احساس نہیں۔ اس لحاظ سے بھی گفت و شنید میں کچھ وقفہ مرے خیال میں بہتر ہوگا۔ ابھی تک پاکستانی قوم سقوطِ مشرقی پاکستان کے صدمے سے پوری طرح سنبھلنے نہیں پائی۔ غصہ' دکھ' خوف' کمزوری کا احساس اور بیرونی دباؤ ایسے عوامل ہیں جو غلط فیصلے کروا سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ حکومتِ پاکستان اس گفت وشنید کے پس منظر کے نفسیاتی پہلو کو پوری طرح دھیان میں رکھے گی۔

اس ضمن میں پہلی بات جو اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہئے' یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی اور فتح و شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ درحقیقت نہ پاکستانی فوج ہندوستانی فوج کے مقابل لڑی اور نہ اس کو ایسے احکامات دیے گئے اور نہ پاکستان کی طرف سے کسی طویل جنگی حکمتِ عملی کا مظاہرہ ہوا۔ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج صرف مکتی باہنی کی سرکوبی کرتی رہی اور اس نے شیخ مجیب الرحمٰن کے حامیوں اور ایسے عناصر کو جو ہتھیار بند ہو چکے تھے' دبانے یا مارنے کی کوشش کی۔ مگر ہندوستانی حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور اگر کسی جگہ اکا دکا مقابلہ ہوا بھی تو وہ محض کور کمانڈر کی ذاتی مجبوری کی وجہ سے تھا۔ ہوائی فوج کا بھی یہی عالم تھا۔

مغربی پاکستان میں بھارتی فوجیں شکر گڑھ' بجواڑ اور سندھ میں آگے بڑھیں۔ یہاں بھی قریب قریب یہی پوزیشن تھی اور جموں و کشمیر میں چھمب سے آگے ایک جھڑپ ہوئی۔ اس جائزہ سے ظاہر ہے کہ درحقیقت پاکستان کی طرف سے لڑائی لڑی ہی نہیں گئی اور اگر یحییٰ خان اور اس کا ٹولہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ کسی گفت وشنید میں تھوڑی سی دانش مندی کا مظاہرہ کرتا تو یہ نوبت نہ آتی اور بھارت کے پاس ہمارے نوے ہزار قیدی نہ ہوتے۔ مگر پاکستان کے عوام کو اس کی جگہ جو تاثر دیا گیا' وہ یہ ہے کہ ہماری فوج شکست کھا گئی۔ اس تاثر کو دور کرنا بہت ضروری ہے اور اگر پاکستان سے یہ تاثر دور ہو جائے تو بھارت

کو اتنی خوشی نہ ہو جتنی وہ اس وقت محسوس کرتا ہے۔

اس ضمن میں بھٹو صاحب نے یک طرفہ غیر مشروط طور پر قیدیوں کی واپسی کا جو اعلان کیا' وہ اپنی جگہ پر درست اور مناسب ہے مگر اس سے زیادہ بہتر میرے خیال میں یہ ہوتا کہ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ہی ہے تو پاک بھارت مذاکرات کے اس لمحے میں کیوں تسلیم کیا جائے اور اس میں بھارت کے احسان کا بوجھ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ہی ہے تو بہتر ہوگا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے کہنے پر یہ کام کیا جائے۔

بھارت سے گفت وشنید کے بعد پاکستان کا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اس ایک مسئلہ میں بھی ہم بنگلہ دیش کو بھارت کا ممنون بنا دیں گے جب کہ یحییٰ خان کی حماقتوں سے بنگلہ دیش پہلے ہی بھارت کا ممنون ہو چکا ہے:۔

پاک بھارت مذاکرات میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آیا پاکستان کشمیر کے بارے میں اپنا موقف تبدیل کرنے پر تیار ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں صدر پاکستان مسٹر بھٹو سے جو چند بیانات منسوب ہوئے ہیں' وہ حسب ذیل ہیں۔

1- امریکی ہفت روزہ نیوز ویک کو ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ پاکستان' بھارت اور بنگلہ دیش کی ایک کنفیڈریشن بن سکتی ہے۔

2- لاہور میں عوامی جلسے سے خطاب کرتے وقت انہوں نے کہا کہ پاکستان کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو بھول نہیں سکتا لیکن اگر وہ بھول بھی جائے تو اہل کشمیر اسے فراموش نہیں کریں گے۔

3- پاکستان کی قومی اسمبلی سے خطاب کرتے وقت انہوں نے کہا کہ اہل کشمیر کو ان کا حق پاکستان یا ہندوستان نے نہیں دینا' یہ ان کا پیدائشی حق ہے۔

4- ایک اور غیر ملکی نامہ نگار سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم ہندوستان سے پرامن سمجھوتہ چاہتے ہیں اور کشمیر میں حد بندی لائن کو امن کی لائن قرار دے کر

اس بنیاد پر بات چیت ہو سکتی ہے۔

5- نئی دہلی کے اخبار Statesman کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کلدیپ نیئر کو بیان دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میرے خیالات میں تبدیلی آ گئی ہے کہ مذاکرات لڑائی سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ فائدہ کی بھی توقع ہے۔

ان پانچوں بیانات کی ابھی تک صدر بھٹو کی طرف سے کوئی وضاحت یا تردید نہیں کی گئی اور یہ اس سوچ بچار کی غماز ہے جو اس وقت صدر بھٹو کی ہے۔ ہمیں ان سے کوئی فوری نتیجہ نہیں قائم کر لینا چاہئے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ صدر بھٹو کشمیر کے مسئلہ میں مختلف خیالات اور جو تجاویز ادھر ادھر سے سننے میں آئی ہیں' ان پر غور کر رہے ہیں۔ ان پانچوں باتوں میں باہمی تضاد بھی موجود ہے اور چونکہ یہ بیانات مفصل نہیں ہیں' اس لئے ضروری نہیں کہ اس تضاد کی کوئی بنیادی شکل موجود ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ صدر بھٹو نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سے آج تک کشمیر کے بارے میں کھل کر اپنی پالیسی کی وضاحت نہیں کی۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں کو اس وقت حیرت بھی ہوئی تھی جب صدر بھٹو چین تشریف لے گئے اور چینی وزیر اعظم سے مذاکرات کے دوران اپنی تقریر میں انہوں نے کشمیر کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ چو این لائی نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور غالباً اس کانفرنس کے اختتام پر جو مشترکہ اعلان جاری ہوا' اس میں کشمیر کا ذکر چین ہی کی تحریک پر ہوا۔

اگر مذکورہ بالا اس اعلان اور پہلے اعلان کا مقابلہ کیا جائے تو ایک میں آپ کو کشمیر کا ذکر نہیں ملے گا اور دوسرے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کشمیر کو اب نہیں تو کل بھول سکتا ہے۔

کنفیڈریشن والی تجویز پر بعض حلقوں میں اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ پوری ریاست متحدہ جموں و کشمیر کو بھی کنفیڈریشن کا رکن بنایا جائے لیکن بھٹو صاحب کے ذہن میں غالباً یہ تجویز نہیں تھی بلکہ انہوں نے آگے چل کر ایران اور افغانستان کا ذکر بھی کیا ہے' کشمیر کا

نہیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کنفیڈریشن اگر پاکستان' بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان ہوتو آزاد کشمیر' گلگت اور بلتستان کی پوزیشن کیا ہوگی اور کیا ان علاقوں کو پہلے ہی پاکستان کا حصہ تصور کیا جارہا ہے ۔ اگر ایسا ہے تو اس سے پاکستان کے موقف میں کمزوری نظر آتی ہے مضبوطی ہرگز نہیں ۔ باقی بیانات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اس مسئلے کو بات چیت سے طے کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اگر چہ ایسا کہا گیا ہے کہ کشمیر کے لوگ خود اس مسئلہ کو نہیں بھولیں گے لیکن اس چیز کی کوئی وضاحت نہیں ہوئی کہ پاکستان آج تک کشمیریوں کی طرف سے ذمہ داری اٹھا تا رہا ہے ۔ اب یہ ذمہ داری کشمیر کی کس جماعت یا عنصر پر ڈالی جائے گی؟

اگر ہم 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے حالات کو لیں تو اس کے بعد تاشقند میں جو صورت در پیش آئی' وہ یہ تھی کہ کشمیر کا ذکر کیے بغیر قیدیوں کی واپسی' ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات' فوجیوں کی واپسی اور ہوائی جہازوں کی پروازوں کے بارے میں فیصلے کیے گئے جبکہ اس وقت ایک اہم فیصلہ ہوا تھا اور وہ یہ کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے باہمی معاملات پرامن طریقے سے سلجھانے کی کوشش کریں گے ۔ ابھی تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ گفت وشنید تاشقند کی روشنی میں ہی ہو رہی ہے اور آپ کو یاد ہوگا کہ بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ وہ تیسری طاقت کی موجودگی کو پسند نہیں کریں گی ۔ پاکستان کی طرف سے غالباً اس بات کا اشارہ کیا گیا تھا کہ گفت وشنید پاکستان سے باہر ہو ۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اشارے کو نہیں سمجھا گیا اور اس طرح سے اعلانِ تاشقند کی پیروی کی پوری کوشش کی گئی ہے ۔ اگر اعلانِ تاشقند کی روشنی میں ہی پاکستان اور بھارت کے باہمی مسائل کو حل کرنا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ باہمی مسائل کیا ہیں؟

جموں وکشمیر لبریشن لیگ اور میرا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ محض پاکستان

اور بھارت کا باہمی مسئلہ نہیں کیونکہ اس میں سب سے اہم اور سب سے بڑا فریق کشمیر کے عوام ہیں۔ حکومتِ پاکستان بھی مختلف اوقات میں یہ کہتی آئی ہے کہ مسئلہ کشمیر کے تین فریق ہیں: پاکستان' بھارت اور کشمیر کے عوام۔ شیخ عبداللہ کا بھی یہی موقف ہے۔ اس صورت میں حکومت پاکستان کو موجودہ پاک بھارت مذاکرات میں کشمیر کے مسئلے پر بات چیت سے انکار کر دینا چاہئے تاوقتیکہ اہلِ کشمیر کے نمائندے بھی موجود ہوں۔ بصورتِ دیگر پاکستان نے کشمیر کو باہمی مسئلہ سمجھ کر ہندوستان سے بات چیت میں شامل کر لیا تو پھر حق خود ارادیت کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اہلِ کشمیر کی نمائندگی کون کرے۔ یہی وجہ تھی کہ لبریشن لیگ نے یہ موقف اختیار کیا کہ آزاد کشمیر کو پوری ریاست جموں و کشمیر کی نمائندہ اور آئینی حکومت تسلیم کیا جائے تا کہ وہ اہلِ کشمیر کی پوری طرح نمائندگی کے فرائض انجام دے سکے۔ بہر حال فوری طور پر جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے' وہ مذاکرات ہیں جو عنقریب ہوں گے۔

میں اس موقع پر جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے تمام مسائل کا پر امن اور آبرومندانہ حل تلاش کرنے میں ہماری کوششوں کو کامیاب کرے' وہاں یہ بھی دہرانا چاہتا ہوں کہ اگر پاکستانی حکومت نے کشمیر کے موقف میں کوئی تبدیلی اختیار کی یا اس میں نرمی' لچک یا جھکاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی تو پاکستان کے لئے سخت خطرناک حالات پیدا ہو جائیں گے۔ پاکستان کی اپنی بقا' سالمیت' عزت اور مستقبل کے تحفظ کی ضمانت اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ پاکستان کشمیر کے بارے میں مردانہ وار اپنے موقف پر ڈٹا رہے اور اگر ہندوستان اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتا تو بھاری ٹکر لینے کے لئے بھی تیار ہو جائے۔ آخر کار مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے عوام اور پاکستانی فوج کو 1970ء میں جو دھوکا دیا گیا ہے اور جس طرح سے بدنام کیا گیا' وہ اس داغ کو اپنے خون سے دھونے کی کوشش کریں گے۔

باب ششم

سفرِ آخرت

خورشید 10 مارچ 1988ء کی شام کو لاہور سے میر پور وکلاء کی کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ 8 مارچ کی رات کو گھر آئے تھے۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ آزاد کشمیر کی سیاست میں اتنے ملوث تھے کہ ان کا زیادہ تر وقت پنڈی اور آزاد کشمیر میں ہی گزرتا تھا۔ گھر سے زیادہ دن وہ کبھی دور نہیں رہتے تھے لیکن ان دنوں تو وہ ایک رات کے لیے ہی گھر آئے۔ چند گھنٹوں کے لیے بھی بار ہا آنا ہوا۔ لاہور میں زیر سماعت مقدمات کے لیے کئی دفعہ کئی کئی بار وہ عدالت سے آئندہ کی تاریخیں لے کر ملتوی کرواتے۔ پھر جب یہ ناگزیر ہو جاتا تو یہاں صرف عدالت میں ایک وکیل کی حیثیت سے اپنے فرائض پورے کرنے آتے اور اسی شام واپس پنڈی چلے جاتے۔ بلدیاتی انتخابات میں جو دھاندلیاں آزاد کشمیر میں چند ماہ پیشتر ہوئی تھیں، اس سلسلے میں حکومت نے متعصب پالیسی اور غلط طریق کار کو تحفظ دینے کی ایک ایسی روش اختیار کی تھی جس کی خورشید کی جماعت لبریشن لیگ غیر جانبدار تحقیقات چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں آزاد کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں نے حکومت کے خلاف عوامی اتحاد کے نام سے ایک اتحاد قائم کر لیا تھا۔ خورشید اس اتحاد کے صدر تھے۔ حکومت سے تحقیقات کے مطالبے نے ایک مؤثر ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ گذشتہ چھ ماہ سے بہت مصروف تھے۔ آزاد کشمیر کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ لوگوں سے رابطہ کیا۔ حکومت اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کسی طرح بھی اپنی زیادتی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ادھر قومی اتحاد کسی طرح سے بھی غلط سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ملک میں ہڑتالیں ہوئیں۔ جلوس نکلتے رہے۔ پولیس لاٹھی چارج کرتی رہی۔ آنسو گیس استعمال کی لیکن اس تشدد کے باوجود لوگوں کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ لیڈر ظلم اور دھاندلی کے سامنے نہ جھکے

اور اس تحریک نے ایک ایسی عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی جس سے حکومت بھی لرز گئی۔ لیکن جھوٹی اور مصنوعی انا کے لیے پھر بھی کسی طرح تیار نہ ہوئی اور اب اتحاد نے آزاد کشمیر میں 'لانگ مارچ' کا پروگرام طے کیا۔ ملک کی مختلف جگہوں سے سارے لیڈروں نے ایک جلوس کی شکل میں پیدل چل کر مظفر آباد سیکرٹریٹ پر قبضہ کرنا تھا، پھر جو صورت ہوتی' حالات اور وقت کے مطابق اس پر سوچا جاتا۔

خورشید نے سیاست کو زندگی بھر اپنی گھریلو زندگی میں داخل نہیں ہونے دیا۔ وہ کبھی خود سیاست کے متعلق کچھ نہیں بتاتے تھے۔ میں اور بچے جب بھی کوئی بات پوچھتے' مذاق میں ٹال دیتے یا کوئی مختصر سا جواب دے دیتے۔ ہماری گھریلو زندگی بہت خوشگوار تھی۔ بہت اطمینان بخش تھی۔ ہم بہت مصروف بھی رہتے تھے۔ ان کے دوست احباب کا حلقہ وسیع تھا۔ جب فرصت ہوتی' انہیں ملتے، اپنے گھر بلاتے لیکن کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کسی طرح کی برتری کا احساس ہوتا ہو۔ وہ بے انتہا شفیق، ہنس مکھ اور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ کبھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک کروڑ کشمیری قوم کے اتنے محبوب لیڈر ہیں جنہیں ان کے عوام دل و جان سے پسند کرتے ہیں اور ان کے مداح ہیں۔ ان کی مقبولیت کا مجھے کافی اندازہ تھا لیکن ان کی انکساری اور خلوص کے پیش نظر ان سے کبھی یہ ذکر بھی نہ کیا۔ انہیں ایسی باتیں پسند نہیں تھیں۔ جب کبھی اس سلسلے میں کوئی ذکر ہوتا تھا تو یہی کہتے تھے۔ ''خلوص کا پتہ چل جاتا ہے، دوسروں کی چاہت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پھر ذکر کر کے اس جذبے کو کیوں سبک کیا جائے۔'' میں نے ان کی ہر بات سے سمجھوتہ کیا ہوا تھا' اس لیے کہ ان میں عزم تھا' کردار تھا، خلوص تھا، وقار تھا، مقصد تھا، جذبہ تھا اور ایک نصب العین تھا۔ وہ ایک 'مکمل انسان' تھے اور مجھے فخر تھا کہ مرا ان سے یہ رشتہ ہے جو مقدس ہے، انمول ہے اور عزیز ہے۔ ان کے ساتھ زندگی گزار کر میں نے کبھی دنیا کی کسی اور نعمت کی خواہش نہیں کی تھی۔

10 مارچ کو چار بجے سہ پہر وہ ہم لوگوں سے رخصت ہوئے۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ چلتے وقت کہنے لگے ''میں انشاءاللہ کل شام لاہور واپس آجاؤں گا۔'' میں نے کہا ''کل تو آپ نہ آئیں۔ پرسوں آپ کو پھر پنڈی جانا ہے۔ بہت سفر ہو جاتا ہے۔ پنڈی سے ہو کر آئیں۔'' کہنے لگے۔ ''تمھیں تو پتہ ہے کہ خرم کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ بخار کے بعد قدرتی کیفیت ہے۔ پھر کمزور بھی ہو رہا ہے۔ رات بھر پہلے آؤں تو اس کے ساتھ کافی وقت مل جائے گا۔ cheer up ہو جائے گا۔ ان دنوں چپ بہت رہتا ہے۔ گزشتہ دنوں ہمارے بیٹے خرم کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ بخار چند روز پیشتر ہی ٹوٹا تھا لیکن کمزوری اور نقاہت تھی۔ پھر گھر میں سارا وقت رہ کر ویسے بھی کچھ اکتا گیا تھا۔ خورشید کی موجودگی سے فضا خوشگوار ہو جاتی تھی اور دونوں باپ بیٹا گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ میرے لیے بھی یہ بہت اطمینان بخش تھا۔

تین روز سے بہت بارش ہو رہی تھی۔ مسلسل پانی برس رہا تھا۔ مجھے ایسے موسم میں سفر سے ہمیشہ دقت ہوتی تھی لیکن خورشید تو زندگی بھر سفر کرتے رہے تھے۔ پہاڑی راستوں پر نہ موسم کا کبھی خیال کیا، نہ وقت کا، نہ بے آرامی کا۔ یہ بھی ان کی کچھ عادت سی بن گئی تھی کہ ہر طرح کے سفر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ میں گھبرا جاتی تھی۔ مجھے کبھی ان کی تھکاوٹ کا احساس ہوتا تھا، کبھی صحت کے پیش نظر پریشان رہتی تھی لیکن ان کے ہشاش بشاش چہرے کو دیکھ کر دل ہی دل میں ان کے لیے دعائیں مانگتی تھی اور یہ سکون ہوتا تھا کہ یہ خوش رہتے ہیں اور خدا کے فضل سے ان کی صحت قابلِ رشک ہے۔

خورشید کی زندگی کے آخری دو دن

اسی دن ان کے دوست جسٹس نسیم حسن شاہ کے والد محترم سید محسن شاہ پر کتاب کی نیشنل سنٹر میں تقریب پذیرائی تھی۔ خورشید نے اس میں بھی شرکت کرنا تھی اور وہیں سے میرپور جانا تھا۔

میر پور میں ان کی زندگی کے آخری لمحات کا ذکر ان کے ایک مخلص کارکن نے کچھ اس طرح اپنی تحریر میں کیا ہے:-

''10مارچ 88ء کا دن ہے۔ آزاد کشمیر عوامی اتحاد کے زیر اہتمام کشمیری وکلا کا کنونشن پوری جولانیوں کے ساتھ شروع ہونے والا ہے۔خورشید ملت مسٹر کے۔ ایچ۔خورشید عوامی اتحاد کے مرکزی لیڈر اور روحِ رواں ہیں۔غازیٔ ملت سردار ابراہیم خان اور بیرسٹر سلطان محمود صدارتی کرسیوں پر براجمان ہیں۔راجہ محمد فاروق سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ راولپنڈی اور لاہور کے نمایاں وکلاء کے علاوہ پورے آزاد کشمیر کے وکلاء کنونشن میں شریک ہیں۔ اس کنونشن کی سب سے اہم بات خورشید ملت کی زندگی کی سب سے آخری عوامی تقریر وکلاء کے اس سٹیج سے تھی جو کہ وکلاء کنونشن کے لیے موضوع خاص بنی ہوئی تھی اور ہر کوئی ان کے جامع اور فاضلانہ خیالات سن کر داد دے رہا تھا۔

قائداعظمؒ کی میراث اس پاکستان میں ہم اللہ کے حضور یہ عہد کرتے ہیں کہ اس قانون دان طبقے پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ہم مرتے دم تک اس سے عہدہ براہونے کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔ حضرت قائداعظمؒ کی سوچ اور فکر کے مطابق اس کی تعمیر کریں گے۔ یہاں پر آزاد کشمیر کے عوام آئینی و جمہوری حقوق اور شہری آزادی کے حصول کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔حضرت قائداعظمؒ کی سوچ کے مطابق اپنے ملک کی تعمیر کریں گے۔ یہاں پر پاکستان اور آزاد کشمیر کے مظلوم عوام کی قربانیاں رنگ لائیں گی۔ ہماری جدوجہد

نہ صرف اس خطہ کے عوام کے لیے حصول انصاف کی جدوجہد ہے بلکہ سیز فائر لائن کے اُس پار بسنے والے ہمارے بھائی جو مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے پنجۂ استبداد میں زندگیاں سسک سسک کر گزار رہے ہیں' ہم ان کی آزادی کی جدوجہد کو بھی نقطۂ عروج پر پہنچا دیں گے۔''

کے۔ ایچ خورشید کے اس فکر انگیز خطاب سے شرکائے کنونشن پر اس قدر اثر ہوا کہ کچھ دیر سناٹا چھایا رہا اور جب وہ واپس جا کر اپنی کرسی پر بیٹھے تو کافی دیر تالیوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ کنونشن اختتام پذیر ہوا۔ میر پور بار کی طرف سے مندوبین کے اعزاز میں الرمان ہوٹل میر پور کے فرسٹ فلور کے ہال میں کھانے کا اہتمام تھا۔ مسٹر خورشید خود کم کھا رہے تھے اور دوسرے اضلاع سے آئے ہوئے مندوبین اور دوستوں سے مل کر ان کی خیریت زیادہ دریافت کر رہے تھے۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ ان کی زندگی کی یہ آخری ملاقات ہے۔

کھانے کے بعد آزاد کشمیر عوامی اتحاد کے تمام مرکزی رہنما پیر علی جان شاہ صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے جہاں تقریباً 3 گھنٹے تک حکومتِ آزاد کشمیر کی جانب سے مذاکرات کی پیش کش کا جواب دینے کے لیے غور کیا گیا۔ سردار ابراہیم نے سب کے صلاح و مشورے سے شاہد راٹھور سے کشمیر کونسل کو جواب تحریر کروایا اور ساتھ کہا کہ خورشید صاحب یہ تاریخی دستاویز آپ کی پارٹی کے لیڈر کے ہاتھوں لکھی جا رہی ہے۔ سب نے قہقہہ بلند کیا۔ خورشید صاحب بہت اچھے خوشگوار موڈ میں تھے۔ جب جواب تحریر ہو گیا تو چاروں لیڈروں نے اس پر دستخط کیے۔ رات 8 بجے میٹنگ ختم ہونے پر خورشید صاحب ہمراہ نیاز راٹھور'

ملک محمد یوسف، راجہ محمد امین، شاہد راٹھور اور شریف طارق' رہائش گاہ شریف طارق چلے گئے اور ان کے ڈرائنگ روم میں حالاتِ حاضرہ اور پارٹی کے دیگر امور پر مشورہ کرنے لگے۔ رات کھانے کی میز پر شریف طارق صاحب نے انواع واقسام کی ڈشز سجا رکھی تھیں اور دوستوں کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ روسٹڈ مچھلی دیکھ کر خورشید صاحب نے شریف طارق صاحب سے کہا۔ ''یہ شاید آپ کے موکل کی مہربانی ہے جو مچھلی کا بیوپاری ہے۔ ہمیں بھی کوئی مچھلی والا موکل دلوادیں تاکہ ہم بھی دوستوں کی اس طرح دعوتیں کیا کریں۔ غرضیکہ گپ شپ کا یہ سلسلہ رات ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہا اور شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر خورشید صاحب نے اظہارِ خیال نہ کیا ہو''۔

خورشید ملت کے ساتھ گزری ہوئی گھڑیاں جب شریف طارق اور دیگر دوست بیان کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ان کے سامنے خورشید کی مخصوص مسکراہٹ کا نقشہ آجاتا ہے۔ جذبات اور احساسات کی یہ کیفیت اور رقت اسی صورت میں انسان پر طاری ہوتی ہے جب کوئی دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بستا ہو۔ خورشید ملت کی ذات اور ہمہ گیر شخصیت ایسی تھی کہ وہ جب ایک بار کسی سے مل لیتے تھے، اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔''

11 مارچ 1988ء بروز جمعتہ المبارک صبح 10 بجے جموں وکشمیر لبریشن لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے انتہائی اہم اجلاس کی صدارت مسٹر کے۔ ایچ خورشید نے سیکرٹری جنرل چودھری سلیمان کی رہائش گاہ پر کرنا تھی۔ اجلاس ساڑھے دس بجے خورشید ملت کی صدارت میں ملک محمد یوسف ایڈووکیٹ کی تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد شروع ہوا۔ یہ اجلاس حکومتِ آزاد کشمیر کی جانب سے اپوزیشن کو دی جانے والی مذاکرات کی دعوت اور اس کے

جواب اور مذاکرات کی صورت میں لائحہ عمل کے سلسلے میں تھی۔ 23 مارچ کے لانگ مارچ کو کامیاب بنانے کے لیے تجاویز اور لائحہ عمل طے کیا جانا تھا۔ خورشید ملت نے ابتدائی تقریر اور حالات کی بریفنگ کرنے کے بعد ارکان مجلسِ عاملہ سے تجاویز طلب کیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری اور انتہائی اہم تقریر پارٹی کے پلیٹ فارم سے کی۔

''میرے مخلص رفقائے کار! آج ریاست جموں وکشمیر تاریخ کے انتہائی اہم موڑ سے گزر رہی ہے۔ عوام نے جس طرح جرأت سے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپوزیشن کا ساتھ دے کر لاتعداد قربانیاں دی ہیں ہم انشاء اللہ آپ کے سامنے اور اللہ کے سامنے یہ عہد کرتے ہیں کہ عوام کے حقوق کے حصول کے لیے امن وآشتی کے لیے اور ملک میں آئینی و جمہوری نظام کو مستحکم کرنے کے لیے مذاکرات کی میز پر عوام کے حقوق کے حصول کی جنگ سیاسی بصیرت کے مطابق لڑیں گے۔''

خورشید ملت نے اپنی اس تقریر میں فکری سوچ کی گہرائی اور عظمت کو جس طرح بیان کیا' اس کا احاطہ الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے ذہانت کا بحرِ بیکراں چاہیے۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے دوپہر جمعہ کی نماز کے لیے وقفہ ہوا اور چودھری سلیمان نے سب کو الرمان ہوٹل میں کھانے کے لیے مدعو کیا۔ کھانے کے دوران راجہ نبی محمد اور چودھری یوسف ایڈووکیٹ سیالکوٹ نے خورشید صاحب کو گجرات کے اضلاع میں کشمیری عوام سے عوامی رابطہ مہم اور جلسوں سے خطاب کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کی اور اپنے بائیں طرف بیٹھے ہوئے نیاز راٹھور سے کہنے لگے'' اپریل کے پہلے ہفتے میں اپنی کچہری کی ڈائری پر کوئی کیس نہ رکھیں۔ ہم انشاء اللہ گروپ کی شکل میں ان اضلاع کا دورہ کریں گے۔''

تقریباً 3:30 بجے سب حضرات خورشید ملت کے ہمراہ کھانا کھا کر باہر نکلے اور سب سے رخصت لینے کے لیے آخری بار انتہائی پُرتپاک طریقے سے بغلگیر ہوئے۔ جب نیاز راٹھور سے ملنے لگے تو انہوں نے کہا'' سر آپ لاہور جا کر کل پھر واپس آئیں گے۔ آپ کو

اتنا لمبا سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔میرے ساتھ راولپنڈی چلیں۔رات کو یہاں آرام کر کے کل صبح مظفر آباد چلے جائیں۔یہاں آپ نے 13 مارچ کو اپوزیشن پارلیمانی پارٹی کے اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔جس پر خورشید کہنے لگے 'میرا بیٹا لاہور میں بیمار ہے۔میں گھر آج پہنچنے کا وعدہ کر کے آیا ہوں۔میں انشاء اللہ کل صبح آپ کو لاہور سے فون کروں گا۔آپ ایئر پورٹ پر آجائیں۔کل میں راولپنڈی پہنچ کر 18 مارچ کو پشاور یادگار چوک میں ہونے والے جلسے کے بارے میں پروگرام بتاؤں گا۔ہم پشاور اکٹھے جائیں گے اور بشیر خان مرکزی جوائنٹ سیکرٹری جموں وکشمیر لبریشن لیگ جلوس کی شکل میں ہمارا استقبال کرنے اٹک کے پل پر آئیں گے'جہاں سے ہم جلوس کی شکل میں پنڈال تک جائیں گے۔

11 مارچ 1988ء کو شام سوا سات بجے ایک فلائنگ کوچ نمبر STB-7725 جسے ڈرائیور حبیب اختر جیلانی نہایت تیز رفتاری سے چلا رہا تھا، سیالکوٹ گوجرانوالہ بائی پاس کے قریب ایک مزدا گاڑی کو اوورٹیک کرتے ہوئے ٹریکٹر ٹرالی نمبر CAA-3529 سے ٹکرا کر الٹ گئی جس سے مسٹر کے۔ایچ۔خورشید موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔تین اور مسافر کچھ دیر کے بعد گوجرانوالہ سول ہسپتال میں دم توڑ گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے خورشیدِ ملت سلام

سلام اے خورشیدِ ملت سلام
مر کے بھی زندہ ہے تیرا نام
سلام اے خورشیدِ ملت سلام
تو نے بلند کی صدائے حق
وادی وادی پہنچے گا تیرا پیغام
سلام اے خورشیدِ ملت سلام
آزادیٔ وطن کا لیا تو نے نام
تھا کتنا عظیم تیرا یہ کام
سلام اے خورشیدِ ملت سلام
ناموسِ وطن کی خاطر دی جاں
ارفع ہے کتنا تیرا مقام
تیری روش فقیرانہ تیرا چلن درویشانہ
تیری زندگی غازیانہ شہادت تیرا انجام
خدمات کا تیری صلہ کیا دے گی دنیا
ہے فردوسِ بریں تیرا انعام
سلام اے خورشیدِ ملت سلام

(عبدالوہاب تبسم)

''خورشیدِ ملّت''

تیری دھرتی کا سینہ تھا زخمی ابھی
راہ کی تیرگی کب چھٹی تھی ابھی
بات کہنے کی سینے میں ہی گھٹ گئی
واپسی کی صدائیں بھٹکتی رہیں
اور صرف دعا لب کو چھو نہ سکے
اتنی عجلت بھی کیا تھی رکے ہی نہیں
تو خورشیدِ ملت تھا سوچا نہیں
پہلے بھی آبلہ پا ترے لوگ تھے
پہلے بھی زخم خوردہ تری قوم تھی
پا بہ جولاں ہوئے
زیبِ زنداں ہوئے
کیسے دار و رسن کی اذیت سہی
برس ہا برس سے ہر صعوبت سہی
ہر مسافت مگر پھیلتی ہی رہی
دائروں کا اثر تم نے ہی کم کیا
ظلمتوں کے سفر میں تری ذات ہی
نورِ خورشید تھی صبح امید تھی
آہ وہ شام تھی خونچکاں کس قدر

جس نے سورج کی کرنیں بھی زنجیر کیں
دور کی رہگزر پہ ترے لوگ اب
اپنے خونِ جگر سے چراغاں کیے
عکسِ خورشید دل میں بسائے ہوئے
پوچھتے ہیں یہی
یہ سفر تیرے بن اب کٹے کس طرح
تیرا زخمِ جدائی بھرے گا نہیں
راہ کی تیرگی اب چھٹے کس طرح
ہم کو تھی روشنی کی ضرورت ابھی
تو تو خورشیدِ ملت تھا سوچا نہیں
اتنی عجلت بھی کیا تھی رکے ہی نہیں
میرے خورشیدِ ملت کہاں جا چھپے
اپنے پیاروں کے آنسو بھی پونچھے نہیں
اتنی عجلت بھی کیا جو رکے ہی نہیں

(سیدہ آمنہ بہار روِنا)

”کشمیر اداس ہے“

شاخساروں پر داغ داغ ہیں برگ
کھوئی کھوئی سی ہے عروسِ بہار
رنگِ گُل سے لہو ٹپکتا ہے
سہمے سہمے کھڑے ہیں سرو و چنار
ظلم کی یہ رات ڈھل جائے گی
ہو گا آزاد کشمیر جنت نشاں
پھر سحر آشنا ہو گی ارضِ وطن
ہوں گی خود بلبلیں باغ کی پاسباں

(نذیر انجم)

آہ! کے ایچ خورشید مرحوم

ایک ایسا شجر جو کڑی دھوپ میں
اپنے رنگِ عمل سے خیالات کو
دم بدم سائے تقسیم کرتا رہا
فکرِ ملت میں تجسیم کرتا رہا
میٹھے پانی کا موج دریا تھا وہ
جو خزاں کو پلا کر جگر کا لہو
جس کی جولانیاں تھیں وطن کے لئے
چاہتا تھا بہاریں چمن کے لئے
ایک ایسا چمن جو وطن کے لئے
زد پہ بادِ مخالف کی شام و سحر
آرزوؤں کے غنچے کھلاتا رہا
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا
ایک خورشید تھا جگمگاتا ہوا
حریت کے جیالوں کو ہر گام پہ
جس کے زرّیں خیالات کی روشنی
ظلمتوں میں بھی راہیں دکھاتی رہی
ایک ایسا بشر یورشِ غم پہ بھی
تلخ حالات تھے دشمنِ جاں مگر

دامن راستی جس نے چھوڑا نہیں
منہ کبھی بھی حوادث سے موڑا نہیں
قائد قوم کا جو رہا متحد
ملتِ دل گرفتہ پہ ڈھا کے ستم
ناگہاں آ کر اس کو اجل لے گئی
دکھ پہ دکھ دے گئی غم پہ غم دے گئی
ہے قیامت بپا ایک کشمیر میں
قریہ قریہ بنا آج ماتم کدہ
وادیٔ لالہ و گل پریشان ہے
غم میں ڈوبا ہوا اک اک انسان ہے
حسنِ کشمیر پر مردنی چھا گئی
کون جانِ وفا روٹھ کر چل دیا

☆

غم سے کجلا گئیں ریشمی وادیاں
رو رہی ہیں بہاروں کی شہزادیاں
اے خدا اس کے کردار ضوبار کی
آفتاب کرم ہو یوں جلوہ فگن
روشنی قوم کے کام آتی رہے
قبر خورشید کی جگمگاتی رہے

(طفیل ہوشیارپوری)

''ہائے خورشیدِ ملت''

اجالوں کا اک سفیر بصیرت کا بادشاہ
ہر جور سے ہمیشہ نبرد آزما رہا
وہ پیکرِ خلوص بہت دور جا چکا
ہر دل ہے دکھ درد کی تصویر بن گیا
چشمِ فلک سے خون کے آنسو چھلک پڑے
اور وادیٔ کشمیر نے ماتم کیا نوحے پڑھے

احسان جس خطے پہ تیرے بے شمار ہیں
شجر و حجر و وادیاں و سبزہ زار ہیں
ماتم کناں اداس ہیں سب سوگوار ہیں
خورشید تیری موت پہ سینہ فگار ہیں
تو کیا لٹا کہ تیرے ہم سفر بھی لٹ گئے
بستا ہے جن دلوں میں تُو وہ گھر بھی لٹ گئے

مشفق تھا مہربان تھا اور تیز تلوار بھی
مداح فقط اپنے ہی کیا تیرے ہیں سب اغیار بھی
تو تھا تو اک امید تھی اس پار بھی اُس پار بھی
اب گر گئی امید کی وہ آخری دیوار بھی
خورشید تیری یاد ہر دل کو رلائے گی
خورشید تیری موت اندھیرا ہی لائے گی

(سید ماجد الرب)

خورشیدِ ملت کا پیغام

منزل شور ل ہی جائے گی
جاتے جاتے سنا گئے ہیں نوید
ہاں مگر شرط ہے کرو ہمت
تب طلوع ہو گا جیت کا خورشید

شفقِ خونی میں غروب ہوگیا خورشید

تابشِ خورشید سے روشن تھی دل کی کائنات
ہر صبح تھی عید ہم کو رات تھی شب برات
سرزمینِ پاک میں تھا یہ ہمارا ترجمان
تھا ہماری عزت و ناموس کا یہ پاسبان
تارکینِ جموں و کشمیر کا غم خوار تھا
دوش پر اس کے فلاحِ قوم کا اِک بار تھا
یہ سپاہ جانبازاں کا سپہ سالار تھا
بازیابی وطن کا یہ علمبردار تھا
زیرِ سایۂ جناحؒ پائی تھی اس نے تربیت
قائداعظمؒ نے تھی پھونکی اس میں روحِ حریت
سعی و پیہم تھی یہی اس کی وطن آزاد ہو
وادئ کشمیر پھر گل بار ہو دلشاد ہو

(راجہ اقبال شاہین)

فلائنگ کوچ کے نام جس نے خورشیدِ کاشمر کو نگل لیا

یہ کب سے گھات میں بیٹھا تھا فرشتہ
توڑ ڈالا ہے جس نے شعور کا سرشتہ
وہ شعور بخدا خورشیدِ کاشمر تھا
وہ بہاروں کے قافلے کا رہبر تھا
اسی سے ملا ہے خود شناسی کا سراغ
تیرگی میں تھا وہ بہر صورت چراغ
یہ دیس تاریخ کے حوالے سے جئے گا
اس نے اپنی نظر کو کھڑکی سے دیکھا
یہ زمین ہے اپنی نہ اپنا ہے یہ فلک
دھرتی کے رخسار پر ہے سوگ کی جھلک
قراقرم کے بے نام سلسلوں سے کہو
خطرات کا سبق یہاں بے اثر ہے کیوں

(حافظ محمد انور سمادی۔میر پور)

آ دبوچا موت نے اس کو نہ دی مہلت ذرا
طائرِ روح جسدِ خاکی سے دفعتاً اڑ گیا

جموں و کشمیر کا یہ قیمتی سرمایہ تھا
چھن گیا غربت میں ہائے ہم سے چھن گیا

وہ نوا پیرائے آزاد اب شکستہ ہے رباب
موت کی آغوش میں میری آنکھوں سے لیکن دور ہے

ہے تصور میں میرے آنکھوں سے لیکن دور ہے
ماورائے عالم فانی ہوا مستور ہے

غم میں ہے خورشید کے قوم ساری اشکبار
بے قرار و نالہ و زار و سینہ تفتہ دلفگار

ہے لطیف حق سے دعا حق میں اس کے بار بار
مرقدِ خورشید پر ہو رحمتِ پروردگار

بخش دے اس کی خطائیں لغزشیں رب کریم
تو وسیع غفران ہے ذات ہے تیری رحیم

(حکیم سید محمد لطیف ہاشمی)

چل بسا ایک عظیم دانشور
ان کے اوصاف لوگ کیا جانیں
حادثہ ایک ہو گیا ایسا
ہوگئیں جس میں تلف کچھ جانیں
آئی ہاتف کی یہ ندا مجھ کو
آیا خورشید رحمتِ حق میں

(نیاز اکبرآبادی)

وقت سے پہلے ڈھلی ہے شام کیوں
پوچھتے ہیں سوگوارانِ وطن
سن کے ہاتف نے جواباً یوں کہا
چھپ گیا خورشید سلطانِ زمن

1408ہجری

ہاتھ اٹھے دعائے مغفرت کے واسطے
کیا ہجومِ عاشقاں کی آخری یہ دید ہے
مصرعۂ تاریخ پوچھا تو صدا ہاتف نے دی
آسمانِ کاشمر سے ڈھل گیا خورشید ہے

ابراہیم گل

خورشیدزیرِ خاک

آہ وہ خورشید زیرِ خاک پنہاں ہو گیا
یہ خبر جس نے سنی وہ خود پریشاں ہو گیا
اس کا ماتم ہے بپا دونوں طرف کشمیر میں
آج پھر کشمیریوں کا چاک داماں ہو گیا
خطۂ آزاد کو اس نے دلایا تھا وقار
گلشنِ جمہوریت پھر آج ویراں ہو گیا
اس چمن میں جس کے دم سے تھی بہار اے دوستو
وہ غزل خواں سو گیا ہے وہ نگہباں سو گیا

(میر عبدالعزیز)

باب هفتم

کے ایچ خورشید کا راجندر سرین کو انٹرویو

راجندر سرین کی کتاب "پاکستان انڈیا فیکٹر" سے اقتباس جس میں خورشید صاحب سے ان واقعات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جن سے برصغیر کی تقدیر مرتب ہوئی۔

راجندر سرین زمانہ طالب علمی میں کانگرس کے سرگرم رکن تھے۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک میں گرفتار ہوئے۔ کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کرنے کے بعد وہ اخبار نویس بن گئے۔ انہوں نے حال ہی میں ایک کتاب (Pakistan India Factor) کے نام سے لکھی جس میں پاکستان کے سیاسی مکتبۂ فکر کے راہنماؤں سے انٹرویو لئے۔ خورشید صاحب کا بھی ایک طویل انٹرویو لیا۔ ان کے کہنے کے مطابق خورشید صاحب وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بڑی بامقصد بات چیت کی۔

ریاست جموں وکشمیر کے متعلق ان کے ایک سوال کے جواب میں خورشید نے کہا:

راما سوامی آئینگر نے قائداعظم کو ایک تار دیا تھا کہ اب جب کہ آپ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستانی ریاستوں کو آزاد ہونے کا حق حاصل ہے اور ریاست ٹراونکور پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کی پیشکش کرتی ہے۔ عام افواہ یہ تھی کہ سردار پٹیل نے سردار عبدالرب نشتر کو پیشکش کرتے ہوئے کہا تھا بھئی یہ کیا حیدرآباد اور جوناگڑھ کرتے ہو، کشمیر کی بات کرو، کشمیر لو اور معاملہ طے کرو۔ یہ کوئی باضابطہ یادداشت نہ تھی، یہ غیررسمی بات تھی۔

راجندر سرین: ہاں یہ یادداشت نہ تھی۔ یہ ماؤنٹ بیٹن سے ایک درخواست تھی کہ جب وہ پاکستان جائیں تو پاکستان سے غیررسمی طور پر اس کا ذکر کریں؟

خورشید: ہاں ایسا ہی تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ سنجیدگی سے کہا جاتا تو ماؤنٹ

بیٹن اس کے لئے موزوں پیغام بر نہ تھے کیونکہ جہاں تک پاکستانی رہنماؤں کا تعلق ہے' وہ ان پر اعتماد کھو چکے تھے۔ اگر یہ پیغام براہ راست پٹیل کے ذریعے آتا تو قابل عمل ہوسکتا تھا۔ سردار پٹیل میں یہ وصف تھا کہ جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تھے تو اس میں کوئی ابہام نہیں ہوتا تھا۔ وہ دوغلے نہیں تھے' نہ ہی وہ دوہری سوچ رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا اب جب ہم نے پاکستان کو تسلیم کر لیا ہے' معاملہ ختم کرو اور بات طے کرو۔ میرے خیال میں اگر کشمیر کے معاملے میں ان کی واضح پالیسی تسلیم کر لی جاتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ مسلم لیگ میں کچھ عناصر ایسے تھے جو چاہتے تھے کہ حیدرآباد کے معاملے کو اس طرح سلجھایا جائے کہ نظام کی آزادی برقرار رہے۔ میں آپ کو ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ 1946ء میں قائداعظمؒ حیدرآباد گئے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ قاسم رضوی اور ان کے گروپ کے ساتھ ہماری بات چیت ہوئی۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ انہیں اکثریت کے ساتھ جیتنا ہوگا۔ بعد میں میر لائق علی نے جو کچھ کیا اور قاسم رضوی نے جو صورتِ حال پیدا کی' قائداعظمؒ کے مشورے کے برعکس تھی۔ اس کے باوجود ہندوستان میں کچھ ایسے عناصر اور دوسرے مبصر ہیں جو قائداعظمؒ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ سب کچھ قائداعظمؒ کی منشا کے مطابق ہوا۔

راجندر سرین: میں آپ کے ساتھ متفق ہونے پر مائل ہوں کیونکہ یہ معقول بات ہے۔ اس زمانے سے میں بھی اس کی موہوم سی یاد رکھتا ہوں۔ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی لیکن میرا رجحان آپ کے ساتھ متفق ہونے کا ہے۔

خورشید: ریاستوں کا معاملہ جیسا کہ آپ نے کہا بدقسمتی سے سوائے کشمیر کے کسی نہ کسی طرح طے ہوگیا۔

راجندرسرین: کیا میں ایک لمحے کے لئے دخل اندازی کرسکتا ہوں۔ اگر اقتدارِ اعلیٰ کے خاتمے کا شیطانی احوال در آنے نہ دیا جاتا اور ریاستوں کو بھی ہندوستان کی تقسیم کے عمل کا ایک حصہ بنادیا جاتا تو کیا یہ بہتر نہ ہوتا؟

خورشید: سوال یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ ختم نہ ہوتا تو کیسے حاصل ہوتا۔

راجندرسرین: جانشین ریاستوں کے پاس۔

خورشید: ہاں پاکستان اور ہندوستان کی جانشین ریاستوں کے پاس مگر پھر یہ کون طے کرتا کہ ایک خاص ریاست کو پاکستان میں شامل ہونا چاہئے یا ہندوستان میں۔

راجندرسرین: یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کی حد بندی کا تعین کرتے وقت ان ریاستوں کا فیصلہ ہی اس عمل کا ایک حصہ ہونا چاہئے تھا مثلاً مدراس پریذیڈنسی سے کسی نے دریافت نہیں کیا کہ اسے پاکستان یا بھارت کا ایک حصہ ہونا چاہئے؟

خورشید: میں جانتا ہوں یہ بہتر رہتا اور کشمیر کے متعلق اقتدارِ اعلیٰ کے ناتے سے یہ مسئلہ طے پاجاتا۔

راجندرسرین: اگر ایک عام اصول بنالیا جاتا تو یہ معاملہ اپنی جگہ پر آجاتا؟

خورشید: اور کشمیر خود بخود پاکستان میں آجاتا۔

راجندرسرین: پھر ہمارے لئے یہ مسئلہ کھڑا نہ ہوتا۔ میری دانست میں کشمیر کا سیاسی عمل خود ہی صحیح ہوجاتا۔ شیخ عبداللہ بھی ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں اتنے پرجوش نہ تھے۔ خود اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ اس کے خلاف کھلا موقف اختیار کرسکتے۔ قبائلی حملہ بھی ایک غلطی تھی۔ یہ حملہ ناکام ہونے کے باعث پاکستان کے لئے بھی فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ آپ اس

پر کچھ کہنا پسند کریں گے؟

خورشید: جہاں تک شیخ عبداللہ کا تعلق ہے یہ جزوی طور پر درست ہے لیکن شیخ عبداللہ سودے بازی کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ مہاراجہ ہری سنگھ کے پنڈت نہرو کے ساتھ مراسم اچھے نہ تھے۔ نہرو کو ہری سنگھ کے ساتھ معاملات سلجھانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس وقت مہاراجہ کے مشیر رام چندر کاک تھے جو کشمیر کو کچھ عرصہ کے لئے ہندوستان اور پاکستان دونوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کاک نے پاکستان اور ہندوستان دونوں کو جوں کا توں معاہدہ پیش کیا تھا لیکن اسے ہندوستان نے قبول نہ کیا۔ پاکستان نے قبول کر لیا اور بعد میں سازشیں ہوئیں یہاں تک کہ گاندھی خود کشمیر گئے۔

راجندر سرین: کیا یہ جولائی کا مہینہ تھا؟

خورشید: گاندھی جلدی گئے تھے پھر اچاریہ کرپلانی گئے بعد میں کچھ اور لیڈر بھی گئے اور پھر ایک خاص عمل کا مظاہرہ ہوا۔ ایک سازش کے تحت رام چندر کاک کو ہٹا دیا گیا اور کشمیر میں ایک ہندو نواز حکومت قائم ہو گئی۔

راجندر سرین: مگر کیا آپ نے بھی سنا تھا کہ گاندھی کے قیام کے آخری دنوں میں مہاراجہ نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا؟

خورشید: مہاراجہ نے قائداعظمؒ کے ساتھ ملاقات کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مہاراجہ کے دل میں کسی وجہ سے کانگرس سے پہلوتہی کرنے کا خیال بھی تھا۔

راجندر سرین: یہ سچ ہے کہ مہارانی نے گاندھی سے ملاقات کی۔ ٹھاکر ہرنام سنگھ مہاراجہ کے اس وقت کے پرائیویٹ سیکرٹری نے مجھے بتایا تھا؟

خورشید: بالکل اور پھر وہاں ایک مسٹر یاترا بھی تھے یاترا اور ہرنام اس سلسلے میں بہت سرگرم عمل تھے مگر شیخ عبداللہ کی کیفیت یہ تھی کہ وہ سودے بازی کی کوشش

میں تھے۔ اس لئے کہ ہری سنگھ کو ان سے نفرت تھی اور پھر جب کانگرس نے ایک راہ نکالی کہ شیخ عبداللہ کو وزیر اعظم بنا دیا جائے تو ہری سنگھ کے لئے یہ ناقابلِ قبول تھا۔ بڑی مشکل سے مہاراجہ انہیں ہنگامی انتظامیہ کا سربراہ مقرر کرنے پر متفق ہوا۔ اس دوران شیخ عبداللہ اپنی سودے بازی کی پوزیشن مضبوط کرنے میں مصروف تھا۔

سری نگر میں انہوں نے اپنی تقریروں میں کہا ''ہم یہ سوچا کرتے تھے کہ پاکستان ایک دیوانے کا خواب ہے۔ ہم سوچتے تھے کہ پاکستان ایک برطانوی منصوبہ ہے' ہم سوچتے تھے کہ جناح ایک برطانوی ایجنٹ ہے مگر اب یہ ملک بن چکا ہے۔ میرے ملک کے دریا پاکستان کی طرف بہتے ہیں' میرے پہاڑوں کا رخ پاکستان کی طرف ہے' ہمارے مذہبی ادارے پاکستان کی طرف ہیں' مجھے کراچی جانا ہوگا' مجھے نئی دہلی بھی جانا ہوگا۔ ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ انہیں وزیر اعظم بنا دیا جائے۔ یعنی یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ بے شک شیخ عبداللہ کی جماعت میں جی ایم صادق اور غلام محی الدین پر مشتمل ایک ایسا تعلیم یافتہ عنصر تھا جو کہ پاکستان کے ساتھ گفت وشنید کا حامی تھا۔

راجندر سرین: میں ڈاکٹر تاثیر مرحوم سے ملا تھا۔ جب وہ شیخ عبداللہ سے ملاقات کرنے سری نگر آئے ہوئے تھے۔ مسٹر صادق بھی اس موقع پر موجود تھے۔ ڈاکٹر تاثیر کی تحریک پر صادق کو پاکستان کے رہنماؤں سے ملاقات کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس میں میاں افتخار الدین کا بھی ایک کردار تھا۔ اس تناظر میں قبائلی سرداروں کے ذریعے خان عبدالقیوم کی قبل از وقت معاملہ طے کرنے کی کوشش پاکستان کے مفاد کے لئے مجروح کن نہ تھی؟

خورشید: میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ اکتوبر 1947ء کو جب میں کراچی سے روانہ ہوا۔ قائداعظمؒ سے میری آخری ملاقات 30 ستمبر 1947ء کو ہوئی۔ قائداعظمؒ نے مجھے کہا "مہربانی کر کے کشمیر میں ہمارے لیڈروں کو بتا دو کہ میں مہاراجہ کے لئے کوئی مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ پرسکون رہیں اور ہم بعد میں صورت حال جیسی بھی ہوگی' نپٹ لیں گے"۔ یہی صورتِ حال تھی اور اسی دوران انہوں نے اپنے ملٹری سیکرٹری کرنل بل برنی کو سری نگر میں بریگیڈیئر سکاٹ کے ساتھ ملاقات کے لئے بھیجا جو اس وقت مہاراجہ کی افواج کے سربراہ تھے۔ سکاٹ کو مطلع کیا کہ قائداعظمؒ کشمیر آنا چاہتے ہیں۔ اس دوران قبائلیوں کا حملہ ہو گیا۔

راجندر سرین: کیا یہ حملہ عوامی سطح پر تھا یا قیوم خان کی سطح پر؟

خورشید: نہیں' ایک میجر انور تھے۔ وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار تھے۔ انہوں نے اپنا ایک گروہ قائم کر لیا تھا۔ اس طرح آئی این اے سے واپس آئے کچھ افسر۔ کیانی' حبیب الرحمٰن اور ایسے کچھ اور افسر بھی بے چین تھے اور کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں یہی موقع تھا۔ قیوم خان نے ان کی مدد کی۔ حکومتِ پنجاب نے بھی ان کی مدد کی جس کے نتیجے میں یہ حملہ ہوا گر پونچھ میں مقامی بغاوت ہو گئی تھی ۔ یہاں قبائلیوں کے علاوہ مہاراجہ کے مسلمان فوجیوں نے ہتھیار اٹھا لیے تھے۔

راجندر سرین: قبائلی حملے سے پاکستان کو نقصان ہی ہوا۔ جو حالات ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں تھے' پاکستان کی مخالف سمت ہو گئے؟

خورشید: کیونکہ اس حملے سے نہرو کو ایک بہانہ مل گیا اور شیخ عبداللہ نے بھارتی حکومت سے مدد کی درخواست کی۔ میرے خیال میں نہرو اور ماؤنٹ بیٹن

دونوں اس میں پس و پیش کر رہے تھے لیکن جب شیخ عبداللہ نے مدد کے لئے کہا تو انہیں معقول بہانہ مل گیا۔ ہو سکتا ہے اگر حملہ نہ ہوتا تو واقعی یہ صورت نہ ہوتی اور بھارتی افواج کشمیر میں نہ آتیں۔

راجندر سرین: ان دنوں بھارت کے جو حالات تھے وہ شاید کبھی کشمیر میں دخل نہ دیتے۔ پنجاب میں فسادات تھے۔ دہلی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی؟

خورشید: اس کے برعکس مسلمانوں میں اس وقت اس بات کا خوف تھا اور جنہوں نے خان قیوم اور دوسروں سے معلوم کیا تو اندازہ ہوا کہ اگر کوئی دیر ہوئی تو مہاراجہ بھارت کے ساتھ مل جائے گا۔ ہندوستانی افواج ریاست میں آجائیں گی اور ان حالات میں وہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ یہ بات میں پھر دوہرانا چاہتا ہوں کہ جب قبائلی حملہ ہوا تو میں خود حیران ہوا۔ قائداعظمؒ کے ساتھ جو میری بات چیت کشمیر کے متعلق ہوئی تھی اس میں اس کا ذرا سا شائبہ بھی نہ تھا۔ میں ان دنوں کشمیر میں تھا اور قائداعظمؒ کے احکامات کے مطابق کشمیری لیڈروں سے بات چیت کر رہا تھا۔ 1949ء میں جب میں رہا ہو کر پاکستان آیا تو قائداعظمؒ وفات پا چکے تھے۔ میں نے یہ سوال لیاقت علی خان سے کیا کہ جب میں کشمیر گیا تو قائداعظمؒ کو کسی ایسے حملے کی خبر نہیں تھی کہ پاکستان یا قبائلی فوجی ریاست پر کسی طرح سے حملہ آور ہوں گے۔ لیاقت علی خان چپ رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ لیاقت علی خان نے جان بوجھ کر اصل حالات قائداعظمؒ سے پوشیدہ رکھے یا قیوم خان اور نواب ممدوٹ اور دوسرے لوگوں نے یہ سلسلہ شروع کیا اور قائداعظم کو بے خبر رکھا۔

راجندر سرین: یہ بہت دلچسپ انکشاف ہے۔ میں نے مسٹر صادق سے بھی اس سلسلے میں گفتگو کی تھی۔ ڈاکٹر تاثیر اور میاں افتخار الدین کی وساطت سے اس کی

ملاقات جب لاہور میں لیاقت علی خان سے ہوئی تو مسٹر صادق نے مجھے بتایا کہ لیاقت علی خان کا خیال تھا کہ وقت گزر رہا ہے اور کشمیری لیڈروں کو اب ریاست کے الحاق کے سلسلے میں فیصلہ کرنا چاہیے۔ صادق نے کہا ''میں شیخ عبداللہ کو لاہور آنے کے لیے کہوں گا''۔ لیاقت علی خان نے کہا۔ شیخ عبداللہ دہلی میں ہے، واپسی پر اسے یہاں آنا چاہیے اور بہت اصرار کیا۔ صادق نے کہا کہ اسے یہ سمجھ نہیں آئی کہ لیاقت علی خان کیوں شیخ عبداللہ کی پاکستان آمد پر مصر تھے۔ بعد میں صادق کو اندازہ ہوا کہ 22 اور 23 تاریخ کے قبائلی حملے کی وجہ سے شاید وہ اتنے مصر تھے۔

خورشید: میرے خیال میں صادق کا مشن بھی ایک آزمائشی مشن تھا۔ صادق کو شیخ عبداللہ نے ایسے کوئی اختیارات نہیں دیئے تھے کہ وہ کوئی اپنے طور پر فیصلہ کرسکتا۔

راجندرسرین: یہ شیخ عبداللہ کی فطرت کے منافی تھا کہ وہ کسی کو اتنے اختیارات دیتے؟

خورشید: میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ جب میں سری نگر میں تھا تو میں بخشی غلام محمد سے تین بار ملا۔ اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں کراچی واپس جاؤں اور قائداعظمؒ سے کہوں کہ وہ مسلم کانفرنس کے لیڈروں چودھری غلام عباسؒ میر واعظ محمد یوسف اور دیگر تمام کشمیر کے مسلمانوں کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ شیخ عبداللہ اور ان کے حامی ہی اصل کشمیریوں کے نمائندہ ہیں۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے میں آپ کا پیغام دوں گا لیکن یہ یک طرفہ فیصلہ ہے۔ آپ کا کیا موقف ہوگا اور آپ کو اگر لیڈر سمجھ بھی لیا جائے تو آپ کی پالیسی کیا ہو گی''۔ اس نے کہا ''ہم سب مسلمان ہیں'' میں نے کہا ''میں مسٹر جناح سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ایک ایسی تجویز لایا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ

دیں، مسلم کانفرنس کو چھوڑ دیں، اپنی پارٹی چھوڑ دیں صرف اس یقین دہانی پر کہ نیشنل کانفرنس کے تمام لیڈر مسلمان ہیں۔

راجندر سرین: آیئے اب دوسرے پہلو کو دیکھیں۔ کشمیر کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشیدگی ہے۔ قائداعظمؒ کشمیر کے سلسلے میں دونوں ممالک کے تعلقات کو کیسا سمجھتے تھے؟

خورشید: بدقسمتی سے میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں جیل میں ہی تھا کہ قائداعظمؒ کا انتقال ہو گیا۔

راجندر سرین: بعد میں آپ کو حالات کا کچھ اندازہ ہوا؟

خورشید: جب میں واپس آیا تو میری اس سلسلے میں محترمہ فاطمہ جناحؒ سے بڑی طویل بات چیت ہوئی۔ قائداعظمؒ کے خیالات بڑے واضح تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کشمیر ہر حالت میں پاکستان کا ایک حصہ بنے گا لیکن لیاقت علی خان ''بس نہ پکڑ سکے''۔ جب سری نگر میں ہندوستانی افواج پہنچیں تو ان کا خیال تھا کہ پاکستانی افواج بھی فوراً وہاں بھجوا دی جائیں لیکن ان دنوں فوج مشترکہ قیادت کے زیر اثر تھی۔ آکنلیک سپریم کمانڈر تھا اور جنرل گریسی پاکستان آرمی چیف تھا۔ گریسی نے کہا کہ برطانوی افواج دوسری طرف برطانوی افواج سے نہیں لڑیں گی، اس لئے اس کے لئے افواج بھجوانا ممکن نہیں تھا۔

قائداعظمؒ نے لیاقت علی خان سے کہا ''آپ پرائم منسٹر ہیں، آپ کا فرض ہے کہ حالات کے مطابق صورتِ حال سنبھالیں ورنہ آپ ''بس نہ پکڑ سکیں گے''۔ اس لئے کچھ کریں''۔ میرے خیال میں قائداعظمؒ نے اس مسئلے کو کافی سنجیدگی سے محسوس کیا اور یہ چیز انہیں بسترِ مرگ پر بھی پریشان کرتی

رہی ۔محترمہ فاطمہ جناحؒ نے مجھے بتایا کہ جب قائداعظمؒ کے آخری لمحات تھے تو انہوں نے کہا ''کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے ڈیلیگیشن نے مجھ سے ملنے آنا تھا۔ابھی تک نہیں پہنچے ۔اصل میں کسی کو نہیں آنا تھا۔کوئی ایسی ملاقات متوقع نہیں تھی لیکن بیماری کے دوران جب وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے' اس وقت بھی ان کے اعصاب پر کشمیر چھایا ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کشمیر میں پاکستان کی سیاست انتہائی ناکام ثابت ہوئی ۔

اس کے علاوہ بھی دو تین اور ایسے مسائل ہیں جن سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات مزید خراب ہوئے ۔ بھارت نے پاکستان کو اس کے حصے کا روپیہ ادا نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اسلحہ فیکٹریوں اور دوسرے اثاثہ جات کی تقسیم میں بھارت نے بہت چھوٹے پن کا مظاہرہ کیا۔

راجندر سرین: کیا کسی وقت بھی آپ کو یہ اندازہ ہوا کہ قائداعظمؒ کے ذہن پر اور کیا بوجھ تھے اور ایسے حالات نے بعد کے واقعات کو کیسے متاثر کیا؟

خورشید: میرے خیال میں یہ ساری باتیں پاکستان کو شروع میں ہی ختم کرنے کی ایک سازش تھی ۔مثال کے طور پر جنرل موہن سنگھ نے مشرقی پنجاب میں اپنی ایک فوج اس غرض سے تشکیل دی تھی ۔

راجندر سرین: ہاں اس وقت سوبھاش چندر بوس نے پہلے انڈین نیشنل آرمی بنائی تھی ۔اس وقت اس کا نام ''دیش سیوک سینا' تھا۔ہندوستان کی حکومت نے اس کے ساتھ بڑا سخت رویہ رکھا اور آزادی کے فوراً بعد حکومت نے اس فوج کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟

خورشید: انہوں نے لیاقت علی خان سے عہد کیا تھا کہ وہ اس کے متعلق اقدام کریں گے ۔میرا مطلب یہ ہے کہ بے شک انہوں نے اس کے خلاف اقدام

اٹھائے لیکن اسی فوج نے مغربی پنجاب میں بڑی تباہی مچائی۔ ایک وجہ یہ تھی۔ دوسری وجہ بھارت نے پاکستان کی اقتصادیات کو تباہ کرنے کے لئے اس کے حصے کا 35 کروڑ روپیہ روک لیا تھا۔ تیسری وجہ سندھی ہندوؤں کو مجبور کیا گیا کہ وہ پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت آ جائیں۔ جس کی غرض صرف یہ تھی کہ مسلمان کراچی کی بندرگاہ کے ذریعے ملکی اور بین الاقوامی تجارت کرنے کے اہل نہ رہیں۔

راجندر سرین: کیا ہندوؤں کو مجبور نہ کیا گیا کہ وہ پاکستان چھوڑ دیں؟

خورشید: بالکل نہیں' کانگرس لیڈر شپ نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ بھارت میں کیا تاثر ہے' میں نہیں جانتا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف ایوارڈ کو باہر آنے سے پہلے ہی بدل دیا۔ یہ تمام باتیں مسٹر نہرو یا مسٹر گاندھی کے علم میں شاید نہ ہوں لیکن یقیناً بعض بڑے لیڈر پاکستان کو شروع میں ہی تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ پاکستان کے حصے میں جو فوجی آئے' ان میں بعض ملایا میں تھے بعض سنگاپور میں۔ ان کی آمد میں تاخیر تھی۔ آرمی سٹورز' اسلحہ کا سامان اس طرح تقسیم ہوا کہ پاکستان کے حصے میں پرانے جوتے آئے اور بھارت کو بندوقیں اور دوسری اچھی چیزیں ملیں۔ شاید اس سارے جذبے میں خوف تھا' شک تھا یا مایوسی اور حسد تھا لیکن اس طرح ہوا۔ ایک بات میں اصرار سے کہوں گا کہ قائداعظم کسی قیمت پر وہ نہیں چاہتے تھے جو تقسیم کے بعد ہوا۔ لوٹ مار' فرقہ وارانہ فسادات' آبادی کا تبادلہ وہ یہ سب نہیں چاہتے تھے۔

راجندر سرین: لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہندوؤں اور سکھوں کو پاکستان سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ مارچ 1947ء میں یہ سلسلہ شروع ہوا جب راولپنڈی میں فسادات

ہوئے اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا؟

خورشید: یہ ہوا لیکن میرے خیال میں سکھ لیڈر شپ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔کبھی وہ ماسٹر تارا سنگھ کی بات مانتے تھے اور کبھی گیانی کرتار سنگھ کی۔ان کی رائے ایک نہیں تھی' اس لئے مسئلہ تھا۔شروع میں ان دونوں لیڈروں نے کانگرس کے ساتھ امیدیں لگائیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوگا لیکن راجہ جی کے فارمولے کے بعد جب بات پتہ چل گئی کہ غالباً کانگرس بھی تقسیم کو قبول کر لے گی تو سکھ لیڈروں مثلاً کرتار سنگھ نے اور طرح سوچنا شروع کر دیا لیکن انہیں خود معلوم نہیں تھا کہ اب ان کی واضح پالیسی کیا ہو۔قائداعظمؒ نے انہیں کہا تھا کہ چونکہ وہ بھارت میں بھی اقلیت ہوں گے' اس لئے وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہو جائیں تاکہ پنجاب کی تقسیم نہ ہو لیکن وہ خود اپنا آزاد فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔اس لئے وہ کانگرس کے پاس واپس گئے اور ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا۔ایک لحاظ سے تاریخ نے بھی سکھوں کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن اس میں وہ خود قصوروار ہیں۔

راجندر سرین: آپ کا خیال ہے کہ سکھوں کے ساتھ بھارت میں اچھا سلوک نہیں ہو رہا؟

خورشید: میں اس کا جواب نہیں دوں گا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ان کی اپنی ہی پالیسیوں اور سوچ کی وجہ سے سخت بدمزگی پیدا ہوتی رہی ہے۔مسلمان بھی پورا بنگال چاہتے تھے۔بعض پورا پنجاب چاہتے تھے لیکن پاکستان اس طرح نہ بن سکا۔کانگرس کو بھی بھارت مل گیا اور پاکستان بھی دوسری شکل میں بن گیا لیکن سکھوں کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ وہ اپنا الگ صوبہ بنانے کے خواب دیکھتے رہے اور سیاسی طور پر خود کو تباہ کر لیا۔

راجندر سرین: چلیں اب ہم 1965ء کی لڑائی کے متعلق بات کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے شیخ عبداللہ پاکستان آئے تھے۔اس کی بات پہلے ہوجائے تو اچھا ہے؟

خورشید: جہاں تک شیخ عبداللہ کی پاکستان آمد کا تعلق ہے۔میرے خیال میں وہ پنڈت نہرو کی آخری سیاسی عقلمندی تھی یعنی کشمیر کے متعلق دونوں ملکوں کی باہمی رضامندی سے کسی معقول نتیجے پر پہنچنا۔نہرو نے ایک اچھا قدم اٹھایا تھا۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔اب صورت حال یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادیں کشمیر کے متعلق ہمارے پاس ہیں لیکن اس کے ساتھ شملہ معاہدہ بھی ہمارے ساتھ ہے جس کے مطابق دونوں ملکوں کو اس مسئلے کا حل نکالنا ہے۔

1965ء کی جنگ ہمارے اوپر مسلط کر دی گئی۔میرے خیال میں پاکستان کے بعض اعلیٰ افسران کو غلط سمت لگایا گیا۔مثال کے طور پر میری پارٹی جموں وکشمیر لبریشن لیگ اور دوسری پارٹیاں بھی جموں وکشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت کی خواہاں ہیں لیکن حکومتِ پاکستان اس سلسلے میں ہمیں کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھانے دیتی' نہ خود کچھ کرتی ہے۔میں جانتا ہوں اس لئے کہ آزاد کشمیر کے صدر کی حیثیت سے میں نے صدر ایوب خان سے اس مسئلے پر کئی بار بات کی تھی۔خاص طور پر 1962ء میں جب بھارت چین کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ایوب خان جنگ کرنے کے سخت خلاف تھا اور کسی قیمت پر بھارت سے دشمنی مول لینے کے لئے تیار نہ تھا۔اس نے میرا مذاق اڑایا اور کہنے لگا ''تم غیر فوجی لوگ نہیں جانتے کہ جنگ کتنی ہولناک ہوتی ہے۔صرف ایک سپاہی جانتا ہے کہ جنگ کتنی مشکل اور کٹھن ہے' یہ آسان نہیں ہوتی۔ہمیں بین الاقوامی حالات کی روشنی میں کسی بہتر وقت کے لئے ان مسائل کے حل کا انتظار کرنا چاہئے۔''

یہ تو ایوب خان کی پالیسی تھی لیکن ان ہی دنوں امریکہ نے دیکھا کہ پاکستان چین سے دوستی بڑھا رہا ہے۔ RCD اور CENTO کی وجہ سے ایوب خان طاقت ور ہو رہا تھا۔ امریکہ نے سوچا کہ ایوب خان کو کسی طرح کمزور کرنا چاہیے۔ چنانچہ چند پاکستانی افسروں کی مدد سے ایک ایسا لائحہ عمل بنایا گیا جسے آپریشن جبرالٹر کا نام دیا گیا۔ ایوب خان نے اسے مسترد کر دیا لیکن کسی نہ کسی طرح 1965ء کی جنگ امریکہ نے پاکستان پر مسلط کر دی۔

راجندر سرین: کیا مسٹر بھٹو نے اس جنگ میں کوئی رول ادا کیا؟

خورشید: میرے خیال میں 1965ء کی جنگ میں مسٹر بھٹو کا رول صرف یہ تھا کہ انہوں نے ایوب خان کو بتایا کہ امریکہ نے یقین دہانی کروائی ہے کہ بھارت بین الاقوامی سرحدیں عبور نہیں کرے گا اور پاکستان اپنی فوجی کارروائیاں صرف کشمیر تک محدود رکھے گا۔ ایک لحاظ سے یہ ایک ایسا عہد تھا امریکہ کی طرف سے جس کی ایوب خان 1965ء کی جنگ میں کوئی مخالفت نہ کر سکے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔

راجندر سرین: اس جنگ سے بھارت اور پاکستان اور پھر کشمیر پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

خورشید: بھارت اور پاکستان کے تعلقات اس سے اور خراب ہو گئے اور جے پرکاش نارائن جیسا لیڈر یہ کہنے لگا کہ اب بھارت نے کشمیر کے لئے اپنا خون بہایا ہے۔ اس لئے اب رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جہاں تک پاکستان کے اندرونی حالات کا تعلق ہے اس جنگ نے ایوب خان کو بہت کمزور کر دیا۔ لوگ بھی ناخوش ہو گئے۔ ایوب خان بدنام ہو گیا۔ مسٹر بھٹو نے تاشقند میں سخت رویہ اختیار کیا اور ایوب خان کا زوال شروع ہو گیا۔ جہاں تک شیخ عبداللہ کی آمد کا تعلق ہے ان کے آتے ہی پنڈت نہرو کا

انتقال ہو گیا' اس لئے مجھے بالکل موقع نہ ملا کہ میں شیخ عبداللہ سے کشمیر کے سلسلے میں کوئی بات کر سکتا۔

ایوب خان نے ان دنوں شیخ عبداللہ کے ساتھ تین یا چار دن مری اور راولپنڈی میں گزارے لیکن میرے خیال میں شیخ عبداللہ نے کوئی خاص بات نہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ گفت وشنید سے پہلے دونوں ملکوں میں دوستی کی فضا قائم ہونی چاہئے۔ حکومتیں قریب آئیں گی تو لوگ قریب آئیں گے اور اس طرح مسائل حل ہو سکیں گے' ہو سکتا ہے اس طرح رائے شماری ہو سکے یا کوئی اور حل نکالا جا سکے یا کشمیر کو ایک آزاد غیر جانبدار حصہ قرار دیا جا سکے۔ لیکن ان کے سارے خیالات واضح نہیں تھے۔ بعد میں ایوب خان نے اپنی کتاب Friends Not Masters میں لکھا کہ شیخ عبداللہ ان سے باہمی دفاع اور کنفیڈریشن کی بات کرنے آیا تھا لیکن شیخ عبداللہ نے اس کی تردید کر دی تھی اور کہا تھا ''یہ درست نہیں ہے۔ ہم نے اس طرح کا کبھی نہیں سوچا اور ہم اس قسم کے لوگ نہیں ہیں۔'' ہو سکتا ہے کنفیڈریشن کی بات ہوئی ہو۔ ایوب خان نے خود نہرو سے باہمی دفاع کی بات کی تھی۔ میرے خیال میں شیخ عبداللہ ایک کھلے ذہن کے ساتھ پاکستان آیا تھا۔ پنڈت نہرو کے رویے میں بھی چین کی لڑائی کے بعد ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں سوچی ہوئی باتیں بعد کے حالات کے تحت بے اثر ہو گئی ہوں۔

راجندر سرین: اب ہم 1971ء کی جنگ کی بات کرتے ہیں؟

خورشید: 1971ء کے واقعات پاکستان کے اندرونی معاملات تھے۔ جس کا بھارت نے فائدہ اٹھایا۔ اس لئے ہم ہر وقت مطالبہ کرتے ہیں کہ حمود الرحمٰن کمیشن

رپورٹ شائع کی جائے۔

راجندر سرین: مسٹر بھٹو نے اپنی قید کے دوران اس رپورٹ کو ڈرافٹ کیا تھا۔ ان کے مطابق یہ فوج کی شرقی پاکستان میں نالائقی کی ایک داستان تھی۔ جسے فوج کا وقار برقرار رکھنے کے لئے شائع نہ کیا گیا۔ اس جنگ کا بھارت اور پاکستان کے تعلقات پر کیا اثر پڑا؟

خورشید: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس جنگ نے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ ملک کا اتنا حصہ ہاتھ سے چلا گیا۔ بڑی بے عزتی ہوئی۔ 90,000 فوجی بھارت کے قیدی بن گئے لیکن میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ میں نے بھارت کے کئی اخباروں میں بھی پڑھا کہ دوقومی نقطۂ نظر ناکام ہو گیا۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ بنیادی صورت نہیں بدلی۔ کوشش یہ تھی کہ پاکستان میں فوج حکومت کرتی رہے۔ بنگالیوں نے اس چیز کو قبول نہیں کیا لیکن بھارت نے ایک اچھے ہمسائے کا رول ادا نہ کیا اور اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا۔

ان دنوں پاکستان اور بھارت آپس میں دوستی کی بات کرتے ہیں لیکن دونوں ملکوں کے درمیان اعتبار اور ہم آہنگی کی فضا نہیں ہے۔ میرے خیال میں اندرا گاندھی کا رویہ ایسا نہیں کہ یہ فضا قائم ہو سکے۔ بھارت میں یہ پراپیگنڈہ کہ پاکستان ہتھیار جمع کر رہا ہے اور بھارت کو اس کی طرف سے حملہ کا ڈر ہے سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان پر بین الاقوامی دباؤ بھی ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کر لے۔ امریکہ کی طرف سے ہم سے یہ اصرار کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں امریکہ کیسے پسند کرے گا کہ ہم بھارت کے ساتھ کسی طرح ٹکر لیں کیا۔ وہ بھارت

کو کیوں ناراض کرے گا جب کہ وہ اس کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔

راجندر سرین: مسز گاندھی پاکستان کی طرف سے حملے کا ذکر اور طرح کرتی ہیں۔ وہ اس سارے زون میں جنگ کے خطرے کے لئے پریشان ہیں۔ مثال کے طور پر اگر امریکہ، ایران یا آس پاس کے علاقے میں کوئی گڑبڑ کرنا چاہے اور پاکستان بھی مجبوراً اس میں پھنس جائے تو کیا یہ جنگ کی صورت نہیں بن جاتی؟

خورشید: پاکستان کیسے اس صورت سے نپٹ سکتا ہے۔ ہمارے ذرائع محدود ہیں۔ ہمارے پاس اچھے ٹینک نہیں اور سامانِ جنگ نہیں۔ ہمیں تو سپیئر پارٹس (Spare Parts) بھی نہیں ملتے۔ پاکستان میں ایک ایک بچہ جانتا ہے کہ رن آف کچھ سے لے کر ہمارے سارے بارڈر پر بھارت کی فوج اپنے تمام تر سامان اور تیاریوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ آزاد کشمیر کی سرحدوں پر بھی یہی حال ہے۔ چترال تک یہی صورت ہے۔ بھارت کا تو روس سے بھی دوستی کا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔

راجندر سرین: لیکن بھارت روس کی افغانستان میں مداخلت کا مخالف ہے اور کسی طرح یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرے؟

خورشید: اگر یہ بات ہے تو بھارت Durand Line کو بین الاقوامی سرحد کے طور پر کیوں نہیں قبول کر لیتا؟ پھر کشمیر کے متعلق اپنی پالیسی کیوں نہیں واضح کرتا؟ بلکہ بارہا آزاد کشمیر کا علاقہ لینے کی بھی بات کرتا ہے بلکہ یہ بھی خبر تھی کہ مسٹر عبدالستار کو دفتر خارجہ میں بلا کر پوچھا گیا تھا کہ پاکستان کب آزاد کشمیر کا علاقہ خالی کرے گا؟ ایک اور بات جو مجھے پریشان کرتی ہے، وہ

روس کا واخان (Wakhan) پر قبضہ ہے۔

راجندر سرین: صرف اس کا ذکر کیوں؟ روس تو سارے افغانستان پر قابض ہے؟

خورشید: لیکن Wakhan پر قبضہ ایک معاہدے کے تحت ہے۔ کارمل حکومت نے یہ علاقہ چپکے سے روس کے حوالے کر دیا ہے۔

راجندر سرین: میرے علم کے مطابق یہ سچ نہیں۔ مغربی نیوز ایجنسی نے اس سلسلے میں بہت پراپیگنڈہ کیا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ روس افغانستان میں موجود ہے؟

خورشید: صورتِ حال اس طرح ان حالات میں تبدیل ہوتی ہے کہ کل روس افغانستان سے چلا جاتا ہے لیکن واخان کا علاقہ تو اس کے پاس ہی رہے گا جو پاکستان کی بقاء کے لئے بہت اہم ہے۔ روس اپنے ملک سے ایک سیدھا راستہ برصغیر میں چاہتا ہے اور یہ خطرے کی بات ہے۔ میں صدقِ دل سے اور ایمانداری سے دونوں ملکوں کی بہتری کے لئے ایک رائے مسز گاندھی کو دینا چاہتا ہوں کہ وہ جواہر لال نہرو کی طرح کشمیر کی سرحد کے دونوں طرف کے لوگوں کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ آزادی سے ملنے کے لئے حالات ہموار کریں۔

راجندر سرین: اس سے پہلے کہ کشمیر کے مسئلے پر ہم پھر بات کریں' کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان اور پاکستان کو اختلافات مٹا کر ایک دوسرے کے قریب آنا چاہئے۔ میں نے ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے۔ کیا آپ کو اس پر اعتراض ہے؟

خورشید: نہیں' میں ذاتی طور پر دونوں ملکوں کے خوشگوار تعلقات کا حامی ہوں بلکہ پورے برصغیر کے لئے ایک مشترکہ دفاعی معاہدہ پر بھی غور ہو سکتا ہے؟

راجندر سرین: اس طرح افغانستان کے مسئلے کے حل کے لئے بھی بھارت اور پاکستان دونوں مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

خورشید: ٹھیک ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہو گا جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ میں ایک بات آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دونوں ملک جنگ نہ کرنے کے ہزاروں معاہدے بے شک کر لیں۔ تجارت اور کھلاڑیوں کے آنے جانے پر ہر پابندی ہٹا لیں لیکن جب تک کشمیر کا مسئلہ تسلی بخش طور پر حل نہیں ہوتا' کبھی دونوں میں اچھے اور دیرپا تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر بھی یہ مسئلہ حل ہونا ہی چاہئے۔

راجندر سرین: کشمیر کے مسئلے کے حل میں کچھ مشکلات ہیں۔ ان حالات میں باقی دنیا کے واقعات رک تو نہیں سکتے۔ اس لئے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ باقی مسائل کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچا جائے۔ کچھ کیا جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ صرف کشمیر کے مسئلے کے حل کے انتظار میں باقی سب کچھ التواء میں چھوڑ دیا جائے؟

خورشید: چلیں یہ سوچ بھی لیا جائے لیکن اندرونی اور بیرونی معاملات دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔ اندرونی مسئلہ کو التواء میں چھوڑ دینا کہاں کا انصاف ہے۔

راجندر سرین: کشمیر کا مسئلہ 35 سال پرانا ہے۔ ہم پر بین الاقوامی دباؤ بھی ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ صرف کشمیر کو موضوع بحث بنا کر دوسرے اہم اور بین الاقوامی مسئلوں کو درگزر کر دیا جائے؟

خورشید: کشمیر ہم لوگوں کی بقاء ہے اسے درگزر نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اپنے تعلقات اس پہلو سے استوار کرنے چاہئیں۔

راجندر سرین: دونوں ملکوں کو اپنے اچھے تعلقات کی ابتداء افغانستان سے کرنا چاہئے۔

برصغیر اس علاقے میں امن و آشتی کی مثال بن سکتا ہے۔ اس طرح تین بڑی طاقتیں جو اس علاقے میں اپنی برتری کے لئے دلچسپی رکھتی ہیں، ہمیں چھوڑ دیں تا کہ ہم خود اپنے معاملات اور بین الاقوامی حالات کو سمجھتے ہوئے سارے مسائل سلجھا سکیں۔ اب کشمیر سب سے پہلے اہم ہے۔ کس طرح اس مسئلے کا حل ہم شروع کریں۔

خورشید: سب سے پہلے ہر ہندوستانی کو یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ ہر پاکستانی کو یہ ڈر رہتا ہے کہ بھارت آزاد کشمیر پر کہیں قبضہ نہ کر لے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وادی کے لوگوں اور آزاد کشمیر کے لوگوں میں ملنے ملانے کی آسانی ہوتا کہ وہ مل جل کر اپنے ملک کی تقدیر کا فیصلہ کریں۔

راجندر سرین: یہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ نہیں، ہمارے اور بھی خدشات ہیں۔ ہمیں فکر ہے کہ اگر آپ نے ملک کی سرحدوں کے متعلق ایک بار سوچنا شروع کر دیا تو قصہ یہاں ختم نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہی قصہ آسام، شمال مشرقی پنجاب اور جانے کہاں کہاں شروع ہو جائے۔

خورشید: بھارت بہت بڑا ملک ہے۔ آپ لوگ ناگالینڈ اور کئی اور جگہوں پر بھی یہی کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے اروناچل پردیش بنالیا ہے۔

راجندر سرین: لیکن وہ علاقہ بھارت کا ایک حصہ تھا۔

خورشید: ان کا بین الاقوامی مسئلہ تو کوئی نہیں تھا لیکن ہمارا مسئلہ ایسا ہے جو متنازعہ ہے۔ اس لئے اس کے حل کے لئے کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہے اور اس سوچ میں ہمیں بہت سوچ سمجھ سے کام لینا ہے؟

راجندر سرین: آپ کا اشارہ یو این او کی قراردادوں کی طرف ہے لیکن ان قراردادوں میں یہ بھی تو تھا کہ پاکستان اپنی افواج آزاد کشمیر سے ہٹا لے گا لیکن یہ پاکستان

نے نہیں کیا؟

خورشید: لیکن یہ کام دونوں ملکوں نے کرنا تھا۔

راجندر سرین: اس سلسلے میں ماضی کی طرف چلتے ہیں۔ جب یہ فیصلہ ہوا تھا کہ لوگ اپنی تقدیر کا خود فیصلہ کریں گے اور آزادی کے ایکٹ کے مطابق ریاستوں کے حکمرانوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کس کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں' ملک کی تقسیم کا بنیادی اصول بھی یہ تھا کہ مسلمان اکثریت کی آبادی والے علاقے میں پاکستان بنے گا اور ہندو اکثریت والے علاقوں میں بھارت بنے گا تو آپ نے ''جونا گڑھ'' ریاست کی شمولیت کو پھر کیوں مانا؟ آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے طاقت کا استعمال کیا لیکن آپ لوگوں نے بھی تو کشمیر میں یہی کچھ کیا؟

خورشید: اس کا مطلب ہے کہ یہ مسئلہ اب بھی ویسا ہے اور ہمیں طاقت استعمال کرنے کا حق ہے۔میری یہ تجویز ہے کہ ہم کشمیر کے مسئلے کو وہیں سے شروع کریں جہاں شیخ عبداللہ نے پنڈت نہرو کے زمانے میں چھوڑا تھا۔ اگر سرحد کے دونوں پار لیڈر آپس میں تبادلۂ خیال کریں تو ہو سکتا ہے کہ ہم ایک ایسا فارمولا نکال سکیں جس سے مسئلے کا حل ممکن ہو۔

راجندر سرین: مشکل یہ ہے کہ پنڈت جی کی کوشش کے بعد 1965ء کی جنگ دونوں ملکوں میں ہوئی؟

خورشید: وہ تو ہے لیکن اس وجہ سے اس حل کے لئے تجاویز تلاش کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے ویسے بھی اگر آپ چاہتے ہیں کہ دونوں ملکوں میں پائیدار امن اور دوستی ہو تو کشمیر کا حل تو ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔

راجندر سرین: لیکن یہ مسائل بھارت کی بقاء کے لئے بھی اہم ہیں۔ یہاں صرف علاقے

کا معاملہ نہیں 'بھارت کی پوری سالمیت کا سوال ہے؟

خورشید: یہ آپ کی عجیب سوچ ہے۔ اگر قبائلیوں نے 1947ء میں ریاست پر قبضہ کرلیا ہوتا تو پھر کیا ہوتا؟ بھارت سیکولرازم کا سہارا کشمیر کے سہارے لیتا ہے۔لگتا ہے یہ بہت ہی کچا رشتہ ہے۔

راجندر سرین: فرض کیجئے کشمیر پاکستان کو مل جاتا ہے 'اس لئے کہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان بھارت میں دوقومی نظریے کے تحت کیوں رہتے ہیں۔ اس طرح کی بات پاکستان میں بھی سوچی جا سکتی ہے؟

خورشید: لیکن بین الاقوامی جھگڑے میں اور کوئی علاقہ اس طرح نہیں الجھا ہوا جس طرح کشمیر الجھ گیا ہے۔

راجندر سرین: یہ بین الاقوامی جھگڑا نہیں ہے۔ اگر آئینی طور پر مسائل حل ہوجائیں تو ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں نہ کریں بلکہ عوامی سطح پر ہی سب کچھ حل ہوجائے۔

خورشید: یہ ایک آئینی بحث ہے اور آئین میں ردوبدل بھی ہوسکتا ہے۔ آپس میں ایک فیصلہ ہوجائے تو آئین اس کے مطابق ہوسکتا ہے۔ آپ کی دوستی بڑھ سکتی ہے' تعلقات بہتر ہوسکتے ہیں۔ بھارت کی بقاء کو اس طرح کوئی خطرہ نہیں۔ میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ بھارت کی بقا کو اس کے اندر کے مسائل اور حالات سے خطرہ ہے' ان باتوں سے نہیں' حالانکہ میں بھارت کو مضبوط دیکھنے کا خواہاں ہوں۔ کشمیر کا مسئلہ شملہ معاہدے اور یو این او کی قراردادوں کے مطابق حل ہوجانا چاہئے۔

راجندر سرین: شملہ میں تو یہ طے پاگیا ہے کہ لائن آف کنٹرول کو نہیں چھیڑا جائے گا اور

دونوں ملک پھر سے آپس میں بیٹھ کر اس معاہدے کو فائنل کرلیں گے۔ اس لحاظ سے ایک طرف تو مسئلہ کشمیر موجود ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اس کا فیصلہ ہو گیا ہے؟

خورشید: میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ ہمارے جیسے لوگ جنہوں نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا ہے، سمجھتے ہیں کہ ہم برصغیر کے جڑواں بھائی ہیں۔ میرے دل میں ہر اس شخص کے لئے بہت عقیدت ہے جس نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا ہوا ہے۔ یہ میری مخلصانہ رائے ہے کہ ہم ایک سمجھوتے پر آسکتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے بھی آپس کے سمجھوتے کا سوال تھا۔ اس وقت مسلمان 2یا3 فیصد زیادہ سیٹیں چاہتے تھے۔

راجندر سرین: ایک بات بتائیں جس قسم کی آپ کی حکومت آزاد کشمیر میں موجود ہے، کیا وہ کشمیریوں کی آزادی کے لئے سودمند ہے؟

خورشید: یہ ایک وقتی دور ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں بار بار فوجی حکومت آتی رہی ہے لیکن یہ چیز کبھی دیرپا نہیں ہوگی۔

راجندر سرین: ایک اور فوجی حکومت آجائے گی آپ کے ہاں۔ گزشتہ 35 سال سے یہی ہوتا آیا ہے 3 بار فوجی حکمران یہاں مختلف وقتوں میں آئے ہیں؟

خورشید: میرے خیال میں یہ مسئلہ کسی اور ملاقات پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بہت طویل موضوع ہے، اس طرح بات نہیں ہو سکتی۔

راجندر سرین: بہت بہت شکریہ۔ میں شکرگزار ہوں کہ تحریکِ آزادی کی ایک نامور شخصیت سے آج مجھے اس کے خیالات جاننے کا موقع ملا ہے۔

☆☆☆

جناب کے ایچ خورشید تصاویر کے آئینے میں
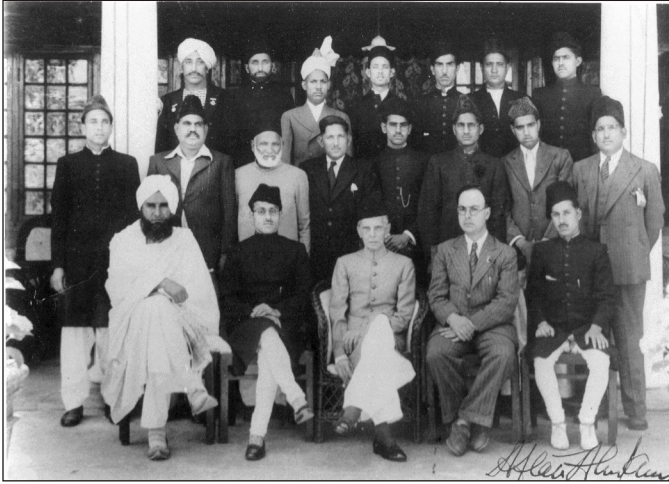
جناب کے ایچ خورشید قائداعظمؒ کے ہمراہ۔ایک گروپ فوٹو

جناب کے ایچ خورشید بحیثیت صدر آزاد کشمیر ایک تقریب (5 جنوری 1964ء)
کا افتتاح کر رہے ہیں
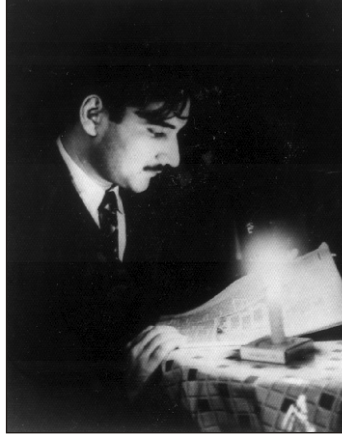
کے ایچ خورشید انگلینڈ میں بار ایٹ لاء
کی تعلیم حاصل کرتے وقت (1952ء)

کے ایچ خورشید اپنے والد ماجد مولوی محمد حسن، برادر بزرگ کرنل عبدالرشید،
بھابی اور بچوں کے ساتھ

کے ایچ خورشید گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈرامہ فیسٹیول میں (1985ء)

کے ایچ خورشید لبریشن لیگ کے کارکنوں کے ہمراہ (1980ء)

کے ایچ خورشید لبریشن لیگ کے کارکنوں کے ہمراہ

کے ایچ خورشید بحیثیت صدر جموں وکشمیر لبریشن لیگ مظفرآباد میں ایک بڑے جلسۂ عام
(21 دسمبر1973ء) سے خطاب کر رہے ہیں

کے ایچ خورشید لبریشن لیگ کے اجلاس (1975ء) سے لندن میں خطاب کر رہے ہیں

کے ایچ خورشید آزاد کشمیر اسمبلی سیشن کے موقع پر صدر سردار سکندر حیات خان کے ساتھ (1986ء)
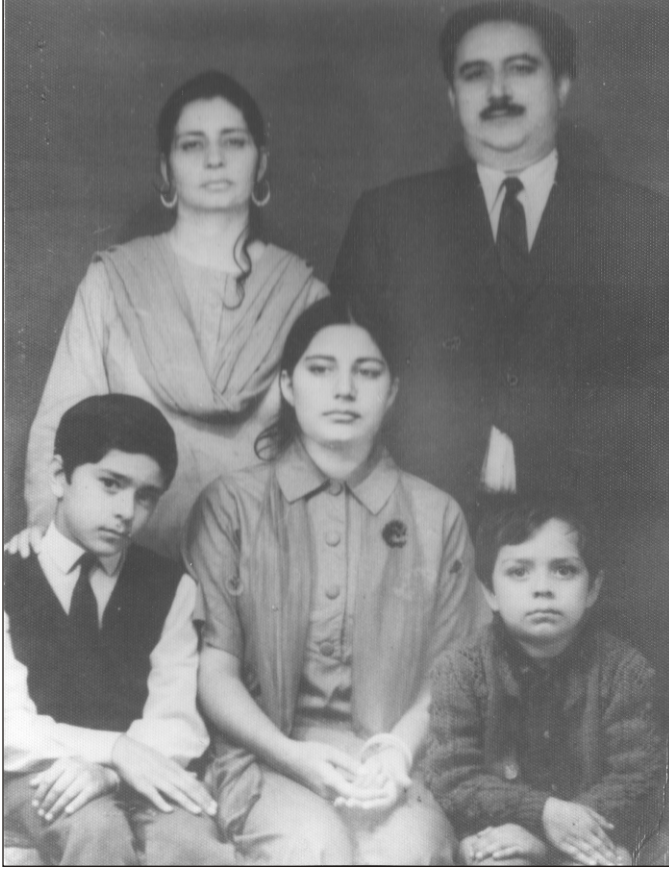
فیملی فوٹوگراف

کے ایچ خورشید اپنی بیگم ثریا خورشید اور بچوں کے ساتھ
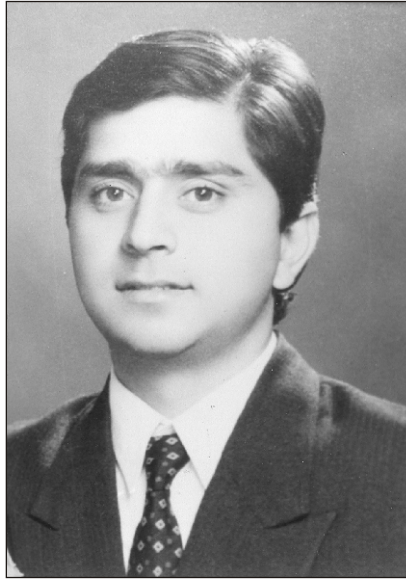
خرم خورشید (صاحبزادہ) (2002ء)

یاسمین ہارون (بیٹی)
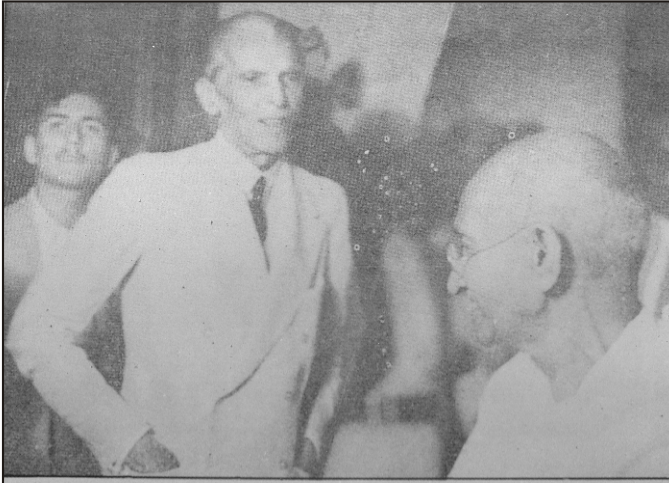
Jinnah saying goodbye to Gandhi after a round of talks at the former's Bombay residence. Khurshid is in the background.

ایک ملاقات کے بعد قائداعظمؒ اپنے مکان پر مسٹر گاندھی کو رخصت کر رہے ہیں۔ ستمبر 1944ء
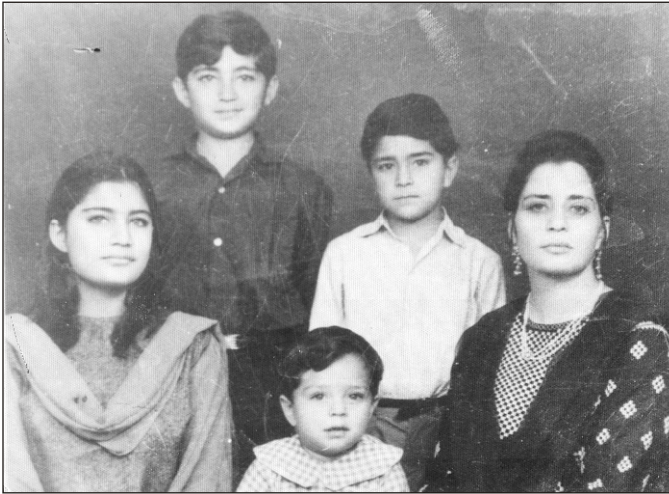
بچوں (عروج، اریج، خرم، یاسمین) کے ساتھ گروپ فوٹو (اکتوبر 1961ء)

جناب کے ایچ خورشید مظفر آباد میں صدر آزاد جموں اور کشمیر کی حیثیت سے تقریر کر رہے ہیں (1963ء)

جناب کے ایچ خورشید صدر آزاد جموں وکشمیر کی حیثیت سے (1963ء)

کے ایچ خورشید اسمبلی کے دوران (1986ء) دوسرے سیاسی زعما کے ساتھ

جنرل محمد ایوب خان نے صدر پاکستان کی حیثیت سے اکتوبر 1960ء میں آزاد کشمیر کا دورہ کیا'
کے ایچ خورشید نے بطور صدر آزاد کشمیر ان کا استقبال کیا۔

کے ایچ خورشید صدر آزاد کشمیر کی حیثیت سے صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان کے ساتھ ان
کے دورے کے موقع پر
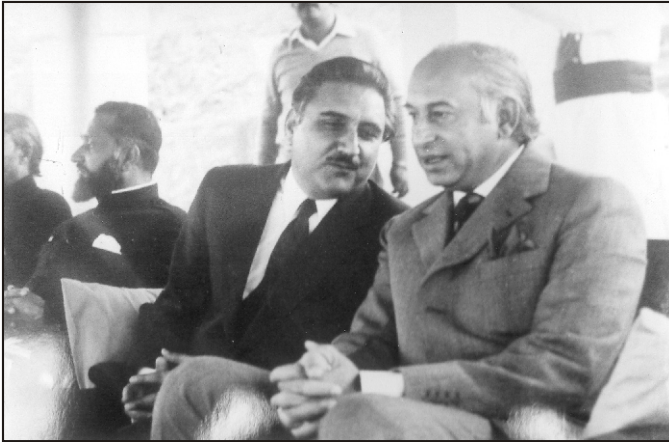
کے ایچ خورشید جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ استقبالیہ کی تصویر 1975 - میر پور

کے ایچ خورشید خان عبدالقیوم خان اور مسٹر نیروپ امریکن کونسل کے ہمراہ
(6اپریل 1963: تربیلاڈیم)

جناب کے ایچ خورشید پاکستان میں پہلی عیدالفطر کے مبارک موقع پر قائداعظمؒ کے ہمراہ دیگر
مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ
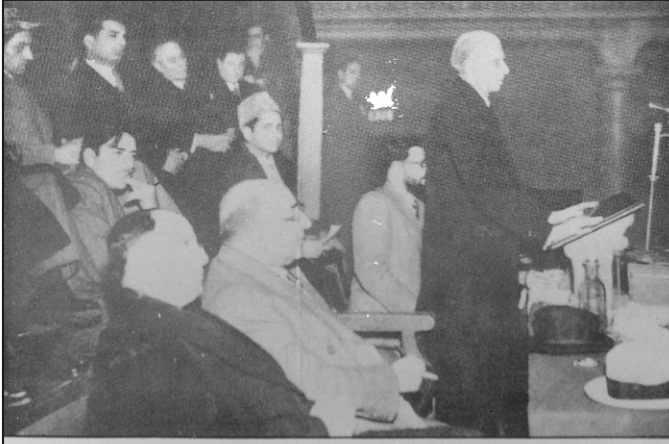
Jinnah addressing a Muslim League meeting in Kingsway Hall, London, in 1946. Khurshid is seated behind him.

قائداعظمؒ کنگز وے ہال لندن میں مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کرر ہے ہیں
کے ایچ خورشید آپ کے پیچھے بیٹھے ہیں

Khan Habibullah Khan, Minister for Home and Kashmir Affairs, gave a lunch in the honour of Sh. Mohammad Abdullah and his party at Flashman's Hotel, Rawalpindi, on Monday. From left to right: Mr. K. H. Khurshid, President of Azad Government of Jammu and Kashmir, the host, the chief guest and Sardar Muhammad Ibrahim.—APP.

کے ایچ خورشید شیخ محمد عبداللہ کے ہمراہ (26 مئی 1964ء) (راولپنڈی میں)
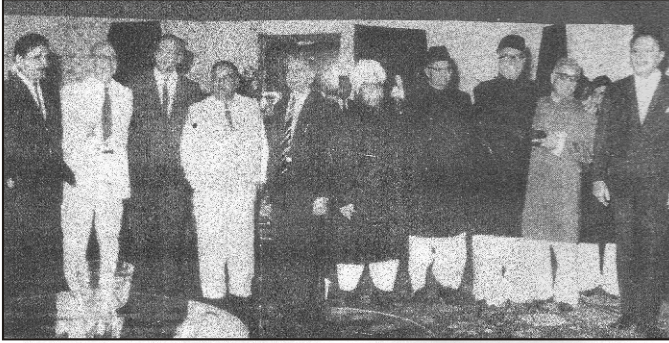
Pred Ayub hosted a dinner for Sheikh M. Abdullah (1964). Standing from (R to L) Pred. Ayub, Ch. Ghulam Abass, Sh. Abdullah, Afzal Cheema, Mir Waiz M. Yousaf Shah, Khan Habibullah, Mirza Afzal Baig. Mr. Z. A. Bhutto + Pred AJK MR. K. H. Khurshid Rawalpindi – 1964.

کے ایچ خورشید صدر آزاد کشمیر کی حیثیت سے (1964) صدر محمد ایوب خان، شیخ محمد عبداللہ، چودھری غلام عباس، افضل چیمہ، میر واعظ محمد یوسف شاہ، خان حبیب اللہ، مرزا افضل بیگ اور ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ

انڈونیشی سفیر مسٹر رکمیتو نے انڈونیشیا کی آزادی کی بلیسویں سالگرہ پر کراچی میں استقبالیہ دعوت دی۔ اس میں وزیر خارجہ مسٹر بھٹو، انڈونیشی وزیر محنت مسٹر سونو مو کا سابق صدر آزاد کشمیر مسٹر کے ایچ خورشید سے تعارف کرا رہے ہیں۔ (جنگ فوٹو)
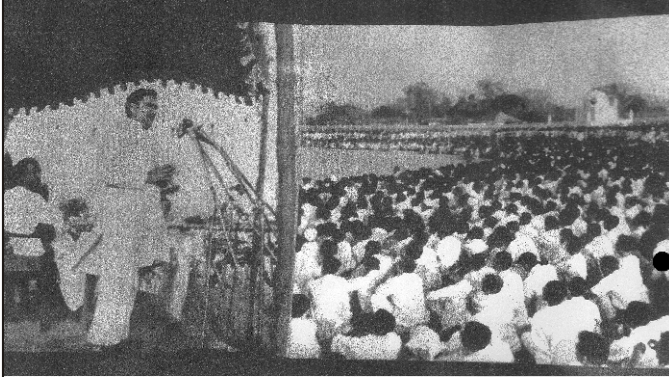
K. H. Khurshid. Presd. AJK on his visit to East Pakistan. Addressing Students at Dacca University. 1961.

کے ایچ خورشید صدر آزاد کشمیر مشرقی پاکستان کے دورے پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا کے ہمراہ

Mohtarma Fatima Jinnah, K.H. Khurshid + Nizamuddin Haider during Miss Jinnah's Election Campaign at Bahawalpur.